

مَقَالَاتِ سَارِحِ بِنَجَّارِ

فَقِيهِ الْعَصْرِ كَضَرَّتْ مُفْتًى

شَرِيفِ اَلْحَقِّ اَلْمَجْدِيِّ ^{تَدْوِينِ سِرِّهِ}



RS 180

مَكْتَبَةُ بَرَكَاتِ بَيْدِي

مقالات شارح بخاری

(جلد اول)

اس میں شارح بخاری (مفتی شریف الحق امجدی نور اللہ مرقدہ) کے گراں مایہ، علمی، تحقیقی، فکری، مقالات شامل ہیں۔ جو تفسیر، سیر، فقہیات، اسفار و مشاہدات پر مختلف اوقات میں تحریر فرمائے۔

— مرتبین —

مولانا حافظ عبدالحق رضوی مصباحی

(استاذ جامعہ شرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ)

ومولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی

(سابق استاذ جامعہ شرفیہ مبارکپور، اعظم گڑھ)

— ناشر —

مکتبہ برکات المدینہ

جامع مسجد بہار شریعت بہادر آباد کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعارف

سلسلہ اشاعت نمبر 5

نام کتاب: مقالات شارح بخاری (جلد اول)
مصنف: علامہ مولانا مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ
عدد صفحات: 446
سائز: 23x36/16
تعداد: 1100
طباعت اول: 1427ھ / 2006ء
(دائرہ البرکات، اتر پردیش، ہند)
طباعت دوم: 1428ھ / 2007ء

== ناشر ==

مکتبہ برکات المدینہ

جامع مسجد بہار شریعت، بہادر آباد، کراچی

فون: 021-4219324

barkatulmadina@yahoo.com

تقریظ

امین ملت پروفیسر سید محمد امین قادری برکاتی

سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ، مارہرہ شریف

فقیر اعظم ہند علامہ مفتی محمد شریف الحق قادری برکاتی امجدی رحمۃ اللہ علیہ ایک مستند فقیہ، عظیم

محدث، بخاری شریف کے شارح، بہترین مناظر، سیکڑوں مریدوں کے پیر طریقت اور ہزاروں شاگردوں

کے استاد تھے لیکن ہم غلامان صاحب البرکات کے لیے ان کا سب سے ممتاز لقب "برکاتی مفتی" تھا۔ ان

کے فتاویٰ اور تنقید و تحقیق کا ایک منفرد انداز تھا جس کی روشنی میں وہ دور سے ہی پہچان لیے جاتے تھے۔ اکابر

اہل سنت نے ان پر اعتماد کیا اور صدر الشریعہ، مفتی اعظم اور والد ماجد احسن العلمائے انھیں اپنی خصوصی

چاہتوں سے نوازا۔ ان کے علمی کارناموں میں ان کے ستر ہزار سے زیادہ فتاویٰ اور نزمۃ القاری شرح بخاری

خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آپ کی ان علمی خدمات کو عوام و خواص نے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور

جشن شارح بخاری ممبئی میں رضا اکیڈمی کے زیر اہتمام انھیں چاندی سے وزن کیا گیا۔ اہل علم نے معارف

شارح بخاری کے گیارہ سو صفحات میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ وہ سارے اعزازات ہیں جن میں یہ

برکاتی مفتی اپنے معاصرین کے درمیان بالکل منفرد نظر آتے ہیں۔

ان کے وصال کے ۶ سال بعد فقیر اعظم ہند کے گراں قدر علمی اور تحقیقی مقالات کا ضخیم مجموعہ منظر

عام پر آ رہا ہے۔ ان مقالات کی قدر و قیمت اہل تحقیق متعین کریں گے۔ اس فقیر برکاتی نے اس مجموعے کے

جستہ جستہ صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہی رائے قائم کی ہے کہ ان مقالات کے بیشتر حصے فقیر اعظم ہند کی

فقیہانہ بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ شخصیات گوشتے میں اکابر اہل سنت سے مفتی صاحب کی سچی عقیدت ہر ستر

سے تراوش ہوتی ہے۔ اس گوشہ کا اسلوب بھی صاف ستھرا ہے اور تحقیقی پیچیدگیوں سے آزاد۔ صدارتی

خطبات سے آپ کی پر اعتماد شخصیت جھلکتی ہے۔ تقریظات کی روش بھی عام طرز سے جداگانہ ہے۔ انھیں

مرتب کے ابتدائی اضافوں نے مزید نکھار دیا ہے۔

نوے مقالات کے اس مجموعے کو بڑی کاوش سے عزیزم مولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی ساحل

شہرامی (علیگ) نے مختلف لائبریریوں کی چھان بین کے بعد دو سال میں جمع کیا ہے۔ یہ ان کی سعادت

اور فقیر اعظم سے نیاز مندی کا ثبوت ہے۔ یہ فقیر برکاتی انھیں اس سعادت مندانہ کاوش پر دل کی گہرائیوں

سے مبارک باد پیش کرتا ہے۔ ساتھ ہی ان تمام افراد کو جو اس گراں قدر مجموعے کو منظر عام پر لانے کے سلسلے

میں معاون بنے بالخصوص محترمی ڈاکٹر محبت الحق قادری برکاتی کو مبارک باد پیش ہے جو ایک سعادت مند فرزند

کی طرح اپنے والد ماجد کی علمی یادگاروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور ان کے فروغ و اشاعت میں

مسلل مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس مجموعے کو مقبول عام اور مفید نام بنائے آمین!

فقیر برکاتی

سید محمد امین قادری

مقالات شارح بخاری اجمالی فہرست (جلد اول)

پیش گفتار۔ ڈاکٹر محبت الحق قادری

حرفے چند۔ مولانا محمد ارشاد احمد رضوی مصباحی۔ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ مبارکپور
مقدمہ۔ شارح بخاری۔ حیات اور کارنامے۔ نفیس احمد مصباحی

باب اول۔ تفسیرات و تشریحات

- ۱۔ تفسیر سورہ فاتحہ و بقرہ۔ ۲ رکوع
- ۲۔ ارض مقدس اور یہودی تغلب۔ قرآن کی روشنی میں
- ۳۔ یہود کے بارے میں ایک آیت کی تشریح
- ۴۔ خلائی سفر اور قرآن
- ۵۔ حدیث جبرئیل کی محققانہ تشریح
- ۶۔ حضرت عائشہ کی پاک دامنی اور حدیث اٹک

باب دوم۔ تواریخ و سیر

- ۷۔ تاریخ ولادت نبوی
- ۸۔ عید میلاد النبی
- ۹۔ سیرت نبوی کی بنیادی کتابیں
- ۱۰۔ مسلمانوں کے فرقے

باب سوم۔ تحقیقات فقہیات

- ۱۱۔ قانون داں اور قانون ساز پیغمبر
- ۱۲۔ اسلامی فکر کی تعمیر نو
- ۱۳۔ تقلید شخصی کی شرعی حیثیت



مقالات شارح بخاری اجمالی فہرست (جلد دوم)

مقدمہ

باب اول - رضویات

- ۱۔ لفظ رضا کی تحقیق
- ۲۔ امام احمد رضا اور مسئلہ تکفیر
- ۳۔ امام احمد رضا کا اسماعیل دہلوی کی تکفیر سے کف لسان
- ۴۔ اسماعیل دہلوی کی تکفیر کا مسئلہ
- ۵۔ علمائے دیوبند، علمائے اسلام کی نظر میں
- ۶۔ چند اعتراضات کا علمی محاسبہ
- ۷۔ مولوی خلیل احمد بجنوری کے مقالے اور ان کا رد
- ۸۔ دیکھو اسے جو دیدہٴ عبرت نگاہ ہو!
- ۹۔ امام احمد رضا کے حافظہ پر اعتراض کا جواب
- ۱۰۔ امام احمد رضا کے اشعار پر اعتراض کا جواب
- ۱۱۔ مسلک اعلیٰ حضرت

باب دوم تنقیدات و تعقیبات

- ۱۲۔ اہل سنت اور دیوبندیوں کے درمیان بنیادی اختلاف
- ۱۳۔ مسئلہ ختم نبوت اور تحذیر الناس
- ۱۴۔ خلافت معاویہ و یزید پر ایک تحقیقی نظر
- ۱۵۔ غزوہٴ مدینہٴ قیصر پر فیصلہ کن بحث
- ۱۶۔ تبلیغی جماعت کیا ہے؟
- ۱۷۔ نماز میں نجدیوں کی اقتداء
- ۱۸۔ غیر مقلدین سے چند سوالات



- ۱۳۔ رویت ہلال اور توقیت
- ۱۵۔ ریڈیو وغیرہ کی خبر پر عید منانے کے نقصانات
- ۱۶۔ ہلال عید اور ریڈیو
- ۱۷۔ ایک پیغام۔ ریڈیو سے چاند کا اعلان کرنے والوں کے نام
- ۱۸۔ شرعی عید اور عرفی عید
- ۱۹۔ لاؤڈ اسپیکر پر اقتدا
- ۲۰۔ مسائل حج و زیارت
- ۲۱۔ رمی جمرات کے اوقات میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں
- ۲۲۔ مہر اور جہیز کے سلسلہ میں ایک گزارش
- ۲۳۔ جہیز کی شرعی حیثیت
- ۲۴۔ فلم ”پیغام“ کی شرعی حیثیت
- ۲۵۔ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا
- ۲۶۔ پوتے کی وراثت

باب چہارم۔ اسفار و مشاہدات

- ۲۷۔ سفر حرمین طہین
- ۲۸۔ سفر نامہ حجاز مقدس و ممالک افریقہ و پاکستان
- ۲۹۔ اشرفیہ کا وفد ممبئی میں



مقالات شارح بخاری اجمالی فہرست (جلد سوم)

عرض ناشر

باب اول۔ شخصیات

- ۱۔ سوانح شارح بخاری
- ۲۔ حضرت صدیق اکبر کے زریں کارنامے
- ۳۔ حضرت امام نجم الدین کبریٰ
- ۴۔ حضرت ملا فخر الدین عراقی
- ۵۔ حضرت سیدنا میر عبدالواحد بلگرامی
- ۶۔ حضرت تاج العلماء قدس سرہ
- ۷۔ حضرت صدر الشریعہ ایک جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت
- ۸۔ مفتی اعظم اپنے فضل و کمال کے آئینے میں
- ۹۔ کیا کیا کہوں تجھے؟
- ۱۰۔ شیر پیشہ سنت کی مناظرانہ شان
- ۱۱۔ دور حاضر کا ایک مینارۂ ہدایت (شاہ یار علی علیہ الرحمہ)
- ۱۲۔ حضرت سید العلماء کی جامع صفات شخصیت
- ۱۳۔ حضور سید آل مصطفیٰ مارہروی علیہ الرحمہ
- ۱۴۔ حضرت احسن العلماء مولانا سید آل مصطفیٰ حیدر میاں مارہروی علیہ الرحمہ
- ۱۵۔ حافظ ملت بحیثیت مفسر
- ۱۶۔ حیات حافظ ملت کا درخشاں باب
- ۱۷۔ حافظ ملت کا انداز تدریس
- ۱۸۔ حضرت محدث اعظم پاکستان
- ۱۹۔ کیا مولانا سردار احمد محدث تھے؟
- ۲۰۔ حضرت مجاہد ملت بحیثیت مناظر

باب دوم۔ خطبہ صدارت

- ۲۱۔ خطبہ صدارت صدر الشریعہ سیمینار گھوسی، منو
- ۲۲۔ خطبہ صدارت حافظ ملت سیمینار، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور



فقہی سیمینار جامعہ اشرفیہ ۱۳۱۴ھ ۱۹۹۳ء	خطبہ صدارت	۲۳
فقہی سیمینار جامعہ اشرفیہ ۱۳۱۹ھ ۱۹۹۸ء	خطبہ صدارت	۲۳
فقہی سیمینار جامعہ اشرفیہ ۱۳۲۰ھ ۲۰۰۰ء	خطبہ صدارت	۲۵

باب سوم - تقریظات و تصدیقات

نور الایمان	تقریظ	۲۶
امام احمد رضا کی فقہی بصیرت	تقریظ	۲۷
قادی امجدیہ - جلد سوم	پیغام	۲۸
قادی امجدیہ - جلد چہار	پیغام	۲۹
صدر الشریعہ - حیات و خدمات	پیغام	۳۰
سیدین نمبر	پیغام	۳۱
رؤا المہند	تقریظ	۳۲
مناظرہ ادوی	تقدیم	۳۳
مولانا حشمت علی خاں - ایک تحقیقی مطالعہ	تقریظ	۳۴
مسئلہ مرغوب	تصدیق	۳۵
انجمن	تقدیم	۳۶
الاقوال القاطعہ	تصدیق	۳۷
اسلام کی چار اصولی اصطلاحیں	تقریظ جمیل	۳۸
قادی برکاتیہ	تقریظ	۳۹
صحیفہ فقہ اسلام	تقدیم	۴۰
جدید بینک کاری اور اسلام	تصدیق	۴۱
شیر بازار کے مسائل	تقدیم	۴۲
حدیث نبوی - چند مباحث و مسائل	تقریظ	۴۳
تذکرہ خلفائے راشدین	تقدیم	۴۴
تذکرہ سید سالار مسعود غازی	مقدمہ	۴۵
خطیب مشرق	تقریظ	۴۶
مدار نجات	تقریظ	۴۷
فضل العلم والعلماء	تقریظ جمیل	۴۸





تیرے علمی کارنامے بخشیں گے تجھ کو دوام
آب زریں سے لکھے گا کل مورخ تیرا نام

تو نے نسل نو کو بخشا ہے شعور علم و فن
ہے تری ذاتِ گرامی، لائق صد احترام

(ڈاکٹر) فکیل احمد اعظمی



فہرست مضامین مقالات شارح بخاری (جلد اول)

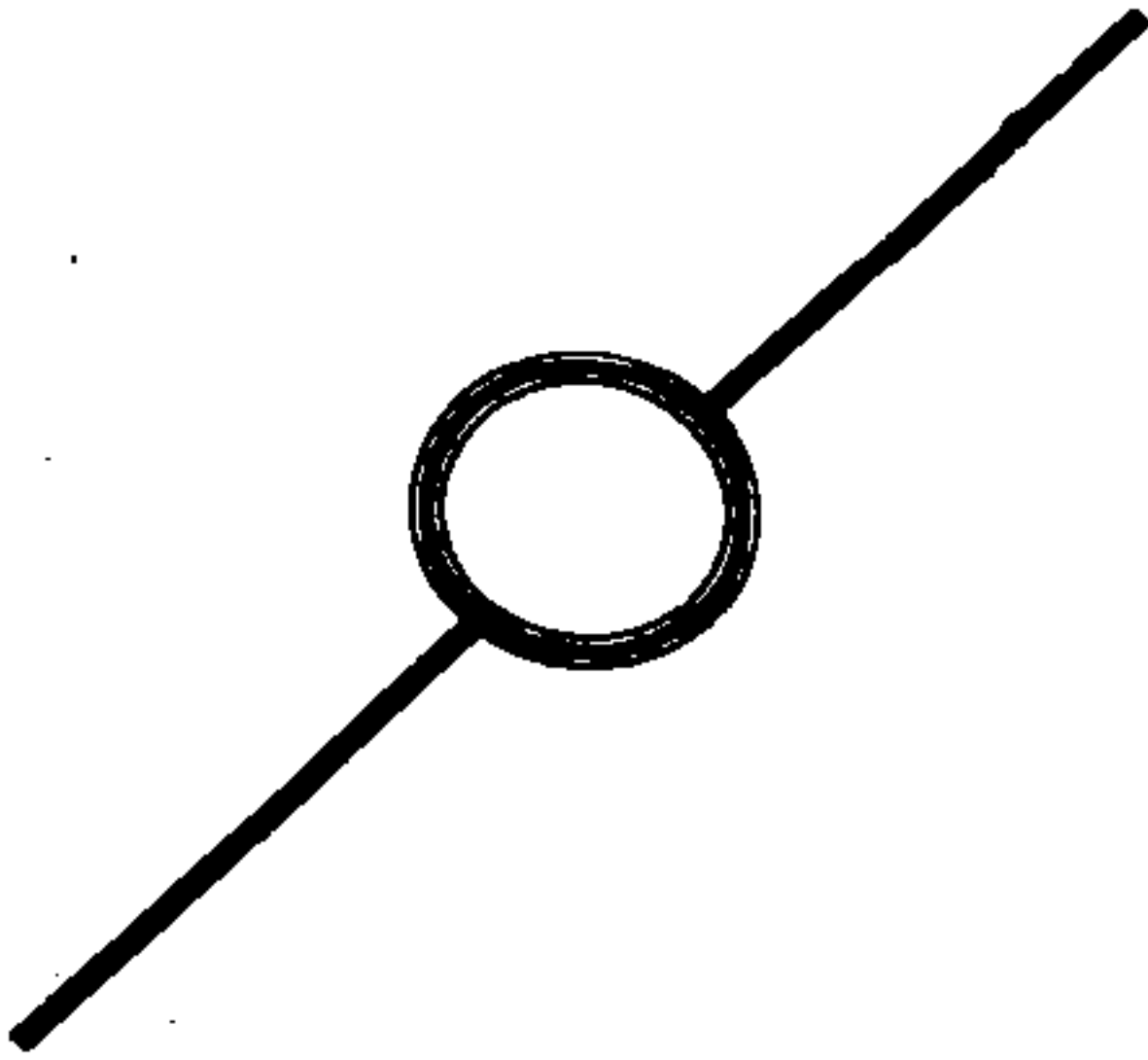
صفحات	مضامین	صفحات	مضامین
۳۹	تحریر و تصنیف	۹	پیش گفتار۔ ڈاکٹر محبت الحق قادری
۴۱	رحماتِ قلم	۱۳	حرفے چند۔ مولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی
۴۵	حاضر جوابی	۴۱	شارح بخاری، حیات اور کارنامے مولانا نعیم احمد مصباحی
۴۶	حق گوئی	۲۲	ولادت و نسب
۴۷	داد و دہش و مہمان نوازی	۲۳	تعلیم و تربیت
۴۸	اوقات کی پابندی	۲۵	شیوخ و اساتذہ
۴۸	احساس ذمہ داری	۲۶	تدریسی میدان
۵۰	ملی درد	۲۷	تلامذہ
۵۱	اسلامی غیرت و حمیت	۲۸	بیعت و خلافت
۵۵	اہل علم کا اعزاز و اکرام	۲۸	خلفاء و مریدین
۵۶	خودداری اور عزت نفس	۲۹	ہندو بیرون ہند کے علماء و مشائخ کو اجازتیں
۵۷	عشق رسول	۳۰	حج و زیارت
۶۰	تربیت کا الوکھا انداز	۳۰	تجو علی
۶۱	عصری نشوونما میں کبھی کبھی علماء کو نصیحت	۳۱	فقہ و افتا
۶۳	اکابر کی معتد علیہ شخصیت	۳۲	فتویٰ لویسی سے متعلق چند ارشادات و ہدایات
۶۳	جامعہ اشرفیہ سے والہانہ تعلق	۳۵	اصلاح لینے میں کن امور کو ملحوظ رکھے
۶۵	بذلہ نئی	۳۶	رد و مناظرہ

صفحات	مضامین	صفحات	مضامین
۱۰۳	لطفہ	۶۶	ترجمان اہل سنت
۱۰۴	تناسب	۶۶	نمایاں خصوصیات
۱۰۵	ذالک	۶۷	فیضان ماربرہ مطہرہ
۱۰۷	پہلی علامت	۶۸	فقیر اعظم ہند کا خطاب
۱۰۸	دوسری علامت	۶۹	حلیہ مبارک
۱۰۹	تیسری علامت	۶۹	ازواج و اولاد
۱۱۰	ما انزل	۷۰	مطبوع تذکرے
۱۱۲	تناسب	۷۱	وصال
۱۱۶	ارض تقدس اور یہودی تغلب	۷۲	باب اول۔ تفسیرات و تشریحات
۱۲۳	یہود کے بارے میں ایک آیت کی تشریح	۷۳	تفسیر سورہ فاتحہ
۱۲۹	خلائی سفر اور قرآن	۷۳	سورہ فاتحہ کے فضائل
۱۳۰	شرح حدیث جبرئیل	۷۶	خاصیت
۱۳۰	حدیث جبرئیل	۷۷	سورہ فاتحہ
۱۳۱	تشریحات	۹۵	احکام
۱۳۶	۱۔ بحیل	۹۷	سورہ بقرہ
۱۳۲	۲۔ نکات	۹۷	فضائل
۱۳۶	۳۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسول	۹۸	فوائد
۱۳۸	۴۔ تقدیر	۹۸	خلاصہ
۱۵۱	۵۔ احسان	۱۰۳	قائدہ
۱۵۳	عہادت کے معنی		

صفحات	مضامین	صفحات	مضامین
۲۳۳	امامیہ اثنا عشریہ	۱۵۶	ماہ المسکول عنہا
"	نصیری	۱۶۰	علامت قیامت
"	تفضیلی	۱۶۱	علوم خمسہ کی بحث
"	داؤدی پورے	۱۶۸	حضرت عائشہ کی پاکدامنی اور حدیث الکل
"	معتزلہ	۱۷۳	طویل متن حدیث کی تشریحات
۲۳۵	قدریہ	۱۸۸	باب دوم۔ تواریخ و سیر
۲۳۶	جبریہ	۱۸۹	تاریخ ولادت نبوی
"	مرجیہ	۱۹۳	عید میلاد النبی
"	قرامطہ	۲۰۵	سیرت نبوی کی بنیادی کتابیں
۲۳۷	نجفی	۲۰۵	محمد بن اسحاق
۲۳۸	ہندوستان کے موجودہ فرقے	۲۰۸	امام واقدی
۲۳۸	وہابی	۲۱۵	ابن سعد
۲۵۰	غیر مقلد	۲۱۶	عبد الدین بن جریر طبری
۲۵۱	دیوبندی	۲۲۵	ضعیف اور موضوع کا فرق
۲۵۲	نچری	۲۲۶	موضوع
۲۵۲	کادیانی	۲۲۶	ضعیف
۲۵۳	اہل قرآن	۲۳۵	خلاصہ ابحاث
۲۵۳	سودوی	۲۳۶	مسلمانوں کے فرقے
۲۵۴	شمع نیازی	۲۳۶	عبداللہ بن سبا
۲۵۵	باب سوم۔ تحقیقات و ظہیمات	۲۳۳	رائسی یا شیعہ
۲۵۶	غیر خدا قانون والں بھی، قانون ساز بھی		

صفحات	مضامین	صفحات	مضامین
۳۳۳	مسئلے کی توضیح	۲۵۷	آیات
۳۳۸	ایک شبہ کا ازالہ	۲۵۹	احادیث
۳۳۹	مسائل حج و زیارت	۲۶۲	شواہد
۳۴۰	احرام	۲۶۵	امت کا عقیدہ
۳۵۸	ہندوستان و پاکستان کی میقات	۲۷۰	اسلامی فکر کی تعمیر نو
۳۶۰	نماز سفر	۲۷۱	جوابات
۳۶۲	طواف کے مسائل	۲۸۰	تقلید شخصی کی شرعی حیثیت
۳۶۳	ری کے مسائل	۲۹۳	رویت ہلال اور توقیت
۳۶۴	قرآن کا بیان	۲۹۶	احادیث
۳۶۵	افراد کا بیان	۲۹۷	اس بارے میں صاحب غیر معتبر
۳۶۶	مکہ معظمہ کے چند تبرک مقامات	۲۹۸	اس سے واضح اور غیر مبہم یہ حدیث ہے
۳۶۷	فارثور	۲۹۹	ایڈیٹر صاحب کے شبہ کا جواب
//	جنت المعلیٰ	۳۰۰	ریڈیو وغیرہ کی خبر پر عید منانے کے نقصانات
//	دیگر مساجد و آثار	۳۰۷	ہلال عید اور ریڈیو
۳۶۸	مسجد ذی طوی	۳۱۱	لیک پیغام ریڈیو سے پانچ کا اعلان کرنے والوں کے نام
//	مسجد جن	۳۱۳	پہلا خط
//	مسجد رابہ	۳۱۳	دوسرا خط
//	دار خدیجہ الکبریٰ	۳۱۳	وضاحت طلب نکات
//	جبل بو قیس	۳۱۷	شرعی اور عرفی عید
//	غار مرسلات	۳۲۸	لاڈ ڈا اسپیکر پر اقتدار

صفحات	مضامین	صفحات	مضامین
۳۹۸	انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا	۳۶۹	حاضری مدینہ طیبہ
۳۰۹	پوئے کی وراثت	//	فضائل
۳۱۳	باب چہارم۔ اسفار و مشاہدات	۳۷۱	حاضری بارگاہ
۳۱۵	سفر نامہ حرمین طہمین	۳۷۵	واپسی کے بعد
۳۲۱	زندگی کی معراج	۳۷۶	مناسک حج ایک نظر میں
۳۲۶	دوبارہ حاضری	۳۷۸	رمی جمرات کے اوقات میں تبدیلی کی گنجائش نہیں
۳۳۰	سٹی کی حاضری		
۳۳۸	اشرفیہ کا وفد ممبئی میں	۳۸۳	مہر اور جہیز کے سلسلے میں ایک گزارش
۳۳۱	جدید تعمیرات	۳۸۷	جہیز کی شرعی حیثیت
		۳۹۱	فلم پیغام کی شرعی حیثیت



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للمتوحد = بجلاله المتفرد — و صلواته دو ما علی = خیر الانام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

پیش گفتار

”شراح بخاری۔ ایک ممتاز محقق“

مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ اور ان کے تلامذہ و خلفا کے بعد مصنفین، و محققین، جماعت اہل سنت پر اگر نظر دوڑائیں تو آپ کو شراح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی قدس سرہ العزیز۔ ایک ممتاز محقق کے طور پر نظر آئیں گے۔ انہوں نے ان ادق اور پیچیدہ مسائل پر قلم اٹھایا جو تہ تحقیق تھے۔ اپنے دور میں شاری بخاری، فقیہ اعظم ہند، فائق الاقران تھے۔ وہ صرف گفتار کے غازی نہ تھے بلکہ جو مسئلہ سچ سمجھا، حق جانا، اسے تقریر و تحریر کے ذریعہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش فرمائی۔ سیاسی تدبیر میں پختگی، تدریس میں ملکہ، تقریر و مناظرہ میں پراعتماد فاتحانہ کردار، تصنیف تالیف کا ایسا ذوق و شوق کہ تنہا بریلی شریف میں ”دارالتصنیف والتالیف“ کی بنیاد ڈالی۔ مگر افسوس کہ عوام و خواص کی سرد مہری سے وہ قابل ذکر ادارہ نہ بن سکا۔ خود ہی لکھتے رہے چھاپتے رہے یہاں تک کہ شاندار اشاعتی ادارہ دائرۃ البرکات قائم فرمایا۔ خود بھی ہمیشہ لکھتے رہے۔ علما و طلبہ کو بھی راغب کرتے رہے۔ فقہ و افتاء میں ایسا علمی استحضار کہ ان کا کوئی ثانی نہیں۔ دور طالب علمی سے لے کر تاحیات روزانہ ۱۸۵۱۶ گھنٹہ آپ کے علمی مشغولیات کا تخمینہ ہے۔

تصنیفی اور اسلامی تدبیر و تشخص کا اندازہ ان کی پہلی تصنیف ”اشک رواں“ کے مطالعہ سے اہل فکر و دانش لگا سکتے ہیں۔ جب ۱۹۴۶ء میں آزادی ہند کے وقت مسلمانوں میں انتشار تھا کہ وہ کانگریس کا ساتھ دیں، یا مسلم لیگ کا، یا اسلامی مملکت کا مطالبہ کریں۔ شارح بخاری نے اسلامی مملکت کا تصور اس وقت پیش کیا، جب وہ نہ تو شارح بخاری تھے، نہ فقیہ اعظم، نہ علامہ، نہ محقق و مفکر، بلکہ ۲۵ سال کے مولوی صوفی محمد شریف الحق تھے۔ یہ کتاب آزادی کے بعد ضبط ہو گئی، ورنہ اہل فکر و دانش ان کی مذہبی تدبیر و تشخص کو ملاحظہ فرماتے۔

اس زمانے میں جب کہ مسلمان مختلف علما اور لیڈروں کی تحریکوں کے نتیجے میں مسلم لیگ اور کانگریس کے خانوں میں بٹے ہوئے تھے اور انہیں صحیح سمت نظر نہ آتی تھی۔ شارح بخاری نے اپنی نو عمری میں ”اشک رواں“ لکھ کر اسلامیان ہند کو صحیح راہ دکھائی۔ اسی طرح ”اشرف السیر“ کو ملاحظہ فرمائیں۔ شبلی نعمانی نے ”سیرت النبی“ میں ثقہ اصحاب سیر کی علمی حقیقت کم کرنے، ماضی کی معتبر کتب سیر کی اہمیت گھٹانے اور بے اثر کرنے کی کوشش کی ہے ”اشرف السیر“ میں شارح بخاری نے اس غبار کو دور کرنے کی کوشش فرمائی، ہجوم کار اور پرہیز، نت نئے مسائل نے موقع نہ دیا ورنہ چار جلدوں میں یہ کتاب شاہکار تصنیف ہوتی۔

اسی طرح ”اسلام اور چاند کا سفر“ جب انسان چاند پر پہنچا اس وقت اختلافات کا ایک طوفان اٹھ گیا کہ ایسا ممکن ہے یا ناممکن۔ اس وقت ایسا لگا جیسے اسلام ہی پر حملہ ہو گیا، اس وقت ”اسلام اور چاند کا سفر“ لکھ کر یہ ثابت کیا کہ انسان چاند پر جاسکتا ہے، اس سے اسلامی فکر و اعتقاد میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ عجب اتفاق تھا اس مسئلہ پر ان کے ایک جلیل القدر استاذ صدر العلماء حضرت علامہ غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ سے اختلاف ہوا۔ اس کتاب کے جواب میں حضرت نے صحیح النظر، کتاب لکھی۔ جس کا جواب اسلام اور چاند کے سفر کے اخیر حصہ میں موجود ہے۔ اس میں جو علمی مباحثہ استاذ و شاگرد کے درمیان ہوا وہ ایک علمی شاہکار اور حسن ادب کا نمونہ ہے۔

اسی طرح دیگر تصنیفات، مثلاً تحقیقات، فتوں کی سرزمین کون، نزہۃ القاری کے مطالعہ کے بعد قارئین، محققین، مفکرین نے اندازہ کیا ہوگا۔

اب ”مقالات شارح بخاری“ میں ان کی تحقیقات اور مختلف فیہ مسائل پر واضح نقطہ نظر ملاحظہ فرمائیں گے۔ اکابر، علماء، مشائخ پر قلبی جذبات و احساسات بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ طلبہ و علماء کے لیے یہ مقالات مہینز کا کام کریں گے۔ ذہن کو فکرنو، جن کی موجوں میں تلاطم نہیں۔ انشاء اللہ تلاطم ضرور پیدا ہوگا۔ یہ تین جلدوں میں تقریباً ۱۵۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

جلد اول: چار ابواب ہیں۔ پہلا باب تفسیرات، تشریحات۔ باب دوم: تواریخ و سیر۔ باب سوم: تحقیقات و فقہیات۔ باب چہارم۔ اسفار و مشاہدات۔ جلد دوم: دو ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول رضویات۔ باب دوم تنقیدات، تعقیبات۔

جلد سوم: تین ابواب پر مشتمل ہے باب اول شخصیات باب دوم خطبات باب سوم تقریظات، تصدیقات۔

انتہائی معذرت کے ساتھ اعتراف ندامت:

مقالات شارح بخاری کی تدوین و ترتیب، ابا حضور نے اپنی حیات ہی میں، ذاتی صرفہ سے اپنی ہدایات و نگرانی میں، مولانا ارشاد احمد برکاتی، سابق استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارکپور سے کروادی تھی جس کی تفصیل، موصوف نے ”افکار رضا“ ممبئی، ”ماہنامہ ماہ نور“ دلی میں شائع کروادی۔ قارئین ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔ مولانا نے بہت عجلت سے کام لیا، ورنہ وہ تفصیل اس میں شامل ہوتی۔ اس کے کچھ ضروری اقتباسات اس میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان کا شکریہ کہ انہوں نے ابا حضور کی تعمیل حکم فرمائی اور محنت و شوق سے اس کی ترتیب فرمائی۔

ابا حضور کی دلی خواہش تھی کہ ”جشن شارح بخاری“ ممبئی سے قبل وہ بھی منظر عام پر آجائے مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا جس کا بہت قلق تھا۔ ابا حضور کی وفات کے بعد، مولانا عبدالحق رضوی وغیرہ نے محسوس کیا کہ عجلت میں اس کی ترتیب ہوئی ہے اور بہت سے

مضامین، چھوٹ گئے ہیں، اس لیے ترتیب کچھ ڈھنگ سے ہو جائے، اور بقیہ مضامین بھی شامل ہو جائیں، جس کو جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ کے موقر اساتذہ مولانا عبدالحق رضوی، مولانا نفیس احمد مصباحی، مولانا مبارک حسین مصباحی، مفتی نسیم احمد صاحبان نے دوبارہ ترتیب دیا، اس کی بھی دوبارہ کمپوزنگ ہوئی، مذکورہ بالا علمائے کرام نے بڑی عرق ریزی اور جاں سوزی سے پروف ریڈنگ کی۔ مگر ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے اشاعت میں تاخیر در تاخیر ہوتی گئی۔ نتیجتاً وہ بھی کمپیوٹر سے محو ہو گئی جب ممبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، تو احقر نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کی مصروفیات، بہت بڑھ گئیں ہیں اب اس کام کو اپنے ناتواں ہاتھوں میں لینا چاہئے، مقالات کی جیسی ترتیب ان حضرات نے دی وہی ہی ناچیز نے سہ بارہ کمپوزنگ شروع کرادی۔ اب اس سلسلے میں اہم کام پروف ریڈنگ کا تھا کہتے ہیں ”دودھ کی جلی ملی چھا چھ کو پھونک کر پیتی ہے“۔ اب میں کسی کے ہاتھ مسودہ پروف ریڈنگ کے لیے نہیں دے سکتا تھا۔ اشرف السیر، تحقیقات، اسلام اور چاند کا سفر کی پروف ریڈنگ کا کچھ سابقہ تجربہ تھا، ہمت کر کے پروف ریڈنگ خود شروع کر دی۔ اہا حضور کی چیتھی پوتی، عزیزہ حمیرا خاتون برکاتی نے کافی تعاون کیا۔ اس کی تعلیمی و گھریلو مصروفیات اور احقر طبیب وہ بھی پرائیویٹ پریکٹس، اس میں مریضوں کے آنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ جب ان کو وقت ملا، ڈاکٹر کے پاس پہنچ گئے۔ اور دروازہ پٹنے لگے اور اگر لحوہ بھر حاضری میں ڈاکٹر نے دیر کر دی تو دروازہ بھی توڑنے لگیں گے جیسے، ڈاکٹر کو گھر میں کوئی کام ہی نہیں۔ مریض کے دستک دینے ہی قرض خوروں کی طرح جی حضور حاضر ہوں۔ ایسی حالت میں پڑھنے لکھنے والے کام، درہم برہم۔ جس کی وجہ سے اس ناچیز سے بھی تاخیر ہوئی۔ مزید اس سلسلے میں دوسرے مخلصین و معاونین سے کام لینا پڑا۔ جس میں مولوی معراج احمد گھوسی، مولوی وصال احمد، مفتی محبوب احمد، مولوی شہاب الدین، مولانا شمشاد احمد، مولانا امتیاز احمد صاحبان کا ممنون و مشکور ہوں۔ خاص طور پر مولانا عبدالحق، مولانا نفیس احمد مصباحی، مفتی نسیم احمد صاحب کا کہ یہ متاع گراں مایہ محفوظ رکھا اور عنایت فرما دیا اللہ تعالیٰ سب کو اجر عظیم عطا فرمائے اور ترقی درجات سے نوازے۔۔۔ احقر کو سخت عداوت ہے کہ ایسے گنہائے گراں مایہ کو منظر عام پر

لانے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی کہ لوگوں کا اشتیاق کم ہو گیا۔ خیر ”دیر آید درست آید“ کے مصداق ہوگا اب اہل علم و فن پر منحصر ہے کہ وہ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ جو کمی ہو اس سے ضرور مطلع فرمائیں۔ اس تعاون کے لیے ممنون و مشکور ہوں گا۔

”فتاویٰ شارح بخاری“ جو شارح بخاری کی زندگی کا اہم فقہی سرمایہ ہے ان شاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گا۔ غیر معمولی تاخیر میں ہمیں اپنی کم مائیگی، نا اہلی کا پورا احساس ہے کوشش کر رہے ہیں تا سید ایزدی، فضل صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے امید ہے کہ عنقریب کامیاب ہوں گے۔ وما توفیقی الا باللہ ۝ علیہ توکلت والیہ انیب ۝ میری توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف لوٹا ہوں۔

(ڈاکٹر) محمد محبت الحق قادری

بی یو، ایم، ایم، ایس (علیگ)

خادم دائرة البرکات گھوسی، مو

یکم ذوقعدہ ۱۴۲۶ھ بمطابق ۲۲ دسمبر ۲۰۰۵ء

حرفے چند

مولانا محمد ارشاد احمد رضوی مصباحی استاذ و نائب مفتی جامعہ اشرفیہ مبارک پور

الحمد لله الهنا والصلوة والسلام على سيدنا محمد شفيعنا وعلى آله
وصحبه وسائلنا۔

حضرت شارح بخاری، فقیہ العصر علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دام ظلہ کی ذات
گرامی کا علمی دبدبہ عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ علمی مصروفیات اور دینی خدمات آپ کی پوری
زندگی کی شناخت ہیں۔ علمی تنوع، فکری بصیرت، اخذ و استنباط کا ملکہ، استحضار اور جودت بیان،
تحقیقی رنگ، تردید کے باب میں تیکھی، دلچسپ اور مضبوط گرفت، دقیقہ رس، نکتہ آفریں فکر،
اسلامی غیرت، دینی حمیت، علماء و مشائخ کا اکرام، ہم عصروں کا اعزاز، اصاغر کی راہنمائی اور
ہمدردی، یہ سب آپ کی زندگی کے روشن بنیادی عناصر ہیں جن کی جھلک آپ کو ان تحریروں
میں جا بجا بکھری نظر آئے گی۔

راقم نے دستیاب شدہ تحریروں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد درج ذیل ابواب
میں منضبط کیا ہے۔

۱۔ تفسیرات۔ ۲۔ فقہیات۔ ۳۔ تحقیقات۔ ۴۔ تنقیدات و تعاقبات۔ ۵۔ شخصیات۔

۶۔ صدارتی خطبات۔ ۷۔ سفر نامے۔ ۸۔ تقریظات و پیغامات۔ ۹۔ مفرقات۔

باب اول سے متعلق الحمد سے سورہ بقرہ کے پہلے رکوع تک کی تفسیر ہے اور دیگر
ابواب سے متعلق کل مضامین کی تعداد ۸۸ ہے جن میں بعض بہت مبسوط ہیں اور مستقل
رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے فقہیات میں مسائل حج و زیارت، تنقیدات میں انکشاف حق پر

ناقدانہ نظر، شخصیات میں مفتی اعظم اپنے فضل و کمال کے آئینے میں اور صدر الشریعہ ایک ہمہ گیر شخصیت وغیرہ۔

ان ابواب میں ہر ایک اپنی جگہ اہم ہے اور ع ہر گلے رارنگ و بونے دیگر است۔ کی شان رکھتا ہے مگر تحقیقات و تنقیدات بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

حضرت کی فقہی بصیرت کی تو دنیا قائل ہے اور اس پر آپ کے ہزاروں فتاویٰ شاہد ہیں جو ترتیب کے مراحل سے گذر رہے ہیں۔ خدا کرے وہ جلد ہی با حوصلہ افراد کے ہاتھوں سے مرتب ہو کر منصف شہود پر جلوہ گر ہوں کہ نزہۃ القاری کے بعد یہ آپ کی عبقریت کی شاندار دستاویز ہوگی۔ لیکن اس مجموعہ میں فقہیات کے باب میں ”انجکشن سے روزہ نہ ٹوٹنے سے متعلق مضمون حضرت کی فقہی بصیرت کا لافانی شاہکار ہے۔ حضرت کے سفر نامے، صدارتی خطبات اور سوانحی مقالوں سے حضرت کی نثر نگاری کا جو ہر خوب نمایاں ہے ان کے مطالعہ کے بعد حضرت کی انشا پردازانہ مہارت کا بھی ہر مصنف اعتراف کرے گا۔“ تقریظات و پیغامات“ ذیلی چیزیں شمار ہوتی ہیں لیکن حضرت نے اس باب میں بھی بڑے قیمتی افادات رقم فرمائے ہیں جو اس کتاب کے موضوع کی روح کہے جاسکتے ہیں، حضرت بحر العلوم علامہ عبدالحلیم فرنگی محلی قدس سرہ کی کتاب ”نور الایمان بزیارۃ آثار حبیب الرحمن“ کے ترجمہ پر حضرت کا مقدمہ اس کا بہترین ثبوت ہے۔ متفرقات کے باب میں ”مہر اور جہیز کے سلسلہ میں ایک گزارش“ اور ”اشرفیہ کا وفد بہمنی میں“ حضرت کی دینی ہمدردی کے قیمتی جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ الغرض پورا مجموعہ گراں قدر افادات سے لبریز ہے کہاں تک تعارف کرایا جائے صرف دو مضمون پر تبصرہ سپرد قلم ہے۔

ارض مقدس اور یہودی تغلب: دشمنان اسلام امریکہ، فرانس، برطانیہ، روس نے در بدر کی ٹھوکریں کھانے والے یہودیوں کو فلسطین کا ایک حصہ دے دیا۔ پوری دنیا کے مسلمان احتجاج کرتے رہے مگر اس کا ان پر کوئی اثر مرتب نہ ہوا۔ اللہ عزوجل کی شان بے نیازی کہ مصر، اردن وغیرہ نے ارض مقدس کو یہودیوں سے خالی کرانے کی جو بھی کوشش کیں وہ سب کی سب ناکام ہوئیں، یہودیوں سے جنگیں کیں سب میں شکستیں کھائیں حالانکہ

قرآن مجید میں یہودیوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

ضربت علیہم الذلة والمسکنة و باؤا بغضب من الله (بقرہ آیت ۶۱)

اور ان پر مسلط کر دی گئی خواری اور ناداری اور وہ اللہ کے غضب میں لوٹے۔

مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کی ہر محاذ پر فتح اور ان کی روز افزوں ترقی نے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا کہ اللہ عزوجل کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہے؟ یہ سوال بہت اہم اور غیر معمولی تھا۔ ملت کے سارے مفکرین اس کے جواب میں الجھے ہوئے تھے اور طرح طرح کے جوابات دیئے جا رہے تھے۔ بہت سے جوابات اپنی جگہ درست بھی تھے لیکن بہترے لوگوں کو ان سے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر حضرت شارح بخاری نے قرآن مجید ہی سے ایک ایسا جواب ڈھونڈ نکالا جس پر علمی دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ آپ نے فرمایا کہ سورہ بقرہ شریف میں جو آیت ہے اس کی تفصیل سورہ آل عمران رکوع ۸ میں موجود ہے۔ ارشاد ہے:

”ضربت علیہم الذلة اینما ثقفوا الا بحبل من الله وحبل من الناس“ ان پر خواری جمادی گئی جہاں بھی رہیں مگر جب کہ اللہ کی رسی یا آدمیوں کی رسی پکڑ لیں۔

اس آیت مبارکہ کا صریح مفہوم یہ ہے کہ یہودی جہاں بھی رہیں گے ذلیل و خوار رہیں گے مگر جب کہ اللہ کی رسی پکڑ لیں یا دوسرے لوگوں کی رسی پکڑ لیں۔ یہ ذلت و خواری سے چھوٹنے کی استثنائی حالت کا بیان ہے۔ اللہ کی رسی پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ مسلمان ہو جائیں اور لوگوں کی رسی پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے علاوہ کسی اور طاقت اور قوم کی پناہ میں آجائیں یعنی اگر وہ تنہا اپنی قوت سے چاہیں تو ذلت سے چھٹکارا نصیب نہیں ہو سکتا اس پر یہودیوں کی ہزار ہا سالہ تاریخ شاہد ہے۔ ہاں اگر مسلمان ہو جائیں تو جو عزت مسلمانوں کو حاصل ہے انہیں بھی حاصل ہو جائے گی۔ یا یہ کہ وہ دنیا کی کسی طاقتور قوم کی پناہ حاصل کر لیں تو دنیا میں عزت پاسکتے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ اسرائیلی حکومت امریکہ نے قائم کی ہے اور یہودیوں کی موجودہ بقا و ترقی سب امریکہ کی دین ہے۔ شارح بخاری فرمایا کرتے تھے اسرائیلی حکومت امریکہ کی ناجائز اولاد ہے، آج اگر امریکہ یہودیوں کی پشت پناہی چھوڑ دے تو پھر دنیا دیکھے گی کہ ان کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔ اسی مضمون کو حضرت شارح بخاری نے اپنے اس

عنوان میں انتہائی دلچسپ اور تحقیقی پیرائے میں سپرد قلم فرمایا ہے۔

یزید کا مسئلہ: دیوبندی برادری کے ایک مایہ ناز فرزند محمود احمد عباسی امر وہوی نے یہ شگوفہ چھوڑا کہ یزید خلیفہ برحق تھا۔ امام عالی مقام سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاطر و باغی تھے، یزید کے بارے میں حدیث میں بشارت آئی ہے کہ وہ بخشا جائے گا۔ اس کے ثبوت میں اس نے بخاری شریف کی یہ حدیث پیش کی۔

”اول جيش من امتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم“

میری امت کا وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے اسے بخش دیا جائے گا۔

اپنی دیوبندی سرشت کے مطابق امر وہوی نے مدینہ قیصر سے قسطنطنیہ مراد لیا اور دھاندلی سے اس لشکر کو جس میں یزید ایک معمولی سپاہی کی طرح شریک تھا اس لشکر کا سپہ سالار بنا کر قسطنطنیہ پر پہلا حملہ آور قرار دیا۔

اس کی اس گمراہ کن بات کا جواب ہمارے اجلہ علمائے اہل سنت نے مختلف پیرائے میں دیا جو ماہنامہ پاسبان کے ”حسین نمبر“ کربلا کا مسافر“ میں موجود ہے۔ حضرت شارح بخاری نے بھی خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ کی فرمائش پر قلم اٹھایا اور عنوان کا حق ادا کر دیا جس کا جی چاہے کربلا کا مسافر نمبر پڑھ لے وہ خود سمجھ لے گا کہ شارح بخاری کا مضمون اس نمبر کی جان ہے۔

پاسبان کے لیے جو مضمون حضرت نے تحریر فرمایا تھا وہ شارحین حدیث کی ترجمانی تھی مگر اس کے بعد حضرت مولانا حافظ مبین الدین امر وہوی علیہ الرحمہ کی رہنمائی میں حضرت شارح بخاری نے اس حدیث پر تحقیق شروع فرمائی تو بڑے بڑے محققین انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس حدیث پر تین طریقے سے کلام فرمایا۔

اول: حدیث میں قسطنطنیہ کا لفظ نہیں ”مدینہ قیصر“ ہے جس کا ترجمہ ہوگا ”قیصر کے شہر پر“ یعنی میرا امت کا وہ پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا بخشا جائے گا اس سے خاص قسطنطنیہ ہی مراد ہے یہ کہاں ہے؟ قیصر کی حدود سلطنت کا کوئی بھی شہر مراد ہو سکتا ہے۔ اس کے پیش نظر قیصر کے شہر پر پہلا حملہ عہد رسالت میں ”موتہ“ پر ۶۰۸ھ میں ہوا تھا۔ اب اس

حدیث کے مصداق غزوہ موتہ کے مجاہدین ہوں گے۔ یہ نکتہ حضرت نے از خود استخراج فرمایا بعد میں تیسیر شرح جامع صغیر کے حاشیہ میں بھی یہی نکتہ تحریر ملا جسے مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے تحریر فرمایا تھا۔ یہ تطابق دیکھ کر حضرت شارح بخاری کو جس قدر خوشی ہوئی اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

دوم: اگر مدینہ قیصر سے اس کا دارالسلطنت مراد ہو تو عہد رسالت میں اس کا دارالسلطنت حمص تھا جو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد مبارک میں فتح ہوا اس تقدیر پر اس حدیث کے مصداق حمص فتح کرنے والے مجاہدین ہوں گے۔

سوم: اور اگر کسی کو یہی ضد ہو کہ مدینہ قیصر سے خاص قسطنطنیہ ہی مراد ہے تو بھی اس حدیث کا مصداق یزید نہیں ہو سکتا اس لیے کہ قسطنطنیہ پر پہلا حملہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۳۵ھ میں کیا تھا۔ اس تقدیر پر اس کے مصداق اس لشکر کے مجاہدین ہوں گے نہ کہ یزید۔ اس کے بعد ۶۱ھ میں بسر بن ارطاة نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ۶۸ھ میں حضرت عبدالرحمن بن خالد سیف اللہ نے کیا تھا اور جس لشکر میں یزید شریک تھا وہ قسطنطنیہ پر چوتھا یا پانچواں حملہ تھا اس لیے یزید اس حدیث کا مصداق ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا۔

چہارم: حضرت شارح بخاری نے انتہائی محققانہ طریقے سے ثابت فرمایا ہے کہ اس تقدیر پر بحری راستے سے جو پہلا لشکر مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ آور ہوگا وہی لشکر الفاظ حدیث سے مراد ہے۔ یزیدی راستے سے گیا تھا۔ بحری راستے سے نہیں اس لیے اس حدیث کا مصداق اس کا لشکر ہو ہی نہیں سکتا۔

امروہوی صاحب نے یزید کے خلیفہ برحق ہونے پر بڑے شد و مد کے ساتھ بحث کا دوسرا رخ یہ پیش کیا ہے کہ اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ برحق تھے اور یہ بھی اہل سنت کا اجماعی فیصلہ ہے کہ خلیفہ برحق اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دے تو وہ بھی خلیفہ برحق ہوگا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی حیات مبارکہ ہی میں یزید کو اپنا ولی عہد و جانشین مقرر فرما کر اہل صحابہ کرام اور عام مسلمانوں سے

اس کی بیعت بھی لے لی تھی اس لیے یزید کے خلیفہ برحق ہونے میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے اگر کوئی انکار کرتا ہے تو اہل سنت کے اجماع کے خلاف کرتا ہے۔ اور جب یزید برحق خلیفہ ہے تو سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس کے خلاف خروج خطا اور بغاوت تھی۔

امروہوی کی اس خرافاتی بحث کا جواب ہمارے علماء اہل سنت نے متعدد طریقوں سے دیا ہے حضرت شارح بخاری کی محاسباتی گفتگو نے تو اس استدلال کی جڑ کاٹ کے رکھ دی ہے۔ فرماتے ہیں:

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ اپنا جانشین منتخب کرنے کے مجاز ہی نہ تھے کیوں کہ اس پر اہل سنت کا اجماع ہے کہ مولاے کائنات امیر المؤمنین سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد خلیفہ برحق سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے اختلاف کیا نوبت جنگ تک پہنچی، نزاع ختم کرنے اور مسلمانوں کو ہلاکت و تباہی سے بچانے کی خاطر مصالحت ہوئی۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رفع نزاع اور اصلاح کی خاطر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صرف ان کی حیات مبارکہ تک کے لیے خلافت سپرد فرمائی اور خود دست کش ہو گئے۔ صلح نامہ کی اہم ترین دفعہ یہ تھی۔

”حضرت معاویہ تا حیات خلیفہ رہیں گے اور ان کے بعد خلافت کا حق سیدنا امام حسن مجتبیٰ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو رہے گا۔“

اس معاہدہ کی روشنی میں سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جانشین نامزد کرنے کے مجاز نہ تھے اس لیے آپ کا انتخاب ساقط اور شرعاً غیر معتبر تھا۔ آپ کے وصال کے بعد یہ حق امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تھا لیکن حضرت بھی واصل بحق ہو چکے تھے اس لیے اس کی ذمہ داری ملت کے ارہاب حل و عقد کے سر جاتی ہے۔ اور اس کے بارے میں مورخین کا اتفاق ہے کہ یزید کا انتخاب شورائی انداز میں نہیں ہوا تھا بلکہ وہ از خود غرہ کر کے تخت خلافت پر براجمان ہو گیا تھا اس لیے سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس کی خلافت کو تسلیم نہ کرنا بالکل حق بجانب تھا اسے نہ خطا کہہ سکتے ہیں نہ بغاوت۔“

اس طرح کی فیصلہ کن بحثیں آپ کو ان مقالات میں جگہ جگہ ملیں گی جن سے قارئین

از خود حضرت کی ہمہ جہتی، فنی جامعیت، محققانہ بصیرت اور وسعت مطالعہ و استحضار کے اعتراف پر مجبور ہوں گے۔

مولائے کریم سلف کے اس علمی جانشین کا سایہ فکر و فن ہمیشہ سلامت رکھے اور ان کے فیوضات علمیہ سے عالم اسلام کو استفادہ کا موقع عطا فرمائے۔ آمین!

نیاز مند

محمد ارشاد احمد رضوی مصباحی

الجامعۃ الاشرافیہ مبارک پور

یکم شعبان المعظم ۱۴۲۰ھ

۱۰ نومبر ۱۹۹۹ء

(باب اول)

شارح بخاری

حیات و خدمات، اوصاف اور کارنامے

بقلم

نفس احمد مصباحی بارہ بنکوی

استاذ: جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہندوستان کی سرزمین بڑی مردم خیز واقع ہوئی ہے۔ یہ اپنی ایک مستقل روشن علمی و فکری تاریخ رکھتی ہے۔ اس نے بے شمار ایسے افراد کو جنم دیا جنہوں نے ابر باراں بن کر چار دانگ عالم کو اپنے علمی و روحانی چھینٹوں سے سیراب کیا ہے، اور حیرت انگیز بوقلموں کارنامے انجام دے کر ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں اور لیاقتوں کا لوہا منوایا ہے۔ تصوف و روحانیت کے میدان میں حضرت داتا گنج بخش بھجوری، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت نظام الدین اولیا، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت علاء الدین صابر کلیری، حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو دراز، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی اور مشائخ مارہرہ مطہرہ کی حیثیت آفتاب عالم تاب کی طرح روشن و تابناک ہے۔ علوم نقلیہ و فنون عقلیہ کے میدان میں ملک العلماء علامہ شہاب الدین دولت آبادی، شیخ محمد طاہر پٹنی گجراتی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، بحر العلوم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، علامہ فضل حق خیر آبادی، علامہ فضل رسول بدایونی، تاج النحول علامہ عبدالقادر بدایونی، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی اور صدر الشریعہ علیہم الرحمۃ والرضوان جیسے ائمہ فکر و فن کی ایک لمبی قطار نظر آتی ہے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک سنہری، روشن اور تابناک کڑی فقیہ اعظم ہند شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

آپ آفاقی فکر و نظر کے حامل، پر عزم حرکت و عمل کی چلتی پھرتی تصویر، جہد مسلسل، سعی پیہم، اخلاص و وفا کے پیکر جمیل، علم و حکمت کے بحر بے کراں، عمل و کردار کے سیل رواں اور گونا گوں فضائل و کمالات کے جامع کامل تھے۔

ولادت و نسب:

آپ کی ولادت ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء میں ضلع اعظم گڑھ (حال ضلع سوات) کے نہایت

مشہور و معروف اور مردم خیز خطہ قصبہ گھوسی کے محلہ کریم الدین پور میں ہوئی۔ آپ کا نسب نامہ کچھ اس طرح ہے:

مفتی شریف الحق امجدی بن عبدالصمد بن ثناء اللہ بن لعل محمد بن مولانا خیر الدین اعظمی۔
مولانا خیر الدین علیہ الرحمہ اپنے عہد میں پائے کے عالم اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے، ان کا یہ روحانی فیض آج تک جاری ہے کہ ان کے عہد سے لے کر اس دور میں پانچویں پشت تک ان کی نسل میں اجلہ علمائے کرام موجود ہیں۔ انہیں میں سے ایک شارح بخاری، فقیہ اعظم ہند حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جو ماضی قریب میں ہندو پاک کے مسلمانان اہل سنت کے صف اول کے مقتدا اور پوری دنیا کے اہل سنت کے مرجع فتاویٰ اور مرکز عقیدت تھے۔

تعلیم و تربیت:

محلہ باغیچہ قصبہ گھوسی کے مقامی مکتب میں آپ نے ناظرہ قرآن شریف کی تعلیم حاصل کی، اور صدر الشریعہ علامہ مفتی امجد علی رضوی اعظمی (مصنف بہار شریعت) کے بچھلے بھائی حکیم احمد علی علیہما الرحمہ سے گلستاں و بوستاں پڑھی بڑے ہی شوق، دل چسپی اور لگن کے ساتھ یہ تعلیم حاصل کی۔ ابتدا ہی سے آپ کے دل میں یہ امنگ اور جذبہ کار فرما تھا کہ کسی بڑی درس گاہ میں داخلہ لے کر جلیل القدر اساتذہ اور ماہرین علوم و فنون سے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ چنانچہ اسی تمنا اور لگن کے زیر اثر آپ نے ۱۰ ارشوال المکرم ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء کو دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور میں داخلہ لیا۔

واضح رہے کہ اس سے ایک سال قبل ۲۹ ارشوال ۱۳۵۲ھ کو قصبہ مبارک پور کا بخت خوابیدہ بیدار ہوا، اور وہاں کی مبارک سرزمین کو صدر الشریعہ کے عزیز ترین شاگرد، حافظ ملت، ابوالفیض علامہ شاہ عبدالعزیز مراد آبادی ثم مبارک پوری کی قدم بوسی نصیب ہوئی جن کی نگاہ کیسیا اثر نے اس قصبہ کی تقدیر ہی بدل کر رکھ دی۔ صدر الشریعہ کے حکم پر حافظ ملت کے مبارک پور آنے کی خوش خبری جوں ہی نسیم سحر کی طرح ضلع اعظم گڑھ اور اطراف و جوانب

میں پھیلی تشنگانِ علوم نبویہ کے قافلے کشاں کشاں مبارک پور کی سرزمین کی طرف بڑھنے لگے۔ حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ ان سابقین اولین میں سے ہیں جو حافظ ملت قدس سرہ کے مبارک پور آنے کے ایک سال بعد ہی حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے ہمراہ آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہیں آپ نے حافظ ملت قدس سرہ کے زیر سایہ رہ کر آٹھ سال تک تعلیم حاصل کی۔ اس دوران آپ نے فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ابتدائی عربی سے لے کر صدرا، حمد اللہ، ہدایہ اور ترمذی شریف تک کتابیں بڑی محنت، عرق ریزی اور جاں سوزی کے ساتھ پڑھیں، اور حافظ ملت کے فیضان علم سے آپ کا سینہ موجزن ہونے لگا۔

محرم الحرم ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء میں سات آٹھ ماہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ اندر کوٹ میرٹھ کے بھی آپ طالب علم رہے، یہاں آپ نے صدر العلماء حضرت مولانا سید غلام جیلانی علی گڑھی ثم میرٹھی سے حاشیہ عبدالغفور اور ثمس بازغہ وغیرہ اور خیر الاذکیاء حضرت علامہ مولانا غلام یزدانی اعظمی سے خیالی وقاضی مبارک وغیرہ اہم کتابوں کا درس دلیا۔

شوال ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء میں آپ مدرسہ مظہر اسلام مسجد بی بی جی، محلہ، بہاری پور، بریلی شریف پہنچے، جہاں ابوالفضل حضرت علامہ سردار احمد گورداس پوری ثم لائل پوری محدث اعظم پاکستان کا خورشید علم تمام تر تابانیوں کے ساتھ اپنی کرنیں بکھیر رہا تھا۔ محدث اعظم پاکستان سے آپ نے صحاح ستہ حرفاً حرفاً پڑھ کر دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ اور ۱۵ شعبان ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء کو درس نظامی سے آپ کی فراغت ہوئی۔ صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا قادری نوری اور دیگر اجلہ علماء و مشائخ اہل سنت نے اپنے مقدس ہاتھوں سے دستارِ فضیلت اور جہ سے نوازا، اور اسی مبارک و مسعود موقع پر حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ نے غایت کرم سے مدرسے کی عام سند کے علاوہ اپنی سند خاص سے بھی سرفراز فرمایا۔

اساتذہ و مشائخ کرام میں جن حضرات کی تعلیم و تربیت کا آپ کی زندگی پر گہرا اثر تھا، ان میں صدر الشریعہ، مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں، حافظ ملت ابوالفیض مولانا شاہ عبدالعزیز محدث مراد آبادی بانی الجامعہ الاشرافیہ مبارک پور اور محدث اعظم پاکستان ابوالفضل

مولانا سردار احمد قادری رضوی بانی مظہر اسلام بریلی شریف و جامعہ رضویہ مظہر اسلام لائل پور، فیصل آباد پاکستان علیہم الرحمہ سرفہرست ہیں، خصوصیت کے ساتھ آپ نے حافظ ملت سے سب سے زیادہ فیض پایا۔ اس لیے حافظ ملت سے آپ کو غایت درجہ قلبی الفت اور والہانہ عشق و عقیدت تھی۔

درس نظامی کے علاوہ فتویٰ نویسی کی تعلیم و تہرین ایک سال سے زائد حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ سے حاصل کی اور حضور مفتی اعظم قدس سرہ کی بارگاہ میں گیارہ سال رہ کر فتویٰ نویسی سیکھی، یہاں تک کہ ایک معتمد و مستند مفتی اور فقیہ کی حیثیت سے آپ کی ذات گرامی برصغیر ہندوپاک میں معروف و مشہور ہو گئی اور ”نائب مفتی اعظم ہند“ کے لقب سے آپ کو علمی حلقوں میں یاد کیا جانے لگا۔

شیوخ و اساتذہ:

شارح بخاری کے دور طالب علمی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کے شیوخ و اساتذہ کی فہرست میں درج ذیل اسمائے گرامی آتے ہیں:

- (۱) صدر الشریعہ مولانا حکیم امجد علی اعظمی (مصنف بہار شریعت، فتاویٰ امجدیہ وغیرہ)
- (۲) مفتی اعظم ہند مولانا شاہ مصطفیٰ رضا قادری نوری بریلوی شہزادہ اعلیٰ حضرت۔
- (۳) حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث مراد آبادی، بانی الجامعہ الاشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ
- (۴) محدث اعظم پاکستان مولانا محمد سردار احمد قادری چشتی گورداس پوری ثم لائل پوری
- (۵) صدر العلماء مولانا سید غلام جیلانی علی گڑھی ثم میرٹھی (مصنف بشیر القاری شرح بخاری وغیرہ)

- (۶) خیر الاذکیاء مولانا غلام یزدانی اعظمی، سابق صدر المدرسین مظہر اسلام بریلی شریف
- (۷) شیخ المسحولات، مولانا محمد سلیمان بھاگل پوری، سابق شیخ الحدیث جامعہ حمیدیہ رضویہ، مدن پورہ بنارس، یوپی
- (۸) مولانا شاہ اللہ محدث منوی

- (۹) مولانا غلام محی الدین بلیاوی
- (۱۰) شیخ التجوید مولانا قاری محمد عثمان اعظمی (صاحب مصباح التجوید)
- (۱۱) بلبل فارسی مولانا سید شمس الحق گجھڑوی، مبارک پوری
- (۱۲) حکیم احمد علی اعظمی (برادر صدر الشریعہ)
- (۱۳) ماسٹر علیم اللہ خاں، قصبہ گھوسی ضلع متو
- (۱۴) مولوی محمد شریف اعظمی، قصبہ گھوسی ضلع متو
- (۱۵) مولوی غلام حسین، قصبہ گھوسی ضلع متو

مذکورہ علمائے کرام و مشائخ عظام اور اساتذہ ذوی الاحترام سے مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں شلاح بخاری نے درس لیا، استفادہ کیا، ان کے دامن فضل و کمال سے خوشہ چینی کی، اور اپنے آپ کو زیورِ علم سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ تفسیرہم اللہ تعالیٰ بفضرانہ واسکنوسم بمبوحۃ جنانہ۔

تدریسی میدان میں:

ماہر فن اور جلیل القدر اساتذہ کرام سے اکتسابِ علم کرنے کے بعد حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ نے تقریباً پینتیس سال تک نہایت ذمہ داری کے ساتھ بڑی عرق ریزی و جاں سوزی اور کمال مہارت کے ساتھ ہندوستان کے مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ہر فن کی مشکل سے مشکل ترین کتابیں پڑھائیں، برسہا برس تک دورہ حدیث بھی پڑھاتے رہے۔ اور اخیر میں درس و تدریس کا مشغلہ چھوڑ کر جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں شعبہ افتا کی مسند صدارت پر متمکن ہو کر چوبیس برس تک رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے، جن درس گاہوں کی مسند تدریس و افتا پر جلوہ افروز ہو کر آپ نے علم و حکمت کے گوہر آبدار لٹائے ان کے اسما درج ذیل ہیں:

- (۱) مدرسہ بحر العلوم، متواتر بھجنجن، ضلع اعظم گڑھ (۲) مدرسہ شمس العلوم، گھوسی ضلع اعظم گڑھ (۳) مدرسہ خیر الاسلام، چلہ، پلاموں، بہار (۴) مدرسہ حنفیہ مالیکاؤں، مہاراشٹر

- (۵) مدرسہ فضل رحمانیہ پکپڑوا، گوئڈہ (۶) مدرسہ عین العلوم، گیوال بگہ، گیا، بہار
 (۷) جامعہ عربیہ انوار القرآن، بلرام پور، گوئڈہ (۸) دارالعلوم ندائے حق، جلال پور فیض آباد
 (۹) دارالعلوم مظہر اسلام، بی بی جی، بریلی شریف (۱۰) الجامعہ الاشرافیہ مبارکپور۔

تلاذہ:

آپ کی درس گاہ فیض سے شعور و آگہی کی دولت حاصل کرنے والے طلبہ اتنے کثیر ہیں کہ ان سب کا شمار تقریباً ناممکن ہے۔ ان میں سے چند مشہور حضرات کے نام پیش خدمت ہیں جو اس وقت اہلسنت و جماعت کے نامور علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔

☆ خواجہ مظفر حسین رضوی پورنوی ☆ مولانا مجیب اشرف اعظمی ثم ناگپوری
 ☆ قاضی عبدالرحیم بستوی، بریلی شریف ☆ مولانا رحمت حسین کلیمی، بانسی پورنیہ ☆ مولانا
 قمرالدین اشرفی اعظمی ☆ مولانا عزیز الحسن اعظمی ☆ مولانا حفیظ اللہ اعظمی ☆ مولانا سلطان
 احمد ادروی ☆ مولانا امام الدین مصطفوی ☆ مولانا محمد کوثر خاں نعیمی (جہانگیر گنج) ☆ مولانا
 افتخار احمد قادری ☆ مفتی شفیق احمد، گوئڈہ ☆ مولانا محمد عمر بہراچی ☆ مولانا غلام ربانی فائق
 القادری ☆ مولانا رحمت اللہ بلرام پوری ☆ مولانا عبدالودود فقیہ، رائے بریلی ☆ مولانا
 قاری شفیق احمد، پکپڑوا ☆ مفتی شفیق احمد شریفی ☆ مولانا طیش محمد شریفی ☆ مولانا فروغ
 احمد اعظمی صدر المدرسین دارالعلوم علیہ جمہ اشاہی، ہستی۔

اور اساتذہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں مفتی محمد نظام الدین رضوی ☆ مولانا حافظ
 عبدالحق رضوی ☆ مفتی محمد معراج قادری ☆ مفتی بدر عالم فیض آبادی ☆ مفتی محمد نسیم
 مصباحی ☆ مفتی محمد ارشاد احمد مصباحی (سہرام)

اور ارکان الجمع الاسلامی مبارک پور علامہ محمد احمد مصباحی اعظمی ☆ مولانا یسین اختر
 مصباحی ☆ مولانا افتخار احمد قادری ☆ مولانا عبدالکبیر نعمانی اور مولانا بدر القادری مصباحی
 نے سیکڑوں بار سیکڑوں مباحث و مسائل میں آپ سے استفادہ کیا۔ اس اعتبار سے مذکورہ
 ارکان بھی آپ کے تلاذہ کی صف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ (شارح بخاری: ص ۲۳)

اور فقیر راقم سطور نے اگرچہ باضابطہ کوئی کتاب تو آپ سے نہ پڑھی لیکن جامعہ

اشرفیہ میں مدرس ہو جانے کے بعد دو سال تک متعدد مسائل و ابحاث اور عبارات کتب کے حل کے سلسلے میں حضرت سے خاص استفادہ کیا، اور اس دوران آپ کے فیضان و کرم اور شفقت و مہربانی کی بارش میں نہانے کا خوب موقع ملا، اس لیے خود کو ان کا ادنیٰ تلمیذ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔

بیعت و خلافت:

دارالعلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور کے ایک جلسہ منعقدہ ۱۳۵۹ھ میں صدر الشریعہ علامہ شاہ محمد امجد علی قادری رضوی ^{عظمیٰ} خلیفہ امام احمد رضا قادری بریلوی مبارک پور شریف لائے تو بغیر کسی ترغیب و تحریک کے آپ انہیں سے بیعت ہوئے۔ آپ حضرت صدر الشریعہ کے سابقین اولین مریدوں میں سے ہیں۔ شوال ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء کو دوسرے سفر حج و زیارت کے موقع پر صدر الشریعہ قدس سرہ نے آپ کو سلسلہ عالیہ قادریہ برکاتیہ رضویہ کی اجازت دی، اور بریلی شریف کے قیام کے زمانے میں حضور مفتی اعظم علامہ شاہ مصطفیٰ رضا قادری نوری بریلوی خلف اصغر مجدد اسلام امام احمد رضا قادری قدس سرہمانے ۷ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ کو ”التور الہیاء“ میں مذکورہ انتالیس سلاسل قرآن و حدیث و سلاسل اولیاء اللہ کی تحریری اجازت کے ساتھ سلسلہ قادریہ برکاتیہ رضویہ کی بھی اجازت مرحمت فرمائی، علاوہ ازیں ۱۳۸۳ھ میں مفتی اعظم نے ”الاجازات المتینہ“ میں درج تمام سلاسل کی بھی اجازت عطا فرمائی، اور احسن العلماء حضرت سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن علیہ الرحمہ سجادہ نشین خانقاہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے عرس قاسمی ۱۴۰۴ھ کے موقع پر بلا طلب اپنے خاندان کے تمام سلاسل جدیدہ کی اجازت عطا فرمائی اور دستار بندی فرمائی۔

خلفا و مریدین:

حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کی حیات طیبہ تک آپ جلد کسی کو مرید نہیں فرماتے تھے، جو طالب آتا اسے مفتی اعظم یا حافظ ملت سے مرید کرا دیتے۔ ان بزرگوں کے وصال

کے بعد بھی جب کوئی بہت اصرار کرتا تو آپ بیعت فرماتے، یہی حال خلافت کا تھا۔ اسی لیے آپ کے مریدین اور خلفا کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ خلفا میں چند نام یہ ہیں:

حضرت علامہ عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہاں پوری علیہ الرحمہ (لاہور) ☆ مولانا حافظ عبدالحق رضوی (جامعہ اشرفیہ مبارک پور) ☆ مولانا رجب علی بلرام پوری (بنارس) ☆ مولانا طیش محمد شریفی (دھول پور) ☆ مولانا ولی اللہ شریفی (ممبئی) ☆ مولانا حافظ شمیم الزماں فیض آبادی (ہوڑہ) ☆ مولانا محبت اللہ شریفی (کرناٹک) ☆ مولانا بشیر احمد قادری (جالون) ☆ صاحبزادہ مولانا حافظ حمید الحق (قصبہ گھوسی، اعظم گڑھ) ☆ مولانا بدر عالم مصباحی (جامعہ اشرفیہ مبارک پور) ☆ مولانا محمد نسیم مصباحی (جامعہ اشرفیہ مبارک پور) ☆ مولانا خلیق احمد اعظمی ☆ مولانا ادیس بستوی ☆ مولانا صغیر احمد جوکھپوری۔

ہندو بیرون ہند کے علما و مشائخ کو اجازتیں:

آپ کو اپنے اساتذہ و مشائخ سے سلاسل قرآن و حدیث، سلاسل طریقت اور اوراد و وظائف کی اجازتیں حاصل تھیں جن کی تفصیل خود آپ کے تحریر کردہ مقالہ بعنوان ”اجازت و اسانید“ مطبوعہ معارف شارح بخاری، صفحہ ۲۳۸ تا ۲۳۹ میں موجود ہے۔ اسی میں آپ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

جن سلاسل کی مجھے اجازت ہے، ان کی تعداد اٹھہتر (۷۸) ہے، اجازات قرآن مجید گیارہ (۱۱)، سلاسل احادیث انتالیس (۳۹)، سلاسل اولیاء اللہ اٹھارہ (۱۸)، حرز یمانی، حزب البحر وغیرہ اوراد و وظائف کی اجازتیں نو (۹)، سند فقہ۔

اتنی اجازتیں آپ کے معاصرین میں شاید باید چند علما کو حاصل ہوں، اس طرح آپ کی ذات ان تمام سلاسل کی سنگم اور مجمع البحار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو بیرون ہند کے بہت سے علما و مشائخ نے آپ سے اجازتیں لیں۔ اور آپ نے طالب کے ظرف کے مطابق قرآن و حدیث و فقہ اور دیگر سلاسل کی اجازتیں عطا کیں۔ ان اجازت یافتہ حضرات میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

☆ مولانا مفتی مجیب اشرف اعظمی ثم ناگپوری ☆ مولانا عبدالحکیم خان اختر شاہ
 جہاں پوری ثم لاہوری (علیہ الرحمہ) ☆ مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری، شیخ الحدیث جامعہ
 نظامیہ قادریہ لاہور ☆ مولانا مفتی محمد حسن علی، میلسی، ملتان، پاکستان ☆ سمیر القاضی، امریکہ
 ☆ شیخ سلیم علوان، انڈونیشیا ☆ شیخ حسام قراقیرہ، رئیس جمعیتہ المشارع الخیریہ، بیروت، لبنان
 ☆ شیخ غانم جلول، طرابلس ☆ شیخ ابراہیم شافعی، آسٹریلیا ☆ شیخ نزار فاخوری، سوئزرلینڈ ☆
 شیخ موفق رفاعی، سوئزرلینڈ ☆ الاستاذ ریاض ناشف، امریکہ ☆ الاستاذ محمد کابہ غیبیا ☆ شیخ
 ماہر تمیم، اوکرائینا ☆ شیخ محمد الولی، ڈنمارک ☆ شیخ ڈاکٹر احمد تمیم اوکرائینا ☆ شیخ یوسف داؤد،
 جرمنی ☆ شیخ ڈاکٹر سید ارشاد احمد بنگلہ دیش ☆ شیخ کمال راغب، بیروت لبنان۔

حج و زیارت:

حرمین شریفین کی حاضری اور فریضہ حج کی ادائیگی دونوں جہان کی برکتوں
 اور سعادتوں کا ذریعہ ہے۔ حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار دیار حرم کی آبلہ پائی
 فرمائی۔ ذوالحجہ ۱۴۰۵ھ ستمبر ۱۹۸۵ء میں آپ نے پہلا حج فرمایا، ممبئی سے جدہ کے لیے پرواز
 کرنے میں جانشین سید العلماء حضرت سید آل رسول حسنین میاں نظمی برکاتی مارہروی، مولانا
 خلیل احمد پٹھان (ماہم شریف، ممبئی)، قاری تراب علی رضوی (منارہ مسجد، ممبئی) ایک ہی
 ہوائی جہاز سے حضرت شارح بخاری کے ہم سفر تھے۔ دوسرا حج ۱۴۱۸ھ / ۱۹۹۷ء میں فرمایا۔
 ایک عمرہ کا سفر ۱۹۹۶ء میں اور دوسرا عمرہ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ جنوری ۱۹۹۸ء میں دوسرے
 سفر حج سے پہلے کیا۔

تبحر علمی:

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تبحر اساتذہ کرام سے بڑی شوق، محنت
 اور دل چسپی سے اکتاب علم کیا، اور جملہ علوم و فنون متداولہ میں مہارت تامہ حاصل کی، درسی
 کتابوں کے علاوہ بے شمار علمی، فنی اور مذہبی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا یہاں تک کہ آپ کی
 ذات علوم اسلامیہ اور فنون دیدیہ کی بحر بے کراں بن گئی۔ آپ نے علم و فن کی ہر وادی میں قدم

رکھا، اور فکر و آگہی کے ہر میدان کو سر کیا، سلوک و معرفت کے ہر چشمے سیرابی حاصل کی۔ یہاں تک کہ ہم عصر علما میں آپ کو نمایاں مقام حاصل ہو گیا، اور عوام تو عوام، خواص بھی اپنے پیچیدہ اور لائیکل مسائل کے حل کے لیے آپ کی طرف رجوع کرنے لگے، اور ماضی قریب میں تو آپ جیسا گونا گوں فضائل و کمالات کا حامل اور ہمہ جہت خوبیوں کا مالک اہل علم کی انجمن میں کوئی نظر نہیں آتا۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

فقہ و افتا:

یوں تو حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو تمام روجہ علوم و فنون میں یدِ طولیٰ حاصل تھا مگر فقہ و افتا میں آپ کو جو نمایاں اور امتیازی مقام حاصل تھا اس کی نظیر عہد حاضر میں کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ بات حقائق مسلمہ میں سے ہے کہ فتویٰ نویسی کے لیے صرف علوم اسلامیہ اور فنون دینیہ میں مہارت کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کسی ماہر تجربہ کار فقیہ و مفتی کی بارگاہ میں زانوے تلمذتہ کرنا اور اپنے تحریر کردہ فتاویٰ سنا کر اصلاح لینا ضروری ہے۔ اس طرح اس کو بڑی حد تک مطلب سے مشابہت ہے جو صرف پڑھ لینے اور مطالعہ کر لینے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ کسی طبیب حاذق کے مطب میں باضابطہ مشق و ممارست ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

اس لیے کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم و فاضل ہو، دقیق النظر، ژرف نگاہ اور وسیع المطالعہ ہو مگر فقہائے کرام اسے فتویٰ نویسی کی اجازت اس وقت نہیں دیتے جب تک کہ وہ کسی ماہر، تجربہ کار مفتی کی خدمت میں رہ کر مشق افتا نہ کرے۔ اسے یوں سمجھئے کہ ایک ڈاکٹر کئی اہم ڈگری حاصل کر چکا ہے لیکن اسے آپریشن کرنے کی اجازت نہیں ملتی، جب تک کہ وہ کسی ماہر سرجن کے ساتھ رہ کر سرجری کی مشق کر کے کامل نہ بن جائے۔ بلکہ ڈاکٹر کو صرف تعلیم سے فراغت کے بعد مطب کرنے کی بھی اجازت نہیں ملتی جب تک کہ وہ ”ہاؤس جاب“ نہ کر لے۔ یعنی کسی اسپتال میں جا کر کہنہ مشق ڈاکٹروں کی نگرانی میں وہ ایک مدت تک امراض کی تشخیص اور نسخہ کی تجویز کی مشق نہ کر لے۔ یہی حال فتویٰ نویسی کا ہے۔

مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

”رڈ وہابیہ اور افتا یہ دونوں ایسے فن ہیں کہ طب کی طرح یہ بھی صرف پڑھنے سے نہیں آتے، ان میں بھی طبیب حاذق کے مطب میں بیٹھنے کی ضرورت ہے، میں بھی ایک حاذق ڈاکٹر کے مطب میں سات برس بیٹھا، مجھے وہ وقت، وہ دن، وہ جگہ، وہ مسائل اور جہاں سے وہ آئے تھے اچھی طرح یاد ہیں۔ میں نے ایک بار ایک نہایت پیچیدہ حکم بڑی کوشش و جاں فشانی سے نکالا، اور اس کی تائیدات مع تنقیح آٹھ ورق میں جمع کیں، مگر جب حضرت والد ماجد قدس سرہ کے حضور میں پیش کیا تو انہوں نے ایک جملہ ایسا فرمایا کہ اس سے یہ سب رد ہو گئے۔“ (المملفوظ: ج ۱: ص ۸۴)

شعبان ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء سے شوال ۱۳۶۷ھ / اگست ۱۹۴۸ء تک مسلسل چودہ مہینے آپ نے اپنے وطن قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڑھ میں حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی قادری رضوی اعظمی علیہ الرحمہ (مصنف بہار شریعت) سے مختلف انداز سے فقہی استفادہ اور فتویٰ نویسی کی مشق کی۔ دارالعلوم مظہر اسلام بریلی شریف کے زمانہ تدریس از شوال ۱۳۷۵ھ / جون ۱۹۵۶ء تا ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء گیارہ سال، دو ماہ، تین دن کی طویل مدت میں آپ نے مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ سے ہزاروں بار، ہزاروں مسائل میں علمی استفادہ کیا اور فتویٰ نویسی کی بھرپور مشق و تمرین کی، اور جلد ہی اپنی خدا داد قابلیت و لیاقت، ذہانت و ذکاوت، مطالعہ کے ذوق و شوق کی بنا پر حضرت مفتی اعظم کے معتمد بن گئے اور عوام و خواص میں ”نائب مفتی اعظم ہند“ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ فقہ و افتا کے میدان میں امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہ کے تلامذہ و خلفا میں صدر الشریعہ اور مفتی اعظم علیہما الرحمہ کو جو امتیازی شان حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ امام احمد رضا نے ان دونوں حضرات کو پورے متحدہ ہندوستان کا قاضی و مفتی مقرر کیا تھا، جس سے قضا و افتا میں ان کی جامعیت اور تفوق کی واضح نشان دہی ہوتی ہے۔ ایسے دو عظیم ترین فقہا و مفتیان کرام کے نظر کردہ و پروردہ اور معتمد مفتی حضرت شارح بخاری کی فقہی و فنی حیثیت روز روشن کی طرح نمایاں ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی حسن اتفاق ہے کہ فقیہ اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے سب سے پہلا مسئلہ رضاعت کا تحریر فرمایا، مفتی اعظم علیہ الرحمہ کی خدمت میں بھی پہلا

مسئلہ رضاعت ہی کا پیش ہوا، جس کا آپ نے جواب دیا، اور ان کے پوتا شاگرد و نائب مفتی اعظم (شارح بخاری) نے بھی پہلا مسئلہ رضاعت ہی کا لکھا۔

تقریباً پچیس ہزار فتاویٰ آپ نے بریلی شریف میں قیام کے دوران تحریر فرمائے اور زبانی طور پر عوام و خواص کو ہزاروں مسائل سے روشناس کرایا، اور یہ سلسلہ ان سبھی مدارس اہل سنت کے زمانہ تدریس میں جاری رہا جہاں آپ مختلف اوقات میں استاذ کی حیثیت سے پہنچتے رہے۔ لیکن ذوالحجہ ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء سے الجامعہ الاشرافیہ مبارک پور میں تشریف لانے کے بعد صرف افتا کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی۔ کئی کئی معاون مفتی آپ کی سرپرستی و نگرانی میں آپ کے شعبہ افتا میں رہے اور صدر شعبہ افتا کی حیثیت سے آپ فتاویٰ کی اصلاح و تصدیق فرماتے۔ اور خود بھی برجستہ فتاویٰ املا کراتے۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں قیام کے دوران آپ کے لکھے ہوئے فتاویٰ تقریباً ساٹھ ہزار ہیں۔

انہیں خصوصیات و امتیازات اور فقہ و افتا میں نصف صدی کی مشق و ممارست، تجربہ و مہارت، نظر دقیق و فکر عمیق اور نیابت مفتی اعظم ہند نے پندرہویں صدی ہجری کے رُبع اول اور بیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر میں شارح بخاری کو ”مرجع الفتاویٰ“ کے منصب رفیع پر فائز کر دیا یہاں تک کہ اس دور اخیر میں حنفیہ کی ریاست آپ کی ہشت پہلو ذات پر ختم ہو گئی۔ محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی دام ظلہ استاذ و مفتی جامعہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ جنہوں نے آپ سے فقہ و افتا میں سب سے زیادہ استفادہ کیا، اور عصر حاضر کے مفتیان کرام میں نہایت ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ہیں، وہ حضرت کے فتاویٰ کے خصائص و محاسن کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”میری دانست میں حضرت کے فتاویٰ میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک استاذ فن، ماہر مفتی کے فتووں میں ہونی چاہئیں۔ مثلاً:

(۱) کتاب اللہ سے استدلال۔

(۲) حدیث رسول اللہ سے استدلال۔

(۳) اجماع امت سے استدلال۔

- (۴) فتاویٰ کے ثبوت میں کتاب و سنت کے عموم و اطلاقات سے استدلالات۔
 (۵) فقہی جزئیات سے استدلال۔ (۶) متعارض دلائل میں تطبیق۔ (۷) تاسخ، منسوخ، مطلق، مقید کی تعیین و تشریح۔ (۸) فتاویٰ میں تحقیق و تنقیح مناط کا لحاظ۔ (۹) مسائل کی الجھن کا ازالہ۔ (۱۰) حالات زمانہ کی رعایت۔ (۱۱) مسائل شرعیہ کے اسرار و حکم کی وضاحت (۱۲) بد مذہبوں کے دلائل کا جواب اور ان کی گرفت۔ (۱۳) نوپید مسائل کے احکام کی تخریج۔ (۱۴) اختلافی مسائل میں اعتدال کی روش۔ (۱۵) رسم المفتی پر نظر۔ (۱۶) عناد پر مبنی مسائل کا مسکت و الزامی جواب۔ (۱۷) تحقیق بدلنے کی صورت میں حکم سابق سے رجوع۔ (۱۸) جو مسئلہ منقح نہ ہو سکے اس میں توقف، یا ”لا ادری“ کا اظہار۔ (۱۹) مستفتی کی زبان کی رعایت۔ (۲۰) جواب میں اختصار و جامعیت۔
 (معارف شارح بخاری، ص: ۸۲۶/۸۲۷ مطبوعہ رضا اکیڈمی، بمبئی)

فتویٰ نویسی سے متعلق چند ارشادات و ہدایات:

حضرت فقیہ اعظم ہند شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان ایک ماہر، تجربہ کار، بہت مشق اور دور رس نگاہوں کے مالک فقیہ و مفتی تھے۔ آپ کے ارشادات سالہا سال کے تجربات کا نچوڑ ہیں جو میدان افتا کے کار پردازوں اور وادی افتا کے نو واردوں کیلئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طلبہ فتویٰ نویسی کی مشق کیسے کریں، اور اس پر بیچ اور خار دار وادی کو کیسے سر کریں، اس سلسلے میں آپ فرماتے ہیں:

”مشق کے لیے پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ طالب علم بہار شریعت کا بالترتیب وبالاستیعاب مطالعہ کرے، بہار شریعت میں جس کتاب کا حوالہ ہو اس کو بھی دیکھے، پھر جو کتب فقہ میسر ہوں، خصوصاً رد المحتار، فتاویٰ عالمگیری، البحر الرائق، غنیۃ، بدائع الصنائع ان میں اس مسئلے کو دیکھ لے۔“

اگر مختلف اقوال ہوں تو وہ خود سوچ کر، کوشش کر کے وجہ ترجیح معلوم کرے، ورنہ اپنے شیخ کی طرف رجوع کرے، اس کو ٹالے نہیں، یہ فتویٰ نویسی کی خست اول ہے۔

اسی کے ساتھ فتاویٰ رضویہ میں بھی تلاش کرے کہ وہ مسئلہ ہے یا نہیں۔ اور اس کو بغور پڑھے، بلکہ بہار شریعت کے بعد سب سے پہلے فتاویٰ رضویہ ہی کو دیکھے، یا مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے وہ رسائل جن میں یہ مسئلہ مذکور ہو ان کو دیکھے۔

فتاویٰ لکھنے میں کن امور کا لحاظ ضروری ہے؟ فرماتے ہیں:

”فتویٰ نویسی کے لیے پہلی بات یہ ہے کہ سوال کو بغور پڑھے، مسائل کے لہجے سے یہ پہچاننے کی کوشش کرے کہ یہ حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے پوچھ رہا ہے، یا آزمانے کے لئے پوچھ رہا ہے، یا یہ سوال مناظرانہ ہے؟ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن کوشش کرنے سے اس میں مہارت ہو جاتی ہے، پھر مسائل جس قسم کا ہو اسی اعتبار سے اس کو جواب دینا چاہیے۔ مسائل اگر مقلد اور مخلص ہے، حکم شرعی معلوم کرنا چاہتا ہے تو بہت عمدگی کے ساتھ تحقیقی جواب دیا جائے، اور اگر وہ سوال کسی اشکال کے سلسلے میں ہے تو اس اشکال کو ضرور حل کیا جائے۔“

اصلاح لینے میں کن امور کو ملحوظ نظر رکھے؟

”جب استاذ کے یہاں جواب سنائے، اور وہ کوئی اصلاح فرمائیں تو اس کو بغور سنے اور تسلی نہ ہو تو ان سے دوبارہ سوال کرے، اور اگر کسی وجہ سے جلال آجائے تو حسن تدبیر سے ان کے جلال کو جمال سے بدلنے کی کوشش کرے، یا کسی اور مناسب وقت کے لیے یوں ہی چھوڑ دے، مگر مناسب وقت آجانے پر وجہ ضرور معلوم کر لے، اصلاح کے وقت وہ جو کچھ فرمائیں اس کو خوب غور سے سنے۔“

☆ کم از کم پوری شامی، عالم گیری، غنیہ، البحر الرائق اور فتح القدر کا مطالعہ ضرور کرے۔ اور مطالعہ کرتے وقت ایک سادہ کاپی رکھ لے، جس میں اہم مسائل کو مع صفحہ نوٹ کرے، کاپی اگر ابواب کی ترتیب سے رکھے تو اس میں آسانی ہوگی۔

☆ مطالعہ کرتے وقت اہم مسائل و مباحث کو آنکھ بند کر کے پانچ چھ مرتبہ ذہن میں بٹھالے۔ کتب فقہ کے علاوہ کنز الایمان مع خزائن العرفان روزانہ کم از کم نصف پارہ کا مطالعہ کر لیا کرے۔ آیات کے کلمات کریمہ کے جو ترجمہ کنز الایمان میں ہیں، ان کو ذہن میں

بٹھائے، اور حضرت صدرالافاضل علامہ نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر خزائن
العرفان میں اس کے تحت جو افادہ فرمایا ہے اس پر غور کرے کہ افادہ کی ضرورت کیا ہے۔

مزید برآں تفسیرات احمدیہ، مدارک التنزیل، تفسیر صاوی، تفسیر خازن کا بھی مطالعہ
کرے۔ شروح حدیث میں اشعة اللمعات، مرقات، فتح الباری، عمدۃ القاری، (یعنی) کی
ان احادیث کا ضرور مطالعہ کرے جن کا تعلق عقائد و اعمال سے ہو، اگر پوری مطالعہ کر لے تو
کیا کہنا۔ عقائد میں شرح عقائد، المعتمد المستند، اور اعلیٰ حضرت کے تمام رسائل کا مطالعہ
کرے۔ (معارف شارح بخاری: ص ۸۷۱، ۸۷۲)

رد و مناظرہ:

ماضی کے اکابر علمائے اہل سنت میں شیر پیشہ سنت مولانا ہدایت رسول قادری برکاتی
رام پوری ثم لکھنوی، مناظر اہل سنت مولانا حشمت علی لکھنوی ثم پبلی بھیتی، مجاہد ملت مولانا
حبیب الرحمن قادری اڑیسوی، اجمل العلماء مفتی شاہ محمد اجمل حسین سنبل علیہم الرحمۃ
والرضوان رد و مناظرہ کے مرد میدان تھے اور ماضی قریب میں شارح بخاری علیہ الرحمہ ان
شیران اسلام کی یادگار اور ان کے پرچم حق کے علمبردار تھے۔

یوں تو تدریس، افتا اور تصنیف سب کے سب بہت اہم کام ہیں، مگر بعض وجوہ کی بنا
پر مناظرہ سب سے اہم ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تدریس بہت مشکل کام ہے، مگر
مدرس جانتا ہے کہ ہمیں کل فلاں کتاب میں فلاں سبق پڑھانا ہے، اس لیے وہ شروع و حواشی
اور دیگر معاون کتابوں کی مدد سے اس کی بھرپور تیاری کر لیتا ہے، پڑھنے والے نیاز مند شاگرد
ہوتے ہیں، اگر درسی تقریر میں کوئی غلطی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، اس کی تصحیح ہو جاتی ہے،
تصنیف میں مصنف ایک موضوع ذہن میں متعین کر کے اس سلسلے میں گہرا مطالعہ کرتا ہے
اور حاصل مطالعہ میں سے جو چاہتا ہے سکون و اطمینان کے ساتھ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر صفحہ
قرطاس پر منتقل کر دیتا ہے۔ افتا میں اگرچہ کبھی سوالات بہت پیچیدہ اور اہم ہوتے ہیں مگر مفتی
کو غور و فکر اور مطالعہ کا موقع رہتا ہے کہ گھنٹے دو گھنٹے، ہفتے دو ہفتے، مہینے دو مہینے میں جب مسئلہ

حل ہو جائے، جواب لکھے۔ لیکن مناظرہ ان سب سے مختلف ایک جاں گداز اور دل سوز عمل ہے۔ مناظرہ مناظرہ سے پہلے موضوع کے متعلق موافق و مخالف دلائل و شواہد اور اباحت ذہن میں بٹھالیتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ بحث اسی دائرہ میں محدود رہے۔ موضوع اور اس کے دلائل کے متعلق کوئی بھی سوال اٹھ سکتا ہے، اور بحث چھڑ سکتی ہے۔ اس لیے اس میں منقولات و معقولات میں تبحر، اسلامی و عربی علوم و فنون پر عبور تاریخ و احوال زمانہ سے آگہی، حریف و مد مقابل کی شاطرانہ چالوں سے باخبری، اس کی کمزوری پر نظر، تحقیقی و الزامی جواب، حملہ و دفاع کا بروقت فیصلہ اور استحضر علمی و تیعظ قلبی جیسے اوصاف کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ نہ صرف ان اوصاف کے ساتھ متصف تھے بلکہ ان میں کمال و مہارت رکھتے تھے۔

آپ نے بہت سے مناظروں میں مختلف حیثیتوں سے شرکت فرمائی، کہیں مناظرہ اہلسنت کا علمی تعاون کیا، کہیں خود مناظرہ کیا، کہیں مناظرہ کی صدارت کی، درج ذیل مقامات کے مناظروں میں آپ کا سرگرم اور نمایاں کردار رہا۔

(۱) بریلی شریف میں قادیانی سے مناظرہ، بزمانہ طالب علمی (۲) رائے پور ضلع لکھیم پور کھیری (۳) باندوچترا، ضلع پلاموں (۴) بھمن گاؤں، ضلع بستی، سیتاپور (۵) جھریا ضلع دھندا (۶) کٹک، اڑیسہ (۷) بجزیبہ بنارس (۸) سعدی مدن پور ضلع فتح پور (۹) بدایوں۔

وعظ و خطابت:

تقریر و خطابت کی سحر انگیزی اور سرعتِ تاثیر ساری دنیا میں مسلم ہے۔ خود حدیث نبوی میں بھی اس صفت کا بیان موجود ہے کہ ایک موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إِنَّ مِنَ الشَّعْرِ لِحِكْمَةٌ وَإِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا" خالق لم یزل نے حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ کو دیگر اوصاف حمیدہ کے ساتھ تقریر و تبلیغ اور وعظ و خطابت کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ بحیثیت مقرر مدت دراز سے آپ ملک کے بے شمار شہروں کا دورہ کرتے رہے، حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کی معیت و رفاقت میں بھی آپ نے سیکڑوں بار ہندوستان کے

مختلف علاقوں میں جا کر تقریر و تبلیغ کی۔ لاکھوں افراد آپ کی تقریر سے متاثر اور بہت سے لوگ معاصی و منکرات سے تائب ہوئے۔ آپ کی تقریریں پُر مغز، پُر درد، دل پذیر اور پتھر کو موم بنانے والی ہوتی تھیں۔ جس موضوع پر بولتے بہت جلد اس کے تمام ضروری گوشوں کا احاطہ کر کے ان پر بھرپور روشنی ڈالتے، قرآن و حدیث، اقوال صحابہ و تابعین اور آثار سلف سے استدلال فرماتے۔ اور کمال یہ ہے کہ اہم سے اہم اور پیچیدہ سے پیچیدہ عنوان پر برجستہ تقریر کرتے، اور اس سے متعلق ایسی معلومات پیش کرتے کہ عوام تو عوام، خواص بھی انگشت بندھاں نظر آتے۔ خود میں نے آپ کی بہت سی تقریریں سنی ہیں۔ ”وما ارسلناک الا رحمة للعالمین“ کے عنوان پر گہوارہ علم و ادب لکھنؤ کی سرزمین پر میں نے آپ کی ایسی پُر مغز اور پُر نکات تقریر سنی کہ اس ڈھنگ سے اس عنوان پر آج تک کسی بڑے سے بڑے خطیب اور عالم سے تقریر سننے میں نہ آئی۔

آپ کی تقریر تبلیغ و اشاعت دین اور احقاق حق و ابطال باطل کی نیت سے ہوتی تھیں، اس لیے ان میں اخلاص بھی ہوتا تھا اور سادگی تھی، درد بھی ہوتا تھا، اور بے خونی بھی، قوت و توانائی بھی ہوتی تھی اور معانی و مفاہیم کی کثرت بھی، اپنوں کے دل کی ٹھنڈک بھی ہوتی تھی اور منکرین کے لیے تلوار و نیزہ کی مار بھی، عشق کا سوز و ساز بھی ہوتا، اور حق کی آواز بھی۔

خیر الاذکیاء حضرت علامہ محمد مصباحی دام ظلہ صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارک پور فرماتے ہیں:

” میں نے آپ کی تقریر میں چند خاص باتیں محسوس کیں۔ (۱) عالمانہ وقار (۲) اعتقادی اور علمی لحاظ سے پختگی (۳) جملوں اور مضامین کی صحت و ندرت (۴) مضمون علمی اور مشکل ہونے کے باوجود بہت آسان انداز میں ایسا بیان کہ عوام کو بھی بخوبی سمجھ میں آئے۔ (۵) ترتیب میں ایسی عمدگی کہ پورا خطاب ذہن نشیں رہے، اور چاہیں تو اسی ترتیب کے ساتھ سامعین دوسروں کو سمجھاسکیں (۶) ایسا دلچسپ اور موثر خطاب کہ اکتاہٹ نہ ہو (۷) سلی و غیر تحقیقی باتوں سے مکمل اجتناب۔

تقریریں کئی طرح کی ہوتی ہیں: (۱) ادق اور علمی جن کو اہل علم ہی سمجھ سکیں (۲) سلی

اور دلچسپ جن کو عوام تو پسند کریں، مگر اہل علم حقارت سے دیکھیں (۳) غیر تحقیقی باتوں کی کثرت، علمی و تاریخی لحاظ سے غلط، روایات میں اپنی جانب سے بے جا اضافے، الفاظ کے، جملوں کے، مضامین کے، غلط سیاق و سباق کے پیوند پر پیوند، مگر بیان میں ایسی چاشنی اور زور کہ عوام وجد میں آجائیں۔ ایسی تقریروں سے ان خطبا کے کشلول بھرے ہوتے ہیں، جنہیں رضائے خدا و رسول سے زیادہ خوشنودی عوام عزیز ہوتی ہے، اور ثواب آخرت سے زیادہ عظام دنیا جمع کرنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ (۴) روایت و درایت اور علم و تحقیق کی رو سے صحیح معلومات کی جامع اور زبان و بیان کے لحاظ سے دلچسپ اور عام فہم جس سے عوام و خواص دونوں نفع اندوز ہوں۔

قسم اول کا دائرہ نفع محدود ہے، قسم دوم و سوم کی کثرت ہے، ایسی تقریریں اور ایسے خطبا ہر دور میں عوام کے دل و دماغ پر چھائے رہے، مگر صحیح معنی میں خطاب اور خطابت وہی ہے جو چوتھی قسم کے معیار پر کامل ہو۔ بفضلہ تعالیٰ حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ کی تقریر کی قسم سے تعلق رکھتی تھی اور نہایت جامع، مفید اور بصیرت افروز ہوتی تھی۔ وہ اعتقادات پر ایسے ٹھوس دلائل کے ساتھ خطاب فرماتے کہ مذہب انسان کا ایمان درست ہو جائے اور صحیح الاعتقاد شخص، راسخ الاعتقاد اور اپنے دین کا مبلغ ہو جائے، عملیات پر بھی ایسی موثر باتیں پیش کرتے کہ انسان انہیں اپنا کر صالح و اطاعت شعار ہو جائے۔ علمی تقریبات اور مجمع علما میں بھی ایسا مختصر اور نکات و معارف سے بھرپور خطاب فرماتے جو ان کے لیے فکر و بصیرت کے نئے دریچے کھول دے، اور علم و آگہی کے نئے گوشے روشن کر دے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء! آپ کی خطابت کا علمی رنگ اس وقت خوب خوب نکھرتا جب آپ اپنے مذہبی حریف کے قصر باطل کی دھجیاں بکھیر رہے ہوں، آپ کی بہت سی تقریریں اپنی یادگار آپ ہیں۔ غیر مقلدوں کی تردید میں گجرات کی تقریر ایسی زوردار اور پر مغز تھی کہ عوام تو عوام، علمائے کرام کے ذہنوں میں بھی اس کی گونج ایک عرصہ دراز تک باقی رہی۔ ختم بخاری شریف کی ساحت سعید میں جو تعارفی اور تنقیدی تقریر ہوتی تھی اس کا اپنا رنگ ہوتا۔

تحریر و تصنیف:

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ والرضوان کی فکر و قلم، تحریر و تصنیف اور زبان و ادب سے گہری وابستگی ابتداء سے رہی، یہی سبب ہے کہ طالب علمی کا زمانہ رہا ہو یا عہد شباب، شعور کی پختگی ہو یا کبر سن، علمی و تصنیفی مصروفیات نے ہمیشہ آپ کے لحاظ زندگی کا

احاطہ کیے رکھا۔ تدریس وافتا کی گراں بار ذمہ داریوں کے ساتھ آپ قرطاس و قلم کا بھی حق ادا کرتے رہے، ان کی تحریر و تصنیف نصف صدی پر محیط ہے۔ ابتدا ہی سے آپ نے وقیع مضامین و مقالات لکھے، اور آپ کے سیال قلم نے جس وادی کا رخ کیا، اسے سیراب کیا، جس حق کو چاہا، اس کا چہرہ نکھار کر روشن کر دیا، اور جس باطل پر کمند ڈالی اسے کھنچ کر اپنے پاؤں سے روند ڈالا، گویا کہ کلکب امجدی میں کلکب رضا کی حمایت حق و استیصال باطل کی جلوہ آرائی و کار فرمائی ہے، سطوت و صولت کا نغزلہ و ہمہ ہے، اور فیضان و توفیق کا حسین امتزاج ہے۔

مختلف دینی و علمی موضوعات پر آپ کی قیمتی اور جامع تحریریں اور وقیع و موثر مقالے دہلی سکندری رام پور، نوری کرن بریلی شریف، پاسبان الہ آباد، جام کوثر کلکتہ، استقامت کانپور، اشرفیہ مبارکپور، رفاقت پٹنہ، حجاز جدید دہلی وغیرہ رسالوں میں چھپ کر عوام و خواص کے درمیان مقبول ہوتی رہیں۔ ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور میں التزام و تسلسل کے ساتھ آپ کے منتخب فتاویٰ چھپ کر ماہنامہ کا وقار بلند اور قارئین کی تعداد میں اضافہ کرتے رہے۔ آپ کے مطبوعہ مضامین یکجا کر کے ”مقالات شارح بخاری“ کے نام سے شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہیں، امید ہے کہ علم و ادب کا یہ شاہکار، فکر و آگہی کا سنگم، زبان و بیان کا مرجع، تنقید و تبصرہ کی دستاویز، تحقیق و تدقیق کا شیریں چشمہ، ملی درد و کرب کا آئینہ اور دین و عقیدہ کا بحرِ خار قارئین کی علمی و فکری پیاس بجھائے گا، ان کے شعور و احساس کو ہمیز کرے گا اور ان کے فکر و عقیدہ کی زنگ صاف کر کے اسے صیقل کرے گا۔

مختلف مدارس اہل سنت کے زمانہ تدریس میں منتشر طور پر مختلف موضوعات پر کتب و مضامین لکھنے کا عمل جاری رہا، لیکن جامعہ اشرفیہ، مبارک پور آنے کے بعد مولانا یسین اختر مصباحی اور مولانا افتخار احمد قادری مصباحی کی درخواست اور اصرار پر آپ نے صحیح بخاری کا ترجمہ لکھنے کا بیڑہ اٹھایا، پھر علامہ محمد احمد مصباحی صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ، مبارک پور کی گزارش پر ترجمے کے ساتھ شرح کا کام بھی شروع فرمایا، بفضلہ تعالیٰ ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ مطابق ۳۰ دسمبر ۱۹۹۸ء کو یہ عظیم دینی و مذہبی اور علمی و تاریخی کارنامہ پایہ تکمیل کو پہنچا، جس کی خوشی میں ۲۱ شوال ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۹ جنوری ۲۰۰۰ء کو عروس البلاد ممبئی میں ”رضا

اکیڈمی کے زیر اہتمام دو روزہ عظیم الشان ”جشن تکمیل شرح بخاری“ منایا گیا، جس میں آپ کو چاندی سے تولا گیا، مگر ناظرین و حاضرین اجلاس کی آنکھیں فرط حیرت سے اس وقت پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب آپ نے اسی وقت منبر رسول پر ایک تہائی چاندی رضا اکیڈمی ممبئی کو تصانیف اعلیٰ حضرت کی اشاعت کے لیے اور دو تہائی چاندی از ہر ہند جامعہ اشرفیہ مبارک پور کو مستقبل کے زرین منصوبوں کی تکمیل کے لیے وقف کرنے کا اعلان فرمایا: فقیر راقم سطور بھی اس جشن میں موجود تھا، میں نے دیکھا کہ بہت سے حاضرین کی آنکھیں اس تاریخی موقع پر فرط حیرت و مسرت سے ڈبڈبا آئیں۔

علمی سطح پر آپ کی تحریریں اور قلمی آثار علمی و تحقیقی ایجاز کا خوبصورت اور قیمتی رنگ لیے رہتی ہیں، باتیں نئی تلی اور پتے کی ہوتی ہیں، مضامین کی فراوانی بھی خوب ہوتی ہے لیکن مفہوم کی ترسیل اور مضامین کی تفہیم کہیں بھی متاثر نہیں ہوتی، جن کا امتیازی وصف تحقیق و تدقیق ہوتا ہے، سرعت تحریر میں اپنا جواب آپ تھے۔ بحر ڈیہہ کے مناظرہ میں غیر مقلدین کی ہفتوں میں تیار شدہ مفصل تحریر کے جوابات بہت سرعت کے ساتھ تحریر کرائے جب کہ آپ ان دنوں علیل چل رہے تھے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چند دنوں میں طویل مقالات و مضامین، لمبے اور تحقیقی فتاویٰ بلکہ کتابیں لکھانا تو عام بات ہے۔

رشحات قلم:

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان کے اشہب قلم سے مختلف عنوانات پر متعدد کتابیں معرض تحریر میں آئیں، جو میری ناقص معلومات کے مطابق درج ذیل ہیں:

(۱) **نزہۃ القاری شرح صحیح البخاری**: ۳۰×۲۰ سائز کے پانچ

ہزار صفحات پر پھیلا ہوا اسلامی علوم و معارف اور حدیث و سنت کی تحقیقات و تدقیقات کا دائرہ المعارف، علمائے متقدمین و متاخرین اور سلف صالحین کی عربی و فارسی شروح کا عطر مجموعہ ہے جو ۹ جلدوں پر مشتمل ہے۔

(۲) **اشرف السیر**: اس کتاب میں سیرت نبوی کے بنیادی ستون، محمد بن

الحق (۱۵۱ھ/۷۶۸ء) محمد بن عمر الواقدی (۲۰۷ھ/۸۲۲ء)، محمد بن سعد (۳۲۰ھ/۸۴۲ء) محبت الدین بن جریر طبری (۳۰۷ھ) پرفن تاریخ و حدیث اور سیرت کے حوالے سے مخالفین کے اعتراضات کے دندان شکن علمی جوابات، سیرت پاک سے متعلق مغربی ظالمانہ اور جاہلانہ اور مشرق کے مرعوبانہ اور معذرت خواہانہ طرز عمل پر سیر حاصل تنقیدی و تحقیقی کلام، اور ابتدا سے بعثت نبوی تک سرکار کے احوال و کوائف اور آپ کے آبا و اجداد کے تعلق سے جامع، پُر مغز اور معلوماتی گفتگو کی گئی ہے $\frac{۳۶ \times ۲۳}{۱۶}$ سائز کے ۲۳۱ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی و تحقیقی دستاویز ہے۔

(۳) **اشک دواں: آزادی ہند سے پہلے کانگریس اور مسلم لیگ کی خود غرضی اور مفاد پرستی پر مبنی پُر فریب سیاست پر ضرب کاری، اور اس کی مخالفت اور مسلمانوں کے لیے اسلامی و شرعی نقطہ نظر سے تیسرے متبادل کی تجویز۔** تقسیم ہند کے بعد ہونے والی مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی تباہی و بربادی اور بعد میں انہیں درپیش سیاسی و سماجی، مذہبی و ملی پریشانیوں اور رسوائیوں کو اپنی دور میں نگاہوں سے بھانپ کر اس پر اپنے قلبی و ذہنی اضطراب، بے کلی اور بے چینی کا اظہار، اور پھر اس کے تدارک کے لیے مسلمانوں سے دردمندانہ اپیل، یہ سب کچھ اس کتاب میں شامل ہے، شارح بخاری نے پچیس برس کی عمر میں اسلامی سیاست کے موضوع پر یہ کتاب تحریر فرمائی ہے۔ آزادی ہند و تقسیم ہند سے پہلے ۱۹۳۶ء کے پُر آشوب و پُرفتن دور میں اس کی اشاعت ہوئی۔

(۴) **اسلام اور چاند کا سفر: شرعاً چاند پر انسان کا پہنچنا ممکن ہے،** اسلامیات اور فلکیات کے اصول و قواعد اور قوانین و مباحث کی روشنی میں اس مدعا پر محققانہ گفتگو کی گئی ہے جو آپ کے وسعت مطالعہ، ژرف نگاہی، قوت استدلال اور زور بیان کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ $\frac{۳۶ \times ۲۳}{۱۶}$ سائز کے ۱۴۰ صفحات پر پھیلی ہوئی محققانہ و عالمانہ تحقیقات و اباحت کا حسین گلدستہ ہے۔

(۵) **تحقیقات: اس میں وہابیوں، دیوبندیوں اور معاندین اہلسنت کے کچھ** لایعنی اعتراضات کے مدلل، تحقیقی و الزامی جوابات ہیں۔ یہ کتاب $\frac{۳۶ \times ۲۳}{۱۶}$ سائز کے ۲۸۸

صفحات پر مشتمل، دو حصوں میں ہے۔

(۶) **فتنوں کی سرزمین کون، نجد یا عراق؟** اس کتاب میں نجد و عراق کا ایک گراں قدر، حقیقت افروز اور ایمان افزا تاریخی، جغرافیائی اور دینی و سیاسی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ سائز 36×23 کے صفحات پر مشتمل ہے۔

(۷) **سنی، دیوبندی اختلافات کا منصفانہ جائزہ:** یہ سنی و دیوبندی اختلافات کی بنیاد اور اعیان و ہابیہ و دیوبندیہ کی کفری عبارتوں پر غیر جانب دارانہ، فیصلہ کن ابحاث کا خوبصورت علمی گلدستہ ہے، آپ کی یہ کتاب اپنے موضوع پر لا جواب اور بے مثال ہے: یہ 36×23 کے صفحات پر مشتمل ہے۔

(۸) **اثبات ایصال ثواب:** ایصال ثواب کے موضوع پر مصنف کی ایک نئے انداز میں بحث، میلاد و قیام، نیاز و فاتحہ کے سلسلے میں شکوک و شبہات کی وادیوں میں بھٹکنے والوں کے اطمینان کلی کے لیے ایک بیش قیمت، زور دار علمی دستاویز۔ سائز 36×23 صفحات: ۸۰۔

(۹) **مفتی اعظم ہند اپنے فضل و کمال کے آئینے میں:** یہ رسالہ حرم امت، فقہ ملت سیدنا مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کے حالات، دینی و علمی خدمات اور زریں کارناموں کی آنکھوں دیکھی روداد، اور ان کے اوصاف و کمالات کا بیش بہا، مرقع ہے۔ جو اس مقالہ میں شامل ہے۔

(۱۰) **شہادت حسین کا ذمہ دار کون؟** سوانح کربلا کے تعلق سے ایک علمی و تحقیقی تحریر اور شرعی و تاریخی دلائل سے لبریز دل آویز مقالہ۔

(۱۱) **مسائل حج و زیارات:** یہ زیارت حرمین طہیین اور مناسک حج کے عنوان پر آسان اردو زبان میں پیش قیمت علمی کتاب ہے۔ جو اس مقالہ میں شامل ہے۔

(۱۲) **السراج الکامل:** اس رسالہ میں صدر الافاضل فخر الاماثل حضرت علامہ نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ صاحب تفسیر خزائن العرفان کے بعض اقوال کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

(۱۳) **فرقوں کی تفصیل:** یہ ابتداء سے اسلام سے عصر حاضر تک بنام اسلام جنم لینے والے فرقوں کے عقائد و احوال پر ایک مختصر اور جامع مقالہ ہے۔ جو جلد اول کے باب دوم میں شامل ہے۔

(۱۴) **تعلیقات فتاویٰ امجدیہ:** یہ فتاویٰ امجدیہ جلد اول و دوم پر آپ کے ان بصیرت افروز، عالمانہ و نقیبانہ حواشی و تعلیقات کا مجموعہ ہے، جو آپ کی علمی گہرائی و گیرائی، فقہی بصیرت اور وسعت فکر و نظر کے آئینہ دار ہیں، فتاویٰ کی جلد اول 30×20 کے چار سو پچیس صفحات اور جلد دوم تین سو اٹھاسی صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

(۱۵) **تعلیقات سنان جانگاہ بدل غیر مقلدان گمراہ:** یہ اہل سنت و جماعت اور غیر مقلدین کے درمیان بجز یہہ، بنارس میں ہوئے تحریری مناظرہ کی روداد ہے اور اس پر ہر تحریر کے شروع میں بڑے قیمتی نوٹ اور حواشی لگائے ہیں، جن سے حضرت کی نثرانہ صلاحیت، نقاد ذہن، طبعی جودت اور تجزیاتی ذہن و فکری کی عکاسی ہوتی ہے۔

(۱۶) **مقالات شارح بخاری:** یہ دینی و مذہبی، علمی و ادبی، تاریخی و سوانحی، فکری و تحقیقی گونا گوں عنوانات پر حضرت کے سیکڑوں بوقلموں مضامین کا مجموعہ ہے، مجملہ تعالیٰ یہ کتاب تین جلدوں میں شائع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

(۱۷) **مسئلہ تکفیر اور امام احمد رضا:** اپنے موضوع پر نہایت شاندار، گراں قدر، اور اچھوتی محققانہ و متکلمانہ تحریر، جو موضوع کے تمام زاویوں کو حاوی، اور شبہات کے سارے تار و پود بکھیرنے والی ہے۔ سائز 36×23 صفحات: ۴۸

(۱۸) **فتاویٰ شریفیہ:** آپ کے زندگی بھر کے علمی و تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ، جو ایک اندازے کے مطابق پچتر ہزار سے زائد فتاویٰ کو محیط ہوگا۔ جلد اول کی ترتیب کا کام ہو رہا ہے، انشاء اللہ مستقبل قریب ہی میں طبع ہو کر لوگوں کی عقائد و اعمال کے میدان میں رہنمائی کرے گا۔ اور اہل علم اور ارباب فقہ و فتاویٰ سے خراج تحسین حاصل کرے گا۔

(۱۹) **اذان خطبہ کہاں ہو؟ (افادات)**

(۲۰) **تنقید بر محل: (افادات)**

مؤخر الذکر دونوں کتابیں حضرت کے علمی افادات کا مجموعہ ہیں جنہیں آپ کے تلمیذ ارشد حضرت مولانا عبدالحق رضوی استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور نے جمع فرمایا ہے۔

حاضر جوابی:

گو تاگوں اوصاف و کمالات اور فضائل و محاسن کی جامعیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حاضر جوابی کی دولت سے بھی سرفراز فرمایا تھا، آپ مخاطب کی بات سنتے ہی نہایت برق رفتاری کے ساتھ اس کے تمام گوشوں کا احاطہ کر لیتے اور بھر بر جستہ ایسا جواب عنایت فرماتے کہ اگر وہ معاند اور ہٹ دھرم ہے تو لا جواب ہو کر خاموش ہو جاتا، ورنہ مطمئن ہو کر واپس جاتا۔

جولائی ۱۹۹۶ء میں آپ نے پاکستان اور افریقہ کا ایک طویل دعوتی و تبلیغی سفر کیا، اسی موقع سے تنزانیہ کے دار السلطنت ”دار السلام“ میں ایک شخص نے جسے وہابیوں نے اپنے چنگل میں لے لیا تھا، علم غیب رسول سے متعلق متعدد سوالات کیے ان میں سے ایک سوال یہ تھا:

سوال: جب بتا دیا گیا تو غیب کہاں رہا؟ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے۔ اس کا آپ نے برجستہ یہ جواب دیا:

جواب: یہ دراصل وہابیوں کا مغالطہ نامہ الورود ہے، جاہلوں میں اس کا بڑا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں، اچھا بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ غیب جانتا ہے یا نہیں؟

وہ بھولا بھالا، اس نے ایمان کی بات کہہ دی کہ ”اللہ تعالیٰ غیب جانتا ہے“ پھر حضرت نے فرمایا: اللہ ہر چیز کو دیکھتا ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: دیکھتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے تو وہ اب غیب کہاں رہا؟ یہ سن کر وہ بے چارہ دم بخود ہو گیا، بعد میں حضرت نے اسے سمجھایا کہ یہ غیب ہمارے اعتبار سے ہے، اللہ عزوجل اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اعتبار سے نہیں، جس پر وہ مطمئن ہو گیا اور خوش خوش واپس ہو گیا۔ (معارف شارح بخاری: صفحہ ۳۶۸)

ایک مرتبہ آپ حضرت مفتی اعظم قدس سرہ کے ہمراہ جونا گڑھ کا ٹھیا واڑ کے تبلیغی سفر

پر تشریف لے گئے، اسی سفر کی آپ بتی بیان کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

”اسی سفر میں جو ناگڑھ کے ایک شیعہ نے حضرت (مفتی اعظم قدس سرہ) کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث قرطاس لے کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی شروع کر دی، حضرت (مفتی اعظم) نے پہلے اس کو ڈانٹا کہ تمیز سے بات کرو، ہم حضرت فاروق اعظم کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرطاس کس سے مانگا تھا؟ اس نے کہا: حاضرین سے۔ میں نے کہا: مریض جب کوئی چیز مانگتا ہے تو اس کو مہیا کرنا گھر والوں کا فرض ہوتا ہے۔ حضرت علی اور حضرت فاطمہ پر پہلے یہ فرض عائد تھا کہ قرطاس حاضر کرتے۔ انہوں نے کیوں نہیں حاضر کیا؟ اور اگر یہ جرم ہے تو تمہارے اعتراض اور نکتہ چینی کے مطابق اس کے سب سے بڑے مجرم حضرت علی، حضرت سیدہ فاطمہ ہیں۔ اس پر اس کی بولتی بند ہو گئی، اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ (حوالہ سابق: ص ۴۱۹)

حق گوئی:

حق گوئی اور بے باکی، ایک داعی، مبلغ، مصلح، مرشد، عالم دین اور مومن کامل کی صفات لازمہ سے ہیں۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حق تعالیٰ نے یہ وصف بھی آپ کی ذات میں خوب ودیعت فرمایا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ منکرات سے صلح کو حرام سمجھتے تھے اور اس باب میں آپ ذرہ برابر صرف نظر اور چشم پوشی کے قائل نہیں تھے، شرع مطہر کے خلاف کوئی بات دیکھتے تو فوراً اس پر تنبیہ فرماتے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی انجام دہی میں کوئی لچک اور نرمی روا نہیں رکھتے، اور نہ ہی کسی کی رعایت فرماتے۔ بہت سے لوگ آپ کے اس مومنانہ اور مجاہدانہ وصف کو ”شدت“ ”تختی“ اور نہ جانے کن کن الفاظ و کلمات سے تعبیر کرتے تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث نبوی ”من

رأى منكم منكر ا فليغيره بیده وان لم يستطع فلبسانه“ پر عمل ہوتا تھا۔ اور ارشاد رسالت ”السَّائِكُ عَنِ الْحَقِّ شَيْطَانٌ أَخْرَسٌ“ ہر وقت آپ کے پیش نظر رہتا تھا۔

داد و دہش اور مہمان نوازی:

مہمان نوازی اور سخاوت و فیاضی اخلاق کریمانہ اور صفات مومنانہ میں شمار ہوتی ہیں۔ حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان اوصاف میں بھی منفرد اور نمایاں تھے۔ غائبانہ طور سے تو میں پہلے ہی اس بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا مگر یک چشم سر اس وصف کا مشاہدہ اس وقت ہوا جب کہ شوال ۱۴۱۸ھ میں الجامعۃ الاثریہ مبارک پور میں بحیثیت استاذ میرا تقرر ہوا۔ آپ کا روزانہ کا معمول تھا کہ نماز عصر سے فراغت کے بعد اپنے کمرہ کے سامنے برآمدہ میں کرسی پر تشریف رکھتے اور اساتذہ جامعہ اشرفیہ حاشیوں پر بچھی ہوئی کرسیوں پر تشریف فرما ہوتے۔ آپ بلا تردد روزانہ اپنی جیب خاص سے عصرانہ کا انتظام فرماتے۔ اس کے علاوہ باہر سے آنے والے مہمانوں کا بھی ایک تسلسل رہتا، جن کی ضیافت کا فریضہ بھی آپ بحسن و خوبی انجام دیتے۔

گیارہ بجے شب میں گیارہ رمضان المبارک ۱۴۱۹ء کو گیارہ علمائے کرام کی موجودگی میں جب نزہۃ القاری شرح بخاری تکمیل آشنا ہوئی تو آپ نے فوراً وسیع پیمانے پر علما اور صلحا کی افطاری اور ضیافت کے اعلیٰ پیمانے پر انتظام کا حکم دیا، آپ کے فرزند اکبر ڈاکٹر محبت الحق رضوی انتظام و انصرام میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، طرح طرح کے لذیذ کھانوں، پھلوں، میوؤں اور اشیائے خورد و نوش سے دسترخوان سجایا گیا۔ اسی جہوم میں حکیم مولانا رمضان علی علیہ الرحمہ کے بڑے صاحبزادے مرغوب احمد، ڈاکٹر صاحب کو لینے آ گئے۔ مولانا مرحوم حضرت شارح بخاری کے معاصرین اور رفقا میں شمار ہوتے ہیں۔ مرغوب احمد اور ان کی لڑکی کی عالت کی خبر سن کر حضرت حد درجہ طول خاطر ہوئے۔ فوراً ڈاکٹر صاحب کو مریضہ کا معائنہ کر کے مرض کی صحیح تشخیص کے بعد ہر طرح کی سہولت بہم پہنچانے کی تاکید اور ہدایت فرمائی،

اور اپنی جیب خاص سے سو روپے نکال کر مرغوب احمد کو عنایت فرمائے، اور بعد میں ملتے رہنے کے لیے بھی آپ نے ہدایت فرمائی۔ (معارف شارح بخاری: ص ۴۳۴)

اوقات کی پابندی:

وقت ایک ایسی انمول دولت ہے جو گزرنے کے بعد کسی طرح واپس نہیں آسکتی۔ وقت کو کام میں لانا اپنی زندگی کو کارآمد بنانا ہے اور وقت کو ضائع کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ عرب کی مشہور حکیمانہ کہاوت ہے: "الوقت هو الحياة فلا تفتلوه"

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان شروع ہی سے اوقات کی حد درجہ قدر فرماتے اور ان کی بھرپور نگہداشت اور پابندی فرماتے تھے۔ ایک لمحہ بھی بیکار ضائع نہیں ہونے دیتے۔ عام علما کا تو یہ حال ہے کہ چھٹی کے ایام اور فراغت کے اوقات سیر و تفریح اور دیگر غیر مذہبی امور میں صرف کر دیتے ہیں، اور ان میں مطالعہ کتب، مذاکرہ علمی، درس تدریس اور دیگر علمی مشاغل کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں، مگر شارح بخاری علیہ الرحمۃ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا کہ اکیس برس کی عمر اور ضعف بصارت کے باوجود اگر کوئی معاون نہیں ملتا تو تنہا دارالافتاء میں بیٹھ کر ٹیبل لیمپ جلا کر خود دربین کی مدد سے باریک اور نہایت چھوٹے حروف والی کتابیں مطالعہ فرماتے آپ نے اپنے اوقات مختلف دینی و ملی، علمی و فنی اور تحریری و تصنیفی کاموں کے لیے بانٹ رکھے تھے، جن کی آپ ہر موسم میں پابندی فرماتے، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔

احساس ذمہ داری:

حضرت فقیہ اعظم ہند علیہ الرحمۃ کو اللہ تعالیٰ نے جو منصب جلیل عطا فرمایا تھا اس کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا احساس بھی خوب عطا فرمایا تھا۔ میں نے آپ کی زندگی کا جو دور دیکھا اس میں آپ ایک ممتاز ترین مفتی اور مایہ ناز مناظر کے منصب پر فائز نظر آئے۔ اس کے علاوہ منتظم، مدیر، سیاسی و سماجی سوجھ بوجھ کا مالک اور ماہر تعلیم بھی پایا۔ ان تمام صلاحیتوں کو جس خوبی کے ساتھ آپ نے استعمال فرمایا وہ قابل رشک حد تک بہتر تناسب لیے ہوئے تھا اسی سال سے زائد عمر، عارضہ قلب اور حاسدین کی

ریشہ دوانیوں کا ملال لیے یہ ضعیف العمر ذات گرامی جس قدر تعمیر امت کے کاموں میں مصروف نظر آئی، باصلاحیت جوانوں کو بھی اتنا منہمک نہ دیکھا۔

فجر کی نماز کے بعد شرح بخاری میں مصروف رہتے، آٹھ بجے دارالافتاء میں تشریف رکھتے، اور بارہ بجے دن تک چار گھنٹے مسلسل فتاویٰ املا کراتے۔ نائین کے فتاویٰ سماعت فرماتے، اصلاح کرتے، تخصص فی الفقہ کے طلبہ کی فقہی تربیت فرماتے۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد پھر دارالافتاء تشریف لاتے اور دو گھنٹے مسلسل کام کرتے، عصر کے بعد عمومی نشست ہوتی جس میں اساتذہ جامعہ کے ہجوم میں آپ صدر نشیں ہوتے، اس محفل میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، پھر نماز عشاء کے بعد سے لے کر گیارہ بجے شب تک شرح بخاری کا سلسلہ جاری رہتا۔ پھر نماز عشاء اور کھانے سے فراغت ہوتی، یہ روز کا معمول تھا، جمعرات و جمعہ کو کام کی شرح میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔

وقت کی بربادی سے بڑھ کر آپ کے نزدیک کوئی نقصان نہ تھا۔ مولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی لکھتے ہیں:

ہزاری باغ کے اجلاس میں احقر بھی ساتھ تھا، منتظم حضرات نے جس ٹرین سے واپسی کا ٹکٹ بنوایا، وہ شام کو پانچ بجے تھی، صبح کی ٹرین سے ریزرویشن نہیں ہو سکا، کوردہ علاقہ، بے علم لوگ، حضرت کڑھ کر رہ گئے، اس ملال کا کئی بار اظہار بھی فرمایا کہ سارا وقت بے کار گیا۔ (شارح بخاری نمبر، کنز الایمان دہلی: ص ۲۵۴)

شرح بخاری کا کام سب سے زیادہ رمضان شریف میں ہوتا، تراویح کے بعد نشست جمتی اور عموماً ایک بجے تک کام ہوتا رہتا۔ ذرا سوچئے! اسی سال کا بوڑھا انسان، روزہ کی مشقت خیزی، افطار اور تراویح کے بعد نو جوان حضرات بھی عموماً خود کو کسی علمی کام کے قابل نہیں پاتے، لیکن اہل سنت کا یہ بوڑھا محسن، سلف کی علمی یادگار، اتنا سارا کام کر کے بھی نہ تھکتا بلکہ خود کو اور تو انا محسوس کرتا۔ اور ”شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم“ کی پُرسکون بشارت چہرہ پر پھیل جاتی۔

ملی درد:

حضرت فقیہ اعظم ہند کی ذات میں گونا گوں علمی و فنی کمالات، اخلاقی و فکری محاسن کے ساتھ آپ کا سب سے قیمتی و شاندار وصف خلوص و للہیت اور ملت اسلامیہ کے تعلق سے درد مندی کا احساس تھا، بارہا ان کی بھیگی پلکیں افتاد امت کے ازالے کے واسطے مناجات کرتی نظر آئیں۔ ان کا درد مند دل رب العزت کے حضور سجدوں میں مچلتا دیکھا گیا، ان کے ناتواں بازو اسلامیان عالم کی مشکل کشائی میں ایسے مستعد نظر آئے، گویا جواں سالی لوٹ آئی ہو، ان کی آہوں کا درد، دل کا دھواں، احساس کی آنچ، دل کا سوز، جذبوں کی کسک، حوصلوں کی تڑپ، روح کا کرب، جسم کی توانائی، سب کی سب ملت کی فلاح و بہبود کے لیے نذر تھی، ملی درد مندی کے یہی جذبات و احساسات تھے جنہوں نے آپ کو ہمیشہ مضطرب اور آمادہ عمل رکھا۔ جامد اشرفیہ کے ہر نازک موڑ پر کام آئے۔ ہر مشکل میں دست گیری کی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے وہ لمحات مسلمانوں کے لیے کتنے صبر آزما اور کربناک تھے، جب آریس، ایس، بجرنگ دل، شیوسینا اور وشوہندو پریشد کے انتہا پسندوں، ظالم دہشت گردوں اور ہندو غنڈوں کے ہاتھوں تاریخی بابرہ مسجد شہید کر دی گئی۔ اور ہندوستانی آئین کو دن کے اجالے میں برسر عام پیروں تلے روند ڈالا گیا، ملت اسلامیہ ہند کے لیے ان نازک لمحات اور ہمت شکن اوقات میں حضرت کے تڑپتے جذبات، بھڑائے لہجے، برستی آنکھیں، لہولہان جگر، بارگاہ خالق لم یزل میں اٹھے ہوئے لرزتے ہاتھ، تھراتے لب، کانپتے اعضاء، ولدوز چیخوں میں ڈوبی دعائیں سنیں، دل کی گہرائی سے نکلتی آہیں، امت کی بے بسی اور بے کسی کو اجاگر کرتے نالے، شعور و احساس کی پنہائیوں سے بلند ہوتا ہوا درد و سوز بھی کچھ دیکھا گیا۔

۱۹۹۱ء میں خلیج کی جنگ نے اسلامیان ہند کے دلوں کو جذبات کا آتش فشاں بنا دیا تھا۔ ہر دل دھڑک رہا تھا، اور ہر آنکھ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی، زندگی کی حرارتیں سرد پڑتی جا رہی تھیں، ۷۱ جنوری کی درناک صبح جب اٹھائیس ملکوں کی سورما ٹیمیں، تنہا شیر دل عراق پر بسوں کی بارش کر رہی تھیں، تو حضرت کے جواں سال جذبات ضعیفی کے عالم میں بھی

شعلہ بداماں تھے، جذبوں کی حدت اشکوں کی صورت میں اسلامی سوز اور ملی درد کا اظہار کر رہی تھی، ہچکیوں میں ڈوبی ہوئی ان کی دعائیں آج بھی یاد آتی ہیں تو دل کا عالم زیرِ روز برہونے لگتا ہے۔ ۸ بجے صبح کو سبھی طلبہ کو دارالحدیث میں جمع ہونے کا حکم ہوا، پھر آپ نے مسنون دعائیں، استغفار اور کلمہ طیبہ ورد کرائے، اس کے بعد درد میں ڈوبی ہوئی آواز کیا بلند ہوئی کہ فضاؤں کا سکون غارت ہو گیا، دلوں کی شکیبائی چھن گئی، ہر آنکھ آنسوؤں میں ڈوب گئی، اور آہوں اور سسکیوں نے پوری فضا کو حسرت کا مزار بنا ڈالا۔

اس طرح کے نہ معلوم کتنے پردرد مواقع آپ کی زندگی میں آئے، ہر موقع پر آپ کو امت مسلمہ اور ملت بیضا کی بے بسی پر روتے بلکتے، اور سوزِ دروں کو اشکوں کی بارش سے ظاہر کرتے دیکھا گیا۔

اسلامی غیرت و حمیت:

اسلامی غیرت و حمیت اور دینی درد و کرب بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی نے اثنائے گفتگو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

إِنِّي وَاللَّهِ لَأَرَى وَجُوهًا وَّانِي لَأَرَى أَشْوَابًا مِنَ النَّاسِ خَلِيقًا أَنْ يُفِرُّوا وَيَدْعُوكَ . (صحيح البخاری ج ۱ ص ۳۷۸)

بخدا! میں آپ کے پاس ایسے چہرے اور مختلف قبائل کے ایسے افراد دیکھ رہا ہوں جو آڑے وقت پر آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عروہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

امصص بظرو اللات، انحن نفي عنده وندعه . (حوالہ سابق)

اپنے معبودات کی شرمگاہ چوس، کیا ہم حضور کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔

یہ افضل المخلوق بعد ارسل سیدنا صدیق اکبر کی دینی غیرت، اسلامی حمیت اور ایمانی جوش ہی تھا جس نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں عروہ بن مسعود کو اتنی سخت بات کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض عرب قبائل میں فتنہ ارتداد نے سر ابھارا، اور انہوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کرنے کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی سے بھی انکار کر دیا، تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر مد زکوٰۃ میں ایک رسی بھی چھوٹ جائے گی تو میں اس کے لئے بھی ان سے جہاد کروں گا۔ خلیفہ دوم سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے عرض کیا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ برحق! ان لوگوں کے ساتھ نرمی اور چشم پوشی کیجئے۔ اتنا سنا تھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جلال میں آئے، اور حضرت عمر کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

أَجْبَارُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَخَوَّارُ فِي الْإِسْلَامِ، إِنَّهُ قَدْ انْقَطَعَ الْوَحْيُ وَتَمَّ الدِّينُ، أَيْنَقُصُ وَأَنَا حَيٌّ.

اے تم! زمانہ جاہلیت میں تم بہت سخت اور بہادر تھے، کیا اسلام لا کر بزدل اور پلپلے ہو گئے، وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا، اور دین اسلام مکمل ہو چکا، کیا میرے جیتے جی اس دین میں کچھ کمی کی جاسکتی ہے؟

کیا "اینقص وانا حی" سے حضرت صدیق اکبر کا ایمانی تیور، دینی حمیت، اسلامی غیرت اور اسلامی عقائد و اعمال کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانے اور دین کی مکمل حفاظت اور نگہداشت کرنے کا جذبہ بے کراں نمایاں نہیں؟ یقیناً یہ اسی جوش ایمانی، جذبہ دروں اور غیرت دینی کی کار فرمائی تھی جو انہیں سید الانبیاء، سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ خاص سے تحفہ میں ملی تھی۔

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ گونا گوں اوصاف و کمالات کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بارگاہ صدیقی کے اس وصف خاص سے بھی بہرہ مند تھے، اور یہ ان کی کتاب زندگی کا ایک نہایت روشن اور تابناک باب تھا۔ دین اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اگر کسی بد باطن نے کسی طرح کا کوئی حملہ کیا تو تحفظ اسلام اور تحفظ ناموس رسالت کی خاطر نتائج کی پرواہ کیے بغیر آپ سینہ سپر ہو گئے، اور اس وقت انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ کتنے لوگ میرے ساتھ ہیں، اور نہ اس کی کوئی پراہ کی کہ سامنے کون ہے، آپ کی اسلامی غیرت

وحییت جوش میں آئی تو عوام کے درمیان پہنچ گئے، اور انہیں ساتھ لے کر ان کی قیادت کرتے ہوئے بلا خوف و خطر پرچم بلند کر دیا۔ وہ چاہے تقسیم ہند کے چند سال بعد الہ آباد کے ہندی اخبار ”امرت بازار پتر کار“ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ مضمون شائع ہونے پر گھوسی، اعظم گڑھ کے مسلمانوں کو لے کر اس کے خلاف احتجاج کرنے کا معاملہ ہو، یا ۱۹۵۶ء میں اتر پردیش کے گورنر کے، ایم منشی کے زیر اہتمام چھپنے والے ”ریپبلکس لیڈرس“ نامی فتنہ انگیز کتاب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید توہین کیے جانے پر بریلی شریف میں احتجاجی جلسہ و جلوس کا موقع ہو، یا قصبہ بھنگا ضلع بہرائچ میں ایک ہندو پنڈت کی شان رسالت میں زبان درازی کرنے پر وہاں کی نئی مسجد کے افتتاحی اجلاس میں اس کی زبان درازی کا جواب دینے، اسلام و پیغمبر اسلام کی حقانیت اجاگر کرنے اور ہندوؤں اور ان کے دیوتاؤں کے گندے کرتوتوں کو برملا بیان کرنے کا معاملہ ہو، جس کے نتیجے میں آپ کو جیل بھی جانا پڑا، قید و بند کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اور اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں، اور ایک طویل عرصے تک مبارکپور اعظم گڑھ سے بہرائچ کچھری جا کر پیشیوں کی مشقتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ (واقعات کی تفصیل کے لیے رئیس التحریر علامہ نسیم اختر مصباحی کی تحریر کردہ کتاب ”شارح بخاری“ کا مطالعہ کریں)

یوں ہی ہر واقف کار کو علم ہے کہ پورے ہندوستان میں جب بھی دینی اور مذہبی معاملات میں فضا گرم ہوتی، اور کوئی بھی بد مذہب انبیاء، اہل سنت و بزرگان دین کے خلاف زہر افشانی کرتا، یا عقائد و معمولات اہل سنت کے خلاف بکواس کرتا یا چیلنج مناظرہ دیتا تو آپ کو یار اے ضبط نہ رہتا، آپ سراپا اضطراب بن جاتے، اور جب تک اسے دندان شکن اور مسکت جواب نہ دے لیتے، آپ کو سکون و قرار نہ ملتا، تمام برادران اہل سنت آپ کی اس نمایاں صفت اور ممتاز ادا سے واقف تھے، اس لیے ایسے مشکل وقت اور نازک گھڑی میں سب کی نگاہیں آپ پر جا کر ٹک جاتیں، جامعہ اشرفیہ کے ایک نامور فرزند ادیب شہیر مولانا بدر القادری مصباحی، متیم حال ہالینڈ آپ کے اس وصف خاص کی ترجمانی کرتے ہوئے یوں نغمہ سنجی فرماتے ہیں:

تیرے ہوتے اہل سنت پہ کھلے کس کی زباں
فتنہ اشرار کو رو کے تو وہ دیوار ہے

رزم گاہ حق و باطل کی فضا میں ہیں گواہ
یوں مروڑا آج تک شل ہنچہ اشرار ہے
اور بد مذہبوں کی شرانگیزی اور دشمنانِ اسلام کی فتنہ پروری فرو ہو جاتی تو دوسرے
شعلہ بار، دھواں دھار تقریر کرنے والے خطبا کو بلایا جاتا۔ اس پر کبھی کبھی حضرت موصوف
طنز و مزاح کے انداز میں دیوانِ حماسہ کا یہ شعر پڑھتے۔

وَإِذَا تَكُونُ كَرِيهَةً أَدْعَىٰ لَهَا
وَإِذَا يُحَاسُّ الْحَيْسُ يُدْعَىٰ جُنْدُبٌ

جب جنگ ہوتی ہے تو مجھے بلایا جاتا ہے اور جب حیس (ایک قسم کا مخصوص کھانا)
تیار کیا جاتا ہے تو جندب کو دعوت دی جاتی ہے۔

دینی غیرت و حمیت اتنا بڑا وصف کمال ہے کہ اگر حضرت کے اندر اس کے سوا اور کوئی
فضل و کمال نہ بھی ہوتا تو یہ آپ کی معفرت اور رفع درجات کے لیے کافی تھا۔ تسکینِ قلب
کے لیے مجددِ اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی کا درج ذیل ارشاد پڑھئے، آپ
فرماتے ہیں:

امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک عالم صاحب کی وفات ہوئی، ان کو
کسی نے خواب میں دیکھا، پوچھا آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ فرمایا: جنت عطا کی گئی، نہ علم
کے سبب، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس نسبت کے سبب جو کہتے کوراخی کے
ساتھ ہوتی ہے کہ ہر وقت بھونک بھونک کر بھڑوں کو بھڑیے سے ہوشیار کرتا رہتا ہے۔
مائیں نہ مائیں یہ ان کا کام ہے، فرمایا کہ بھونکے جاؤ، بس اسی قدر نسبت کافی ہے، لاکھ
ریاضتیں، لاکھ مجاہدے اس نسبت پر قربان، جس کو یہ نسبت حاصل، اس کو کسی مجاہدے کی
ضرورت نہیں، اور اسی میں کیا ریاضت تھوڑی ہے؟ جو شخص عزت نشیں ہو گیا، نہ اس کے قلب
کو کوئی تکلیف پہنچ سکتی ہے، نہ اس کی آنکھوں کو، نہ اس کے کانوں کو۔ اس سے کہیے جس نے

او کھلی میں سردیا ہے، اور چاروں طرف سے موصل کی مار پڑ رہی ہے۔ (المسلمو ظ ج ۳ ص ۳۸)
 اگر آپ حضرت فقیہ اعظم ہند شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا سرسری جائزہ لیں
 تو محسوس کریں گے کہ زمانہ طالب علمی سے لے کر تادم آخر آپ نے دین و مذہب کے تحفظ کا
 کام کیا، اسلام اور غیر اسلام کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک کا تعاقب کیا، اولیاء اللہ
 اور بزرگان دین کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کا ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور پوری زندگی یہی
 پیغام دیتے رہے۔

میری قسمت کی قسم کھائیں سگانِ بغداد

ہند میں رہ کے بھی دیتا رہوں پہرا تیرا

اخیر میں اپنے مدعا کی تائید کے طور پر مخدوم گرامی خیر الاذکیاء صدر العلماء حضرت
 علامہ محمد احمد مصباحی دام ظلہ، صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے گرانقدر تاثر کو پیش
 کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں جو موصوف نے اپنے چند مشاہدات و تاثرات کے ضمن میں تحریر
 فرمایا ہے:

”دینی و ملی غیرت و احساس ان میں معاصرین سے زیادہ دیکھتا ہوں، جب بھی اسلام
 و سنیت، یا اکابر دین و ملت پر کوئی حملہ آور ہوتا ہے تو وہ بے تاب ہو جاتے ہیں، اور اس کے دفاع کے
 لیے اپنی ممکنہ تدبیر سے باز نہیں آتے۔“ (تقدیم شارح بخاری مولفہ مولانا یسین اختر مصباحی ص ۱۰)

اہل علم کا اعزاز و اکرام:

حضرت فقیہ اعظم ہند کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ آپ اہل علم اور ارباب فضل کا کھلے
 دل سے اعزاز و اکرام فرماتے تھے۔ جامعہ میں جو علمائے دین آپ کی خدمت میں حاضر
 ہوتے تو آپ شگفتہ روئی اور نختہ پیشانی کے ساتھ ان کا استقبال فرماتے، حسب موقع چائے
 ناشتہ، کھانا پانی کا اپنی جیب خاص سے انتظام فرماتے، خواہ وہ معاصر ہوں یا اصغر، اقران
 ہوں یا تلامذہ۔

جامعہ کے فارغین اور آپ کے تلامذہ جب نیاز مندانہ حاضر ہوتے تو آپ ان سے

بے تکلف ہو کر ملاقات کرتے، ان کی خیریت و عافیت دریافت فرماتے، حسب ضرورت مناسب مشوروں سے بہرہ مند فرماتے، ان کے قیام و طعام کا انتظام فرماتے۔

اکابرین یا نمایاں وجاہت رکھنے والے حضرات تشریف لاتے تو ان کے واسطے فرش راہ ہو جاتے، مارہرہ مطہرہ کے مشائخ و سادات میں سے کوئی تشریف لاتے تو پھر عقیدتوں کا عالم مت پوچھے، دیدہ و دل فرس راہ کر دیتے، قدم بوسی، دست بوسی میں سہقت فرماتے۔ محدث کبیر علامہ ضیاء المصطفیٰ قادری دامت برکاتہ یا عزیز ملت علامہ عبد الحفیظ دام ظلہ سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ، یا خیر الاذکیاء علامہ محمد احمد مصباحی مدظلہ تشریف لاتے تو آپ کھڑے ہو کر استقبال فرماتے، اور ان کے اعزاز میں اس وقت تک کھڑے رہتے جب تک یہ حضرات اپنی نشست گاہوں پر تشریف نہ رکھتے، یہ سب آپ کی اعلیٰ ظرفی، کشادہ قلبی اور وسعت فکر و نظر کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

خودداری اور عزت نفس:

خودداری، عزت نفس اور غیرت و حمیت آپ میں بلا کی تھی، بڑی سے بڑی پریشانی جھیل لیتے، مگر اپنی پریشانی اور تنگ دستی کا اظہار یا کسی کے سامنے حسن طیب کو بھی روا نہیں رکھتے تھے۔ ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ آپ کو دردِ گردہ کی شدید شکایت ہوئی، کرب و اذیت میں مبتلا ہوئے، کسی طرح علاج کرایا، علاج کے لیے رقم پاس نہیں تھی، ناچار اپنی وہ کتابیں فروخت کر دیں جنہیں آپ عزیز اور نہایت عزیز رکھتے تھے، فروختگی کتب کا عمل آپ کے اوپر کتنا شاق گزرا، اور دل پر پتھر رکھ کر کس طرح آپ نے یہ کتابیں فروخت کیں اس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا ہے جو کتابوں کی قدر و قیمت سے آشنا ہو۔ اس وقت آپ کے صاحبزادگان یا آپ کے عصاے پیری حضرت مولانا عبدالحق رضوی مصباحی یا اس طرح کے دیگر مقامی و غیر مقامی افراد بھی ایسی پوزیشن میں نہ تھے کہ آپ کے لیے کچھ کر سکیں، آپ کے احباب و مخلصین میں سے کوئی بندہ خدا رازداری کے ساتھ شریکِ درد و غم ہوا ہو تو نہیں معلوم۔ مگر ظاہری حال یہی تھا کہ یہ سب پریشانیوں آپ نے تنہا جھیلیں، مگر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز

کر کے یا اشارۃ و کنایۃ کسی طرح بھی تعاون کی درخواست کر کے اپنی خودداری اور عزت نفس کا سودا نہیں کیا۔

عشق رسول:

حضرت شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان کو سردر کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ تعلق اور گہرا عشق تھا، جس کے اثرات آپ کی نشست و برخاست اور زندگی کے لمحات سے اطاعت و فرماں برداری کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔ سچ ہے ع:

إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيعٌ

اور یہی وجہ تھی کہ آپ کی زبان ذکرِ محبوب و دیارِ محبوب سے ہمیشہ تر رہتی ہے: مَنْ أَحَبَّ شَيْئًا أَكْثَرَ ذِكْرَهُ (جس شخص کو کسی چیز سے محبت ہوتی ہے اس کا تذکرہ کثرت سے کرتا ہے) اور ایسا کیوں نہ ہو کہ عشقِ رسول ایک مومن کی متاعِ زندگی، سرمایہٴ حیات، اصلِ ایمان بلکہ ایمان کی بھی جان ہے۔

جان ہے عشقِ مصطفیٰ، روزِ فزوں کرے خدا

جس کو ہو درد کا مزا، نازِ دوا اٹھائے کیوں

اللہ کی سرتا بقدم شان ہیں یہ ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ
آپ کی تحویں پڑھئے، آپ کی کتابیں دیکھئے، اور آپ کے مضامین و مقالات کا
مطالعہ کیجئے تو آپ کے عشقِ رسول کی جلوہ سامانیاں قدم قدم پر دیکھنے کو نہیں گی، آپ کے سفر
نامہ حج، نزہۃ القاری شرح صحیح البخاری اور متعدد مقالات و مضامین میں اس کی دافر شہادتیں
موجود ہیں۔

بارہا کا مشاہدہ ہے کہ جب کبھی حاجیوں کا قافلہ دیارِ حبیب کا رخ کرتا اور زیارت
حریمِ طہیین کے لیے جانے والا کوئی کاروانِ شوق آپ سے ملاقات کو حاضر آتا تو آپ
کا عشق انگڑائیاں لینے لگتا، و نورِ شوق اور فرطِ جذبات سے آپ کا پیمانہ صبر جھلک پڑتا اور بے

اختیار آنکھیں اشک بار ہو جاتیں، اور دل کا عالم زیروزبر ہو جاتا، بھگی ہوئی پلکوں کے سائے سرکار کی بارگاہِ ناز میں حاضری کی سعادت کی دعا، خادمانہ سلام عقیدت پیش کرنے کی گزارش کرتے۔

۱۹۹۷ء کی بات ہے، حضرت کا دوسرا سفر حج تھا، جامعہ اشرفیہ میں عازمین حج اساتذہ و اراکین کو استقبالیہ پیش کیا جاتا ہے، حضرت کے لیے بھی استقبالیہ کی خصوصی نشست رکھی گئی، حضرت کی فرمائش پر خاص اس سفر کے واسطے جاں نثار حافظ ملت، حسان الہند جناب بیگل اتساہی نے در دوسوز میں ڈوبی ہوئی ایک نظم کہی تھی جس کا پہلا مصرع تھا۔ ع

ہے رے سگھی مجھے چندری منگائے دے، جانا ہے پی کی نگریا

مو ہے جانا ہے پی کی نگریا

عشق کے سوز میں ڈوبی ہوئی یہ نظم کیا پڑھی گئی کہ پوری فضا اشکوں میں ڈوب کے رہ گئی، یاد حبیب میں آہوں کا ایک سلسلہ تھا جو تھمنے کا نام ہی نہ لیتا، اس مستزاد کا ایک ایک بند مبر و تکیب کی دنیا پر قیامت سے کم نہ تھا۔ اس محفل شوق میں ان آنکھوں کو اشکِ محبت بہاتے دیکھا گیا جو کبھی اشکِ آلود نہ ہوتی تھیں، حضرت فقیہ اعظم کی وارثی شوق کا تو عالم ہی کچھ اور تھا، زار و قطار رورہے تھے۔ آپ کی پرسوز آہوں سے دارالحدیث کا پورا گنبد گونج رہا تھا، درہ بام پہ ایسا سکتہ طاری تھا جیسے یہ بھی غمِ ہجر کے مارے اس عاشقِ رسول کی آہوں اور سسکیوں کا ساتھ دے رہے ہوں، جامعہ اشرفیہ کے بعد گھوسی میں استقبالیہ دیا گیا، بنارس جامعہ حنفیہ غوثیہ میں خصوصی استقبال رہا۔ ہر جگہ حضرت نے یہ نظم فرمائش کر کے سنی، اور اپنی آہوں کی سوغات محبوب دو جہاں روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ کرم میں پیش کر کے عاشقی کی دستاویز پر مہر ثبت کرائی۔

سوئے اتفاق کہ اس سفر میں حضرت کو ممبئی سے لوٹنا پڑا، سعودی ایبھی نے ویزا بند کر دیا تھا، اور پانچ ہزار سے زائد عازمین حج کو اس سعادت سے محرومی ہاتھ آئی، حضرت بھی حاضری بارگاہِ عرش جاہ سے محروم رہے۔ اس محرومی کا داغ حضرت کے دل پر اتنا گہرا تھا کہ اساتذہ جامعہ آپ کی کبیدہ خاطر سے اداس ہو جاتے، بارہا مناجات میں اشک بار

ہوتے بلکہ بلکتے دیکھا گیا، مولانا افتخار صاحب اعظمی مصباحی سابق استاذ جامعہ اشرفیہ جو عرصہ دراز سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں ان کے نام جوابی مکتوب میں آپ نے لکھوایا:

”مولانا! سیدہ طیہہ طاہرہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو اس ناکارہ غلام کا خصوصی سلامِ نیاز پیش کر کے عرض کر دیں، وہ اپنے بابا جان آقائے دو جہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس ناکارہ، سیاہ کار غلام کے واسطے سفارش کر دیں کہ حضور کم سے کم ایک بار اور اس سیاہ کار کو حاضری کی اجازت مرحمت فرمادیں، جب تک حاضری نہ ہوگی، چین نہ آئے گا، اور اس محرومی کا داغ دل سے نہ جائے گا۔“

یہ جملے املا کرتے وقت آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب چکی تھیں، بالآخر آپ کے دل کی لگن پوری ہوئی، اور چند ماہ بعد ہی عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی، پھر حج کو تشریف لے گئے۔ اس طرح حج و عمرہ کی سعادت اور دیارِ رسول کی مہمانی نصیب ہوئی۔ (شارح بخاری نمبر: کنز الایمان دہلی: ص ۲۵۱)

حضرت مولانا نسیم اختر مصباحی و مولانا افتخار احمد قادری مصباحی جب زیارتِ حرمین طیبین کے لیے تشریف لے گئے، اور آپ کے پاس شرفِ حضوری کا خط لکھا، تو آپ نے انتہائی رقت انگیز، پُرسوز اور دلہانہ انداز میں جواب لکھوایا:

”حرمین طیبین کی حاضری کے موقع پر ناکارہ کو دلہانہ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ سرکار بے کس پنہا کی بارگاہ میں سلام پیش کرنے کے بعد یہ معروضہ پیش کر دیں کہ کبھی اس سگ بے ہنر کو بھی حاضری کا موقع عنایت فرمائیں، اور کیا لکھیں۔“

چلا جاتا ہوں بنتا کھلتا موجِ حوادث سے

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

(حجاز جدید دہلی: مئی، جون ۱۹۹۱ء)

مولانا ارشاد احمد رضوی بہرامی لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ احقر کو ایک فتویٰ املا کر رہے تھے، اسی دوران مولانا روم کی مثنوی کا ایک شعر لکھوایا جس کا مفہوم یہ تھا کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ

کو خرید کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے زیبا پہ نچھاور کر دیا، یہ شعر لکھواتے لکھواتے رو پڑے۔ (شارح بخاری نمبر: کنز الایمان دہلی ص ۲۵۲)

یہ سب کچھ عشق رسول ہی کی کرشمہ سازیاں تھیں جو آپ کی ذات میں شروع ہی سے پائی جاتی تھیں، بارگاہ رسالت سے عشق و شفقت اور وہابانہ تعلق خاطر ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ بیس برس کی عمر سے بعد نماز جمعہ درود رضویہ پڑھنے کے عامل تھے۔ ۱۹۹۸ء میں جامعہ اشرفیہ میں نماز جمعہ سے قبل تقریر کے دوران آپ نے درود شریف کے فضائل بیان کرتے ہوئے اس کے پڑھنے کی تاکید فرمائی، اور مذکورہ بالا حقیقت کا انکشاف فرمایا۔

تر بیت کا انوکھا انداز:

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اصلاح و تربیت کا بھی ملکہ عطا فرمایا تھا، وہ اہل تعلق پر نرمی بھی رکھتے، اور انہیں مناسب ہدایت و تنبیہ سے برابر بناتے نوارتے رہتے۔ کبھی نرمی سے سمجھاتے، کبھی سختی کو بروئے کار لاتے، کبھی ڈانٹتے پھنکارتے، کبھی شفقت کا ہاتھ پھیرتے، سختی اور نرمی کے اس امتزاج اور تربیت کے اس انوکھے انداز میں شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کی یہ نصیحت ان کے پیش نظر تھی:

دُشمنی و نرمی بہم در بہ است
چوں فاسد کہ جراح و مرہم نہ است

مولانا ارشاد احمد رضوی سہرا می لکھتے ہیں:

ہم لوگوں سے اگر فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جاتی، فتاویٰ کی ترسیل میں تاخیر ہوتی تو بہت رنجیدہ ہوتے، فرماتے: میں اور مفتی نظام الدین جب دو آدمی دارالافتاء میں تھے، تو ایک استفتا بھی باقی نہ رہتا، اور نہ ہی ضائع ہوتا، اب آپ چھ سات حضرات ہیں لیکن پھر بھی کام نہیں سمٹتا، جب کہ حضرت کا عالم یہ تھا کہ سات مفتی حضرات کے مجموعی کام سے زیادہ تنہا کام کرتے۔ جو سرعت تحریر، تجربہ اور مہارت حضرت کو میسر تھی، دوسروں کو اس کا شہہ بھی کہاں نصیب! (شارح بخاری نمبر: کنز الایمان دہلی: ص ۲۵۳)

خود راقم سطور نے بارہا دارالافتاء کے مفتیان کرام پر تاخیر جواب کے سلسلے میں

اظہار برہمی کرتے اور پھر انہیں سنجیدگی سے شفقت آمیز لہجے میں یوں سمجھاتے ہوئے سنا:
 ”ابھی آپ لوگ دوسرے کے سہارے چل رہے ہیں جب خود پر پڑے گی تو سمجھ
 میں آئے گا۔ فتویٰ بھیجنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ مان لیجئے کسی سے کلمہ کفر صادر ہوا، اس
 نے آپ کے پاس سوال بھیجا، اب آپ نے جواب دینے میں تاخیر کر دی، اسی دوران اس کا
 آخری وقت آ گیا، اب وہ کیا کرے، اسے حکم ہی نہیں معلوم! اسی حالت میں اس کا انتقال
 ہو گیا، اب بتائیے اس کا وبال کس پر ہوگا؟ اسی لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ جواب جلد از جلد
 بھیجا جائے۔ کم از کم مستفتی کو اصل حکم تو معلوم ہو جائے، تحقیق و تدقیق اور حوالوں کی کثرت کا
 کام بعد میں ہوتا رہے گا۔“

عصری نشست میں کبھی کبھی علمائے اشرفیہ کو یوں نصیحت فرماتے:

”آپ حضرات خود کو مناظرے کے واسطے تیار کریں۔ اہل سنت کے عقائد دلائل
 کے ساتھ مستحضر رکھیں، سلف کی عربی شروح حدیث کا مطالعہ کریں، عیسائیوں، آریوں،
 شیعوں، قادیانیوں، وہابیوں، مودودیوں، دیوبندیوں کے باطل افکار کا گہرائی سے احتسابی
 مطالعہ کریں، ان کا مضبوط دلیلوں کے ساتھ تنقیدی جائزہ لیں، احتسابی گوشے نوٹ کر لیں،
 حوالے میں پیش کی جانے والی کتابیں خود ذاتی طور سے خرید لیں، پھر آپ جب حملتِ حق
 کی خاطر باطل کے سامنے کھڑے ہوں گے تو مولائے کریم خود ہی ذہن کی گرہیں کھول دے
 گا، اور ایسے ایسے اچھوتے جوابی گوشے سامنے آئیں گے کہ آپ خود حیرت زدہ رہ جائیں
 گے۔ حق کی حمایت کرنے والوں کی غیب سے مدد ہوتی ہے۔ ہاں کوشش ضرور شرط ہے۔“
 (شارح بخاری نمبر: کنز الایمان دہلی ص ۲۵۴)

میرے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد کوثر خاں نعیمی صدر المدرسین جامعہ عربیہ اظہار
 العلوم، نیا بازار، جہاں گیر گنج کو تمام معمولات سلسلہ امجدیہ رضویہ، رضویہ برکاتیہ، قادریہ کی
 اجازت اور سلسلہ عالیہ رضویہ برکاتیہ کی اجازت و خلافت دیتے ہوئے یوں نصیحت فرماتے ہیں:
 ”یاد رکھیں! اسے دنیا طلبی کا ذریعہ نہ بنائیں، بلکہ خلق خدا کو راہ پر لگانے کا ذریعہ

بنائیں، مخلوق سے کوئی طمع کوئی امید نہ رکھیں، ہمارے سلسلے کی بنیاد ان تین چیزوں پر ہے: طمع مت کر، منع مت کر، جمع مت کر۔ ارادت مند بخوشی کچھ دیں اگرچہ شے حقیر ہو قبول کر لیں، مگر زرا ندوزی نہ کریں، اسے صرف کر دیں، پھر دروازہ بند نہ ہوگا۔“

محمد شریف الحق امجدی

۹ رمضان ۱۴۱۲ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۹۲ء (ایضاً: ص ۱۲)

ادیب شہیر مولانا بدر القادری مصباحی کو ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:

”روزانہ قرآن کریم کی تلاوت مع ترجمہ و تفسیر، بہار شریعت کا مطالعہ، اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی تصنیفات کا مطالعہ، پھر اپنے ذوق کی جس کتاب کا چاہیں مطالعہ کریں، مشیر دینیات کے لیے دینیات کا اسپشلسٹ ہونا لازم ہے، میری نیک دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“ (ایضاً ص ۲۰۵)

”معارف شارح بخاری“ کے لیے احقر نے بعنوان ”شارح بخاری کے شیوخ و اساتذہ“ ایک طویل مقالہ لکھا، اور جب اُسے حضرت کو سنانے لگا تو مختلف مقامات پر حذف و اضافہ کرایا، اور لفظی و معنوی اصلاح فرمائی اور ایک مقام پر مجھ سے فرمایا: رکو، دو باتیں یاد رکھنا، ان پر ہمیشہ عمل کرنا۔ (۱) جہاں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان کا نام آئے وہاں نام کے ساتھ ”مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام“ ضرور لکھنا۔ (۲) اور جہاں اپنے بزرگوں کا تذکرہ آئے تو انہیں مناسب آداب و القاب سے یاد کرنا، اور خبردار خبردار! ان سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا کہ اس سے فائدہ کی بجائے نقصان ہوگا۔

ادیب اہل سنت مولانا محمد اسلم بستوی مصباحی شیخ الحدیث انوار القرآن بلرام پور رقم طراز ہیں:

”میں نے حضرت شارح بخاری کی ذات سے بے حد استفادے کیے، میرے وہ باضابطہ استاذ نہیں، لیکن ایسے مربی تھے جو کسی استاذ سے کم نہیں ہوتا۔ میرے اوپر ان کے بیحد احسانات ہیں، ان کے بارِ قرض سے شاید میں بھر سبکدوش نہ ہو سکوں، میرے ابتدائی

تحریری کاموں کا تمام تر مرجع ”اردو ادب“ ہی رہا۔ میری نثری و نظمی تحریریں ہندوپاک کے ادبی رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر رہی تھیں، اس زمانے میں حضرت شارح بخاری نے میرے قلم کے رخ کو موڑنے کے لیے ایک موثر نصیحت فرمائی، ارشاد فرمایا: آپ کے ادبی کاموں سے صرف ”اردو ادب“ کو فروغ یا فائدہ ہو سکتا ہے لیکن ملت و مسلک کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اس لیے آپ اپنی تحریر کو ہوا کے رخ پر چلنے دینے کے بجائے مذہب و ملت کی طرف موڑ دیجئے، اس سے دو آتشہ فائدہ ہوگا۔ ہمارے مسلک کو ایک جدید قلم کار مل جائے گا، اور ”اردو ادب“ کو بھی بدستور فائدہ ہوتا رہے گا، اس لیے کہ آپ کی ساری تحریریں اردو ہی میں ہوں گی۔ بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے ”مذہبی ادب“ کے فروغ کی طرف اپنے قلم کو موڑ دیا۔ (شارح بخاری نمبر: کنز الایمان: ص ۲۵۸)

اکابر کی معتمد علیہ شخصیت:

انہی وہی اوصاف اور خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اکابر اہلسنت نے ہمیشہ آپ پر اعتماد فرمایا، اور متعدد اہم مواقع پر آپ کو مقدم رکھا، اور آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ آپ پر اتنا اعتماد فرماتے کہ رمضان شریف میں صحیح خواں حافظ نہ ملنے کی وجہ سے سورہ تراویح پڑھتے اور عشا و تراویح کے لیے آپ کو امام بناتے، اور خود آپ کی اقتدا میں نماز ادا فرماتے۔ حالانکہ دیگر علما بھی موجود ہوتے۔ (شارح بخاری: ص ۴۶، ۴۷)

حضور مفتی اعظم، حضرت مجاہد ملت، حضرت حافظ ملت، حضرت محدث اعظم پاکستان، حضرت سید العلماء، حضرت احسن العلماء، حضرت محدث اعظم ہند رحمہم اللہ نے مختلف مواقع پر بد مذہبوں کے مقابلے میں آپ کو پیش پیش رکھا اور کئی بار ازراہ کرم باصرار صدارت کی شہ نشین پر بٹھایا، کلک، اڑیسہ کے مشہور مناظرہ میں حضرت مجاہد ملت قدس سرہ نے آپ کو صدر مناظرہ مقرر فرمایا۔ جونا گڑھ، کاٹھیاواڑ کے دعوتی سفر کے موقع پر حضرت مفتی اعظم علیہ الرحمہ نے ایک شیعہ معترض کے حدیث قرطاس کو لے کر اعتراض و نکتہ چینی اور سپدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر کپچڑا چھالنے پر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے

آپ کو موقع دیا۔ (ایضاً: ص ۵۲)

بڑیل گنج ضلع گورکھپور میں حضرت محدث اعظم ہند کے نام ایک دیوبندی مولوی کا چیلنج مناظرہ آیا، جس کا جواب لکھنے کے لیے آپ نے حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ کا انتخاب فرمایا اور شارح بخاری کے مناظرانہ جواب کو سن کر حضرت محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اور دیوبندی مولوی کو سانپ سونگھ گیا۔ (ایضاً: ص ۵۵)

حافظ ملت علیہ الرحمہ کو آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر مبارک پور میں کوئی مناظرہ کے لیے کہیں سے مناظر طلب کرتا تو آپ اسے حکم دیتے کہ مفتی شریف الحق صاحب کو ضرور مدعو کرو۔ نیپال کی سرحد مدھوبنی، دریا پور، ضلع مالده (بنگال) باندوچتر ضلع پلاموں (بہار) کے مناظروں میں حافظ ملت ہی کی طلب پر آپ نے شرکت فرمائی۔ (ایضاً: ص ۶۱)

سید العلماء حضرت علامہ سید آل مصطفیٰ قادری برکاتی مارہروی آپ پر بہت اعتماد فرماتے۔ آل انڈیائی جمعیۃ العلماء کی میٹنگوں میں آپ کو صدر بناتے۔

(معارف شارح بخاری: ص ۲۵۱)

اور احسن العلماء حضرت علامہ سید حسن میاں قادری برکاتی قدس سرہ علم اور معاملات دونوں شعبوں میں آپ کو معتمد سمجھتے اور بعض اہم مسائل میں بھی آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ (ایضاً: ص ۲۵۲)

درج بالا حقائق و شواہد کی روشنی میں اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ اپنے اکابرین کے کس قدر معتمد اور منظور نظر تھے، اور ان کی رس اور حقیقت میں نگاہیں آپ کے جوہر فن کی کتنی قدر شناس تھیں۔ (وَذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ)

جامعہ اشرفیہ سے والہانہ تعلق:

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ سے آپ کو عشق و شفیقتگی اور جنون و دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جامعہ کے عروج و ارتقا کی طرف بڑھتے ہوئے ہر قدم سے شاداں و فرحاں، اور اس کے ہر نقصان و خسران سے غمزدہ و افسردہ ہو جاتے۔ وصال سے

تقریباً دو مہینہ پہلے ایک مرتبہ دوران گفتگو آپ نے اس راقم سطور سے فرمایا:

”مولانا! جامعہ اشرفیہ سے مجھے اس قدر گہرا قلبی لگاؤ صرف اس لیے ہے کہ یہ حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی علمی یادگار، علم و معرفت کا حسین مینار اور اسلام و سنیت کا مضبوط قلعہ ہے، قوم مسلم کی صلاح و فلاح کا راز اس کے عروج و ارتقا اور ترقی و بقا میں مضمر ہے۔“

اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ آپ کا مادر علمی بھی الجامعہ الاشرفیہ تھا جس کے چشمہ فیاض سے آپ نے سیرابی حاصل کی اور علمی و فنی اسلحوں سے لیس ہو کر اسلام و سنیت کے بے باک مجاہد بنے۔ پھر اپنی حیات مبارکہ کے آخری چوبیس سال یہیں کے شعبہ قضا و افتا کے صدر، مجلس شرعی کے سرپرست، ناظم تعلیمات اور مجلس شرعی کے رکن رکین کی حیثیت سے گزارے۔ اور آغوش اشرفیہ ہی میں اپنی جان جان آفریں کے حوالہ کی۔

آخر گل اپنی صرف درمیکدہ ہوئی

بچنی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بذلہ سخی:

شارح بخاری خاموش طبع، متین اور سنجیدہ طبیعت بزرگ تھے، علمی مشاغل کی وجہ سے لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم ہوتا، لیکن مخلص احباب کے جھرمٹ میں بہترین جلسیں اور شگفتہ مزاج بذلہ سخی نظر آتے، اور ایسے لطائف و ظرائف ایجاد کرتے، جو اردو ادب کے نادر نمونے ہوتے۔ اس وقت کوئی اجنبی انسان مشکل ہی سے یہ باور کرتا کہ یہی وہ بزرگ ہیں جو دارالافتاء میں وقار و تمکنت کے پہاڑ معلوم ہوتے ہیں۔

ایک بار بڑھیا ضلع بستی جلسے میں جا رہے تھے، روڈ سے بڑھیا کا راستہ خام اور دشوار گزار ہے۔ بارش کا زمانہ تھا، پھر راستے میں ایک ندی بھی پڑتی تھی، سواری کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، دعوت دینے والے نے یہ بتایا تھا کہ روڈ سے بمشکل چار فرلانگ ہو گا لیکن فاصلہ کتنا ہے وہ بہت سے لوگوں کو معلوم ہے۔ جب آپ چلتے چلتے گہرا گئے تو ساتھ والوں سے پوچھا، ارے بھائی! بڑھیا کتنی دور ہے؟ کسی نے کہا وہ دیکھئے، جتنی نظر آرہی ہے، حضرت نے بے

ساختہ فرمایا: نظر آنے کو تو آسمان کے تارے بھی نظر آرہے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ان تاروں کی نسبت قریب ہے یا دور؟ اگر آپ کے اس قسم کے جملے جمع کر لئے جائیں تو اردو ادب کے سرمایہ میں اچھا خاصا اضافہ ہو جائے۔

ترجمان اہل سنت:

مجدد اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کی ذات گرامی کتاب و سنت کی پیروی، سلف صالحین کے اتباع، عشق رسالت پناہی و محبت اولیاء اللہ، احقاق حق اور ابطال باطل سے عبارت ہے۔ آپ نے پوری زندگی مذاہب باطلہ اور افکار فاسدہ کے خلاف قلمی و لسانی جہاد فرمایا، اور توحید خداوندی و عشق نبوی کا درس دیا، انہیں اوصاف و محاسن کی بنا پر حضرت شارح بخاری کو اعلیٰ حضرت قدس سرہ سے والہانہ لگاؤ تھا، وہ اپنے آپ کو مخالفین و معاندین و اعدا و حاسدین کے تیر و نشتر کا نشانہ جانا تو گوارا کر لیتے مگر فکر رضا کے خلاف منظر عام پر آنے والے کسی چھوٹی سی چھوٹی تحریک اور مہم کو برداشت نہیں کرتے۔ اس طرح کا کوئی بھی موقع رہا ہو، دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ سب سے پہلے آپ ہی خرمن باطن پر برق تپاں بن کر گرے ہیں، اور اپنی تحریر و تقریر کے شعلوں سے اس کو خاکستر بنایا ہے۔ آپ امام احمد رضا کے مسلک عشق و عرفان کے سچے ترجمان تھے، آپ کی تقریروں کے علاوہ تحریروں میں بھی اس کے جلوے جا بجا نظر آتے ہیں، تحقیقات، فتنوں کی سر زمین کون؟ منصفانہ جائزہ، امام احمد رضا اور مسئلہ تکفیر، اذان خطبہ، تنقید بر محل، اشرف السیر اور آپ کے بے شمار فتاویٰ اسی سلسلہ الذہب کی انمول کڑیاں ہیں۔

نمایاں خصوصیات:

بقول استاذ گرامی خیر الاذکیاء حضرت علامہ محمد احمد مصباحی شیخ الجامعہ جامعہ اشرفیہ، مبارکپور آپ کی ذات درج ذیل خصائص بارزہ کی حامل ہے:

(۱) دینی و ملی غیرت و احساس میں معاصرین پر فائق تھے، جب بھی اسلام و سعادت، یا اکابر دین و ملت پر کوئی حملہ آور ہوتا ہے تو وہ بے تاب ہو جاتے ہیں، اور اس کے دفاع کے

لیے اپنی ممکنہ تدابیر سے باز نہیں آتے۔

(۲) علم میں وہ رسوخ حاصل تھا کہ جب کسی خاص موضوع پر لکھنے یا بولنے پر آتے تو بہت جلد اس کے تمام گوشوں کا احاطہ و استحضار کر کے بھرپور روشنی ڈالتے۔

(۳) فقہی جزئیات کا استحضار، حالات زمانہ پر نظر، سائلین کے فکر و مزاج سے آگاہی، بعض سائلوں کی چالاکی و عیاری سے باخبری اور دیگر لوازم سے آراستگی ایسی تھی کہ زمانہ دراز سے فتاویٰ کا برجستہ املا کراتے تھے، دیکھنے اور پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مناسب اور بر محل جواب دیا گیا ہے، جو کسی ماہر مفتی کا نتیجہ قلم ہے یا کافی غور و خوض اور محنت و تیاری کا ثمرہ۔

(۴) جماعت اور اداروں کے احوال پر بھی نظر رکھتے، اور اپنے طویل تجربات کی روشنی میں بڑی قیمتی رہنمائی اور لاجواب عقدہ کشائی سے نوازتے۔

(۵) اصلاح و تربیت کا بھی حاصل ملکہ رکھتے تھے اور اہل تعلق کو مناسب ہدایت و تنبیہ سے برابر سنوارتے رہتے تھے۔

(۶) عرصہ دراز تک تدریس، افتاء، تبلیغ و تقریر کا جو وسیع تجربہ تھا اس میں انفرادیت کے ساتھ تحریر و تصنیف، سرعت تحریر اور حسن تفہیم میں یکتاے زمانہ تھے۔ (مقدمہ شارح بخاری)

فیضان مارہرہ مطہرہ:

شارح بخاری علیہ الرحمہ پر ابتداءے شباب سے آخری وقت تک سرکار ان مارہرہ مطہرہ و مشائخ برکاتیہ کا ابر فیض و کرم برستارہا، جس سے آپ کا ظاہر و باطن نہال و شاداب ہوتا رہا۔ اس فیضان و کرم کی ابتدا اس وقت ہوئی جب کہ آپ نے مسلمانوں کے سیاسی موقف اور کانگریس و مسلم لیگ کے سلسلے میں "اشک رواں" نام کی ایک کتاب لکھ کر شائع کی جسے تاج العلماء حضرت مولانا سید اولاد رسول محمد میاں قادری برکاتی زین سجادہ خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے مطالعہ فرما کر بے حد پسند فرمایا اور پھر خود ایک خط شارح بخاری کے نام تحریر فرمایا، دعاؤں سے نوازا، اور حوصلہ افزا کلمات ارشاد فرمائے۔ اسی دوران بہار و بنگال

میں مسلم کش فسادات ہوئے، مسلمانوں کی مالی امداد کے لیے ایک وفد لے کر سید العلماء حضرت مولانا سید آل مصطفیٰ قادری برکاتی مارہروی، بہار کے مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے شہر گیا پہنچے وہیں آپ سے شارح بخاری کی پہلی ملاقات ہوئی، اور آپ نے انہیں شفقتوں، عنایتوں سے نوازا۔ پھر تقریباً آج سے چالیس برس پہلے آپ پہلی مرتبہ عرس نوری کے موقع پر مارہرہ مطہرہ حاضر ہوئے، سید العلماء واحسن العلماء حضرت سید حسن میاں کی خدمت میں پہنچ کر نیاز مندانہ ملاقات کی اور اسی موقع پر سید العلماء کے حکم پر آپ کی پہلی تقریر ہوئی جو مقبول ہوئی اور اسی موقع پر آپ کے عرض کرنے پر سید العلماء نے احسن العلماء کو حکم دیا کہ دربار میں ان کی مخصوص حاضری کراویں، تقریباً دو بجے رات میں جب آپ کی حاضری ہوئی تو آپ شاہان برکاتیہ کے روحانی فیوض و برکات سے مالا مال ہو گئے۔ اس کے بعد سے برابر عرس قائمی میں آپ وہاں حاضر ہوتے رہے، اور قل شریف سے پہلے کی تقاریر میں آخری تقریر آپ کی ہونے لگی اور یہ سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا، حضرت احسن العلماء، آپ پر خصوصی کرم فرماتے تھے اور علم و معاملات دونوں شعبوں میں آپ کو معتمد سمجھتے تھے۔ کوئی شخص آپ سے فتویٰ کے بارے میں پوچھتا تو فرماتے کہ شارح بخاری سے استفتاء کرو، اُن کا جو فتویٰ ہوگا وہی ہمارا فتویٰ ہوگا۔ خانقاہ مارہرہ مطہرہ سے آپ کا یہ روحانی رشتہ تادم وصال اسی طرح برقرار رہا۔ شہزادہ سید العلماء حضرت سید حسنین میان ^{نظمی}، و شاہزادگان احسن العلماء حضرت سید محمد امین میاں سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ، حضرت سید افضل میاں، حضرت سید اشرف میاں اور حضرت سید نجیب میاں سب سے محبت و اخلاص کا رشتہ ویسے ہی تھا جیسے ان کے بزرگوں کے ساتھ تھا، علمی و دینی معاملات میں استفادہ کی روایت بھی برقرار تھی۔

فقہ اعظم ہند کا خطاب:

شارح بخاری کے ہمہ جہت علمی کمالات و محاسن، دینی و ملی کارناموں، فقہ و افتاء میں زرورہ اختصاص تک پہنچنے اور اقران و معاصرین پر فائق ہونے کی بنا پر ہندو پاک کے علمائے دین و مفتیان شرع متین پر آپ کی سیادت و ریاست سب کے نزدیک مسلم تھی، اسی لیے بعض

اہل علم نے آپ کے لیے ”فقیہ اعظم ہند“ کے خطاب کی تجویز رکھی، ان میں سرفہرست حضرت مولانا ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی پرنسپل آرویڈک یونانی طبیہ کالج دہلی ہیں، جس کی تائید رئیس القلم علامہ ارشد القادری بانی جامعہ نظام الدین دہلی، علامہ یسین اختر مصباحی بانی دارالقلم دہلی، اور مفتی محمد میاں ثمر دہلوی جیسے سربراہ آوردہ علمائے اہل سنت نے کی، پھر عرس قاسمی ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء کے مبارک و مسعود موقع پر امین ملت حضرت ڈاکٹر سید امین میاں قادری برکاتی سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ نے قلم سے پہلے علمائے اعلیٰ و مشائخ اسلام کے خیم غفیر میں اس کا اعلان فرمایا، اعلان کے سنتے ہی ”فقیہ اعظم ہند“ ”اور شارح بخاری“ کے نعروں سے ساری فضا گونج اٹھی۔

حلیہ مبارکہ:

حضرت شارح بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قد میانہ، رنگ گندمی، پیشانی کشادہ، ناک تناسب کی حد تک بلند، داڑھی کے بال ہلکے اور سفید تھے، اکثر اوقات ٹوپی کے ساتھ عمامہ استعمال فرماتے، کرتا کلی دار سفید اور شلوار پہنتے، جو سنت کے مطابق ٹخنوں سے اوپر نصف پنڈلی کے قریب ہوتی، کرتا پر اکثر صدری اور کبھی کبھار جبہ پہنتے، رومال بھی استعمال فرماتے۔ صفائی پسند ہونے کی وجہ سے لباس صاف ستھرے ہوتے، افراط و تفریط سے دور اور اعتدال پسند تھے، تکلف، تصنع اور بناوٹ کو پسند نہیں فرماتے، چہرہ باوقار، بارعب اور نورانی اور بیاسی برس کے ہونے کے باوجود آواز نہایت بلند تھی، جلال علم و جمال باطن، پختگی عقل و ذکاوت ذہن اور استقامت قلب کے جامع تھے۔

ازواج و اولاد:

شارح بخاری کی پہلی شادی آپ کے ماموں حافظ عبدالرحمن ساکن مدن پور ضلع دیوریا کی منجھلی صاحبزادی مسماۃ زینب سے ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ جن کے بطن سے ایک فرزند محمد حبیب الحق تولد ہوئے۔ ۱۴ ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ/۲۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو آپ کی زوجہ کا اور ۱۲ شعبان ۱۳۷۶ھ/۱۵ مارچ ۱۹۵۷ء کو محمد حبیب کا انتقال ہو گیا۔ دوسرا

نکاح زوجہ اولیٰ کی وصیت کے مطابق ان کی چھوٹی بہن مسماة نور النساء بنت حافظ عبدالرحمن سے بتاریخ ۲۲ رجب ۱۳۷۹ھ / ۲۸ اپریل ۱۹۵۱ء کو ہوا، زوجہ ثانیہ سے پانچ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی کی ولادت ہوئی، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) **محمد محب الحق**: جامعہ عربیہ انوار القرآن بلرام پور سے جلالین، مشکوٰۃ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹری کا پانچ سالہ کورس بی، یو، ایم، ایم، ایس مکمل کیا۔ آج کل اپنے وطن قصبہ گھوسی مدھوین روڈ پر واقع اپنی ڈپنٹری ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے چلا رہے ہیں۔ صاحب اولاد ہیں، مفتی اعظم ہند سے شرف بیعت حاصل ہے۔ سنجیدہ و متین، خوش اخلاق و خوش اطوار مہمان نواز ہیں۔

(۲) **محمد مطیع الحق**: بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔

(۳) **محمد وحید الحق**: الجامعۃ الاشرافیہ مبارک پور سے متوسطات تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس وقت فیض العلوم محمد آباد گوبندہ ضلع منو میں مدرس ہیں۔ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

(۴) **محمد حمید الحق**: الجامعۃ الاشرافیہ مبارک پور سے فارغ عالم اور حافظ ہیں۔ چند سالوں سے زمبابوے افریقہ میں دینی و تبلیغی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بال بچے بھی ساتھ رہتے ہیں۔ صاحب سجادہ ہیں۔

(۵) **محمد ظہیر الحق**: گھریلو کاروبار میں مصروف ہیں۔ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

(۶) **طلعت فاطمہ**: قصبہ گھوسی میں ان کی شادی مولوی خورشید انور مصباحی سے ہوئی صاحب اولاد ہیں۔

مطبوع تذکرے:

درج ذیل کتابوں میں آپ کا تذکرہ و سوانح موجود ہے:

(۱) ماہنامہ حجاز جدید دہلی، بابت فروری ۱۹۹۰ء / رجب ۱۴۱۰ھ شماره ۲۔ جلد ۳۔ از

علامہ بدر القادری ہالینڈ (۲) تذکرہ علمائے اہل سنت: از مولانا محمود احمد رضوی (۳) خلفائے مفتی اعظم: از مولانا شہاب الدین بہرائچی (۴) تذکرہ خلفائے مفتی اعظم: از مولانا سلطان رضا نوری (۵) حدیث نبوی کے اردو تراجم: از مولانا محمد عاصم اعظمی (۶) سوغاتِ رضا: مطبوعہ رضا اکیڈمی: از مولانا مفتی محمد نسیم مصباحی (۷) معارف شارح بخاری، مرتبہ علامہ محمد احمد مصباحی و مولانا یسین اختر مصباحی وغیرہ (۸) شارح بخاری: از مولانا یسین اختر مصباحی۔ یہ کتاب اردو کے ساتھ انگریزی، گجراتی اور ہندی زبانوں میں بھی طبع ہو چکی ہے (۹) شارح بخاری نمبر، ماہنامہ کنز الایمان دہلی (۱۰) فقیہ اعظم ہند نمبر: ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور (۱۱) شارح بخاری نمبر، روزنامہ راشتریہ سہارا لکھنؤ (۱۲) شارح بخاری نمبر، روزنامہ آواز ملک واریسی۔

وصال:

۶/ عشر ۱۴۲۱ھ / ۱۱/ مئی ۲۰۰۰ء بروز جمعرات آپ نے الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور اعظم گڑھ میں نماز فجر اور وظائف و معمولات کی ادائیگی کے بعد دل کے دورہ پڑنے کی وجہ سے پانچ بج کر چالیس منٹ پر اچانک اس دار فانی سے دار جاودانی کی طرف کوچ کیا، اور یہ علم و فن کا راز داں اور استقامت و ثابت قدمی کا کوہِ ہمالیہ ہمیشہ کے لیے آغوشِ زمین میں محو خواب ہو گیا۔ انا لله وانا الیہ راجعون۔

کیا خبر تھی موت کا یہ حادثہ ہو جائے گا

یعنی آغوشِ زمین میں آسماں سو جائے گا

نفیس احمد مصباحی بارہ بنکوی

استاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ، یوپی

مورخہ ۵/ مئی ۱۴۲۳ھ / ۷/ فروری ۲۰۰۳ء

بروز جمعہ مبارک

(باب اول)

تفسیرات

و

تشریحات

تفسیر

شراح بخاری فقیہ عصر حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی قدس سرہ نے قرآن کریم کی تفسیر کے گراں قدر سلسلے کا بھی آغاز فرمایا تھا لیکن سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کے پہلے رکوع کی تفسیر تک ہی یہ سلسلہ قائم رہ سکا۔ اس کے بعد دوسری علمی مصروفیات خصوصاً شرح بخاری کے عزم نے اس کی تکمیل کے لیے مہلت نہ دی، ورنہ ایک عظیم شاہ کار تفسیر بھی ہمارے سامنے ہوتی۔

یہ تفسیر جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے ترجمان ماہنامہ اشرفیہ میں دسمبر ۱۹۷۸ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک کے شماروں میں قسط وار شائع ہوئی۔ اب وہی قیمتی تفسیر یکجا شکل میں آپ کے سامنے ہے۔

(مرتب)

سورہ فاتحہ کے فضائل

فضائل:

اس سورہ پاک کے فضائل بے شمار ہیں، احادیث اس باب میں کثیر ہیں، ان میں سے چند ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ حدیث قدسی ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ”فاتحہ الكتاب“ میرے عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ (روح البیان)

۲۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ قرآن کی دو تہائی کے برابر ہے۔ (روح المعانی)

۳۔ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل ایک قوم پر عذاب نازل فرمانے کو طے کر لیتا ہے، اتنے میں اس قوم کے بچوں میں سے کوئی بچہ ”الحمد لله رب العالمین“ پڑھتا ہے، اللہ عزوجل اسے سنتا ہے، تو اس کی برکت سے چالیس سال عذاب موقوف فرما دیتا ہے۔ (تفسیر کشاف)

۴۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: کیا میں تمہیں ایسی سورہ نہ بتاؤں کہ اس کے مثل نہ توریت میں کوئی سورہ ہے، نہ انجیل میں، نہ قرآن میں۔ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! ضرور بتائیے۔ فرمایا: یہ سورہ فاتحہ ہے۔ یہ سبع مثانی ہے۔ یہ قرآن عظیم ہے۔ (تفسیر کشاف)

اس حدیث میں سورہ فاتحہ کو سبع مثانی اس لیے فرمایا گیا کہ اس میں بالاتفاق سات آیتیں ہیں۔ مثانی اس لیے فرمایا کہ یہ ہر نماز میں کم از کم دو بار پڑھی جاتی ہے۔ قرآن عظیم اس لیے فرمایا کہ قرآن مجید میں جو کچھ مفصلاً ہے وہ سب اس میں مجمل ہے۔ بعض عرفانے

فرمایا: جو کچھ قرآن میں ہے وہ سب سورہ فاتحہ میں ہے۔ اور سورہ فاتحہ میں جو ہے وہ سب بسم اللہ میں ہے اور جو کچھ بسم اللہ میں ہے وہ سب اللہ کی با میں ہے اور جو کچھ با میں ہے وہ سب اس کے نقطے میں ہے۔

۵۔ اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت سعید بن معلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں مسجد اقدس میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے بلایا۔ میں حاضر نہیں ہوا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حاضر ہوا اور معذرت کی، یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں نماز پڑھ رہا تھا کہ فرمایا: کیا اللہ عزوجل نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ اور رسول کو جواب دو جب وہ بلائیں۔ اور فرمایا: کیا میں تم کو قرآن کی سب سے بڑی سورہ نہ بتاؤں؟ اس کے پہلے کہ مسجد سے باہر جاؤں۔ حضور نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ جب ہم مسجد سے چلنے لگے تو آنحضور کو ہم نے یاد دلایا کہ حضور نے وعدہ فرمایا تھا کہ تم کو قرآن مجید کی سب سے بڑی سورہ بتاؤں گا۔ فرمایا: یہ الحمد لله رب العالمین ہے۔ یہ سبع مثانی اور قرآن مجید ہے، جو مجھے دیا گیا ہے۔ (بخاری شریف)

۶۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں جبرئیل حاضر تھے۔ اچانک اپنے اوپر ایک سخت آواز سنی اور سر اقدس اوپر اٹھایا اور فرمایا: یہ آواز آسمان کے ایک دروازے کے کھلنے کی ہے جو سوائے آج کے کبھی نہیں کھلا۔ اس دروازے سے ایک فرشتہ اتر رہا ہے۔ یہ فرشتہ آج سے پہلے زمین پر کبھی نہیں اترتا۔ اس نے سلام کیا اور کہا آپ کو دو نور کی بشارت ہو جو آپ کو دیئے گئے۔ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ فاتحہ الكتاب اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں۔ ان کے کسی حرف کو جو بھی پڑھے گا وہ اسے دیا جائیگا۔ (مسلم شریف)

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: فاتحہ الكتاب میں ہر بیماری سے شفا ہے۔

۸۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر میں تھے۔ ایک جگہ ہم نے پڑاؤ کیا، وہاں ایک لونڈی آئی۔ اس نے کہا کہ ہمارے قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ ہمارے آدمی موجود نہیں، تم میں کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟

ہم میں سے ایک ایسا آدمی اٹھا جس کے بارے میں ہمارا یہ گمان نہ تھا کہ یہ جھاڑ پھونک جانتا ہے۔ اس نے جا کر اسے جھاڑا، اس نے اس شخص کو تین بکریاں دیں اور ہم سب کو دودھ پلایا۔ یہ شخص جب لوٹا تو ہم نے اس سے پوچھا کہ کیا تو جھاڑ پھونک جانتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں ام الکتاب (سورہ فاتحہ) سے جھاڑتا ہوں۔ ہم نے اس بات کا کہیں تذکرہ نہیں کیا۔ جب مدینہ طیبہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو سارا واقعہ بیان کیا۔ حضور نے فرمایا: بہت خوب وہ کیسے جانتا تھا کہ رقیہ ہے۔ ان بکریوں میں سے مجھے بھی ایک حصہ دو۔

(بخاری شریف)

خاصیت:

کسی بھی مشکل کے حل کے لیے کسی بھی دعا کی مقبولیت کے لیے سورہ فاتحہ کا یہ عمل مجرب ہے۔ صبح صادق کے طلوع ہوتے ہی فجر کی سنت پڑھ کر اکتالیس بار اس طرح سورہ فاتحہ پڑھے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے میم کے زیر کو الحمد کے لام کے جزم سے ملائے۔ بیچ سے ہمزہ وصلی (الف) گرا دے، اول آخر کم از کم تین تین بار درود شریف اس کے بعد اپنے مقصد کی دعا کرے، دعا قبول ہوگی۔ مجرب ہے۔ جتنا حضور قلب توجہ الی اللہ کرے، اسی قدر جلد حاجت برآئے گی۔ کوشش یہ کرے کہ فرض سے پہلے یہ وظیفہ پورا کر لے۔ لیکن اگر فرض کی جماعت شروع ہو جائے تو جماعت میں شریک ہو جائے، بعد میں تعداد پوری کرے۔

سورہ فاتحہ

آیات: (۷) سورۃ الفاتحہ مکیہ: رکوع: (۱) کلمات: (۱۴۰)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ فاتحہ کے متعدد نام ہیں: فاتحہ، فاتحۃ الكتاب، ام القرآن، سورۃ الكنز، سورۃ الحمد، سورۃ الدعاء، سورۃ المناجاة، سورۃ الضویض، سورۃ السؤال، سورۃ الصلوٰۃ، کافیہ، وافیہ، شافیہ، شفاء، ام الكتاب، فاتحۃ القرآن، سبع مثانی، نور، رقیہ، سورۃ التعلیم۔

اس پر اتفاق ہے کہ سورہ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ، سورہ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں۔ صحیح یہی ہے کہ بسم اللہ، سورہ فاتحہ کا جز نہیں، اور نہ کسی اور سورت کا۔ سورتوں کے مابین فصل کے لیے ہے۔

سورہ فاتحہ کے بارے میں تین قول ہیں۔ مکی ہے، مکی اور مدنی دونوں ہے۔ یعنی دو بار نازل ہوئی۔ ایک بار مکہ میں، ایک بار مدینہ میں۔ ایک قول یہ ہے کہ آدھی مکے میں نازل ہوئی، آدھی مدینہ میں۔

مکی ان سورتوں یا آیتوں کو کہتے ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں۔ مدنی ان کو کہتے ہیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں۔ اگرچہ وہ بعد ہجرت کے میں نازل ہوئی ہوں۔ جیسے آیہ کریمہ: "الْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" یہ حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات میں نازل ہوئی۔

سورہ فاتحہ میں سے نہ کوئی آیت ناسخ ہے نہ کوئی منسوخ۔

اللہ عزوجل نے اپنی عظیم کتاب بسم اللہ سے شروع فرما کر بندوں کو تعلیم دی ہے کہ اپنے ہر نیک و جائز کام بسم اللہ سے شروع کریں۔ اس لیے ہر نیک و جائز کام بسم اللہ سے

شروع کرنا مستحب ہے۔ ناجائز و حرام کام بسم اللہ سے شروع کرنا منع ہے۔

اللہ: یہ لفظ مشتق نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔ (خازن) بلکہ یہ اس ذات کا نام ہے جو معبود برحق، واجب الوجود، قدیم یعنی ازلی ابدی ہے۔ اور تمام صفات کمالیہ کی جامع ہے اور یہ نام اسی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ کسی دوسرے پر اس کا اطلاق نہ کبھی ہوا ہے اور نہ جائز ہے۔

الرحمن الرحیم: رحمن، رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں۔ دونوں صفت مشہد کے صیغے ہیں، دونوں مبالغہ کے لیے ہیں۔ مگر رحمن میں مبالغہ زیادہ ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ سب سے بڑا مہربان یعنی جو اتنا مہربان ہو کہ اتنا مہربان ہونا دوسرے کے لیے ممکن نہ ہو۔ اسی لیے رحمن کا اطلاق اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور پر جائز نہیں۔ حتیٰ کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی نہیں۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمۃ اللعالمین ہیں۔ بخلاف رحیم کے اس کا اطلاق ذات باری تعالیٰ کے علاوہ خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر قرآن مجید میں ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

وَبِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَحِيمٌ ۝ (توبہ)

اس سے ظاہر ہوا کہ اسمائے حسنیٰ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ یعنی رحمن، قدوس، صمد۔ دوسرے وہ جن کا اطلاق ذات باری تعالیٰ کے علاوہ دوسروں پر بھی صحیح ہے۔ جیسے رؤف، رحیم، علی، حی، سمیع، بصیر، علیم، حفیظ، وغیرہ اگرچہ دونوں کے اطلاق میں معانی کا بہت بڑا فرق ہے۔ اللہ عزوجل کی ہر صفت واجب، قدیم، غیر متناہی، ذاتی، غیر مخلوق ہے۔ اور مخلوق کی ہر صفت ممکن، حادث، متناہی، عطائی، مخلوق ہے۔ اللہ عزوجل رحیم ہے اس معنی کر کے اس کی صفت رحمت واجب، قدیم، غیر متناہی، ذاتی، غیر مخلوق ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحیم ہیں اس معنی کر کے آپ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صفت رحمت ممکن، حادث، متناہی، عطائی اور مخلوق ہے۔

اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ بعض کلمات کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہوتے ہیں، ان کا اطلاق اللہ عزوجل کے علاوہ دوسرے پر صحیح نہیں اگرچہ

اس کلمہ کا معنی اشتقاق لغوی دوسرے میں پایا جائے۔ جیسے یہی لفظ رحمن ہے از روے لغت اس کا معنی مہربان کے ہے، اور بلاشبہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مہربان ہیں۔ مگر آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ”رحمن“ کہنا منع ہے۔ رحیم کہتے ہیں۔ دوسری مثال عزوجل کی ہے، ان کے معنی ہیں، عزت والا، جلال والا، اس میں کسی مسلمان کو شبہہ نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عزت و جلال والے ہیں۔ خود قرآن مجید میں ہے:

وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (منافقون)

اللہ اور رسول اور مؤمنین ہی کے لیے عزت ہے۔

مگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ عزوجل کہنا منع ہے۔ اس منع کا یہ مطلب نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ساری کائنات سے زیادہ عزت و جلال والے نہیں بلکہ وہ ساری کائنات سے زیادہ عزت و جلال والے ہیں، مگر لفظ عزوجل کا استعمال چوں کہ اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہے، اس لیے اس لفظ کو نام نامی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ استعمال کرنا منع ہے۔

رحمت میں مبالغہ کا مطلب ہوتا ہے: رحمت میں زیادتی۔ یہ زیادتی باعتبار کم (مقدار) کے ہو یا باعتبار کیف کے ہو۔ رحمن میں یہ زیادتی اگر باعتبار کم (مقدار) کے مراد لی جائے تو چوں کہ دنیا میں اللہ عزوجل کی رحمت عام ہے، مومن، کافر، انسان، حیوان سب کو۔ یہ رحمت کی زیادتی مقدار میں ہوئی۔ اور آخرت میں اللہ عزوجل کی رحمت صرف مسلمین کے ساتھ خاص ہوگی۔ کافر اس سے محروم رہیں گے۔ اس لحاظ سے کہا جاتا ہے:

يا رحمن الدنيا ورحيم الآخرة۔

اور اگر رحمن میں رحمت کی زیادتی باعتبار کیف ملحوظ ہو تو یوں کہا جاتا ہے:

يا رحمن الدنيا والآخرة ورحيم الدنيا۔

اس لیے کہ دنیا کی نعمت کتنی ہی عظیم ہو آخرت کی نعمت کے مقابلے میں حقیر ہے۔ کلام کا اسلوب یہ ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے رحیم کو پہلے مذکور ہونا چاہیے تھا، اور رحمن کو بعد میں۔ مگر اللہ عزوجل نے رحمن کو پہلے ذکر کیا اور رحیم کو

بعد میں۔ اس لیے کہ رحمن اگر چہ صفت ہے مگر چونکہ یہ اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہے، اس لحاظ سے بہ منزلہ علم کے ہو گیا اور علم صفت پر مقدم ہوتا ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝ مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ۔

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہاں کا پالنے والا، سب سے بڑا

مہربان رحمت والا، یوم جزا کا مالک ہے۔

الحمد:

دو کلمے سے مرکب ہے۔ الف لام (ال) اور حمد۔ یہ مصدر ہے۔ اور الف لام جنس کا بھی ہو سکتا ہے، اور استغراق کا بھی۔ زبان سے کسی کی واقعی خوبی بیان کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ خواہ کسی نعمت کی عطا پر ہو، خواہ بغیر اس کے۔ کسی نعمت کی عطا پر نعمت دینے والے کی عظمت کو زبان یا دیگر اعضا سے ظاہر کرنا یا اس کی عظمت کا اعتقاد رکھنا شکر ہے۔ شکر کی اعلیٰ قسم یہ ہے کہ دل میں اعتقاد کے ساتھ زبان سے اظہار کیا جائے۔ حدیث میں ہے:

الْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ مَا شَكَرَ اللَّهُ مِنْ لَمٍ بِحَمْدِهِ۔

حمد بہترین شکر ہے جس نے اللہ کی حمد نہیں کی، اس نے شکر نہیں کیا۔

اس میں راز یہ ہے کہ اعتقاد کی کسی کو کیا خبر۔ اعضا کے اعمال میں اس کا احتمال ہے کہ تمسخر تو نہیں۔ مگر دل کے ساتھ زبان سے جو شکر ہوگا وہ ان دونوں سے زیادہ واضح غیر مشکوک ہوگا۔

للہ:

میں لام اختصاص کے لیے ہے۔ یعنی سب تعریف اللہ ہی کے ساتھ خاص ہے اس کے سوا کوئی ایسا نہیں جو تمام تعریف کا اہل ہو۔ اس لیے کہ حمد واقعی خوبی بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ تو جس میں جتنی خوبی ہوتی ہی بیان کرنی حمد ہوگی، اس سے زیادہ بیان کرنا جھوٹ ہوگا۔ سوائے اللہ عزوجل کے کوئی ایسا نہیں جو تمام خوبیوں سے متصف ہو۔ اس لیے اس کے سوا کوئی حمد کا اہل نہیں۔ اور چونکہ اللہ علم ہے اس ذات کا جو تمام صفات کمالیہ جملہ خوبیوں کے ساتھ متصف ہے۔ اس لیے وہ سب تعریف کا مستحق ہے۔ ذرا غور کرنے سے واضح

ہو جائے گا کہ یہ جملہ دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی۔

رب:

مصدر تربیت کے معنی میں ہے۔ کسی چیز کو رفتہ رفتہ اس کے کمال تک پہنچانے کو تربیت کہتے ہیں، جسے اردو میں پالنا کہتے ہیں۔ یہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ یعنی پالنے والا۔ عرب کے عرف میں ”رب“ بلا اضافت اللہ عزوجل کے لیے خاص ہے۔ اضافت کے ساتھ دوسرے کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جیسے قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول مذکور ہے:

إِذْ جَعَلْنَا إِلَىٰ رَبِّكَ.....فَيَسْقِي رَبُّنَا حَمْرًا

دونوں جگہ بہ معنی آقا ہے، مگر اردو میں رب یا پروردگار، اضافت کے ساتھ بھی مخلوق کے لیے نہیں بولا جاتا۔

العالمین:

عالم کی جمع ہے۔ اس پر الف لام استغراق کا ہے معنی میں ’سب‘ کے۔ عالم اصل میں علم بعلم کا اسم آلہ ہے۔ جیسے ختم ختم سے خاتم ہے۔ عالم کے معنی ہیں: جاننے کا ذریعہ۔ دنیا کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز اپنے صالح اللہ عزوجل کے جاننے کا ذریعہ ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار

ورق دفتریت معرفت کردگار

درختوں کے سبز پتے ہوش والوں کی نگاہ میں اللہ عزوجل کی معرفت کے دفتر کے ورق ہیں۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف سبز پتے ہی نہیں۔ سوکھتا بھی۔ صرف ورق ہی نہیں بلکہ کائنات کا ہر ذرہ اس کی معرفت کا دفتر ہے۔ اس معنی اشتقاق کی مناسبت سے، اللہ عزوجل کے ماسوا کو عالم کہتے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے جمع لانے کی ضرورت نہ تھی مگر چون کہ عالم کی انواع کثیر ہیں، اگر واحد ہوتا تو اس کا شائبہ تھا کہ کوئی کسی قسم کی تخصیص کا پہلو نکالتا، اس کے ازالے کے لیے الف لام استغراق کے ساتھ جمع لایا گیا تاکہ جمع عالم کے

احاطے پر نص ہو جائے، کسی طرح کسی تخصیص کا پہلو نہ نکل سکے۔

العالمین، جمع سالم ہے، اور جمع سالم پر الف لام جمع قلت کی علامت ہے۔ حالاں کہ عالم کثیر ہے۔ یہاں جمع کثرت لانی مناسب تھی۔ یہاں جمع قلت لانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عالم کتنا ہی کثیر ہو مگر اللہ عزوجل کی شان ربوبیت کے آگے قلیل ہے۔ اس لیے کہ اللہ عزوجل کی یہ صفت دیگر صفات کی طرح غیر متناہی بالفعل ہے اور عالم کتنا ہی کثیر ہو، بہر حال متناہی ہے۔ اور غیر متناہی کے سامنے متناہی کی کیا حیثیت؟ عالم کتنا ہی کثیر ہو اقل قلیل ہوگا۔

اس کلام کی خوبی یہ ہے کہ یہ اللہ عزوجل کی اعلیٰ درجے کی حمد بھی ہے، اور سننے والے کو اللہ کی حمد پر ابھارنے والا بھی، اس طرح کہ جب اللہ ہی تمام جہاں کا پالنے والا ہے اور سننے والا بھی عالم کا ایک فرد ہے۔ اپنے پالنے والے کی حمد و ستائش انسانیت کا مقتضی تو لامحالہ اس کے دل میں یہ ولولہ پیدا ہوگا کہ اللہ عزوجل کی حمد کرے۔

نیز کسی کی عیال داری میں بہت زیادہ افراد ہوں تو جو سنتا ہے، عیش عیش کرتا ہے۔ کمال ہے اتنے لوگوں کو پالتا ہے۔ اللہ عزوجل چوں کہ سارے جہاں کا پالنے والا ہے وہ بھی اس حسن و خوبی سے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے تو اس صفت کا تصور آتے ہی بے ساختہ زبان پر آئے گا۔ الحمد للہ رب العالمین۔ ایک شخص جب بہت سے لوگوں کی پرورش کرتا ہے تو ہزار شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ہمیشہ غلط ہی نہیں ہوتیں کبھی صحیح بھی ہوتی ہیں۔ ماں باپ کی شفقت اولاد پر مسلم ہے، لیکن ہزار ایسے واقعات ہیں کہ ماں باپ کا رجحان بعض اولاد کی جانب زیادہ اور بعض کی جانب کم ہوتا ہے، پھر اس رجحان کا اثر داد و دہش پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ میاں بیوی کا تعلق نسل انسانی کی بقا کا ضامن ہے مگر یہاں میاں بیوی کے کتنے لطیف حقوق کی ادائیگی سے متعلق جنم لیتے رہتے ہیں۔ بھائی بھائی کی محبت بھی ضرب المثل ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ مثل بھی:

سگ باش برادر خرد مباح

اس لیے یہاں کوئی یہ شبہ کر سکتا تھا کہ اللہ اکیلا سارے جہاں کا پالنے والا ہے تو

کہیں یہاں بھی اس قسم کی بے اعتدالی تو نہیں؟ اس لیے اس کے بعد فرمایا:

الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ:

نہیں یہاں کسی بے اعتدالی کا گذر نہیں۔ اس لیے کہ وہ رحمن سب سے بڑا مہربان بھی ہے اور رحیم رحمت والا بھی۔ کسی کو دینا کسی کو محروم کرنا، کسی کو زیادہ کسی کو کم دینا یہ رحمت و مہربانی کے منافی ہے۔ دینا سب کو ہے مگر بقدر ظرف دیتا ہے۔ اس لیے کہ داد و دہش میں ظرف کا لحاظ نہ کرنا کبھی رحمت کے بجائے ظلم بن جاتا ہے۔ ایک باپ کے دو بیٹے ہیں۔ ایک سعید، صالح۔ دوسرا شقی، شریر، جواری، شرابی۔ ظاہر ہے تقاضائے شفقت یہ ہے کہ سعید و صالح پر جتنی ہو سکے داد و دہش کی جائے۔ دوسرے کو ایک پھوٹی کوڑی نہ دی جائے۔ پہلے کو نہ دینا رحمت کے مقتضی کے خلاف۔ دوسرے کو دینا رحمت کے منافی۔ اس باریک نکلتے کا جلوہ اللہ عزوجل کی شان ربوبیت میں قدم قدم پر موجود ہے۔

مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ: یوم جزا کا مالک ہے۔

مالک اسے کہتے ہیں جو اپنی ملک میں جو چاہے جیسے چاہے، جب چاہے تصرف کرے۔ یہ تصرف بجا بھی ہو سکتا ہے اور بے جا بھی۔ مگر جو مالک عاقل و دانا ہوگا وہ اپنی ملک میں کبھی بے جا تصرف نہیں کرے گا۔ پہلے معلوم ہو چکا کہ اللہ عزوجل تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے۔ اسے لازم کہ تمام صفات غیر کمالیہ سے پاک ہو۔ خصوصاً صفات نقص سے اس لیے، وہ ظلم و لغو سے منزہ ہے، حکمت والا ہے۔ اس لیے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوگا۔ رحمن رحیم ہے، اس لیے بھی اس کا تصرف ظلم و تعدی سے پاک ہوگا۔ اب اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ عزوجل یوم جزا کا مالک ہے جو عدل و انصاف کے ساتھ بلکہ رحمت و کرم کے ساتھ اس دن لوگوں کو بدلہ دے گا۔ نہ کسی کی حق تلفی ہوگی، نہ کسی پر ظلم ہوگا، نہ کوئی مستحق محروم رہے گا۔

اللہ عزوجل آج بھی سارے جہاں کا مالک ہے۔ یوم جزا کا بھی مالک رہے گا پھر یوم جزا کی تخصیص کی کیا وجہ؟ آج یعنی اس دنیا میں بھی اگرچہ ملک حقیقی اللہ عزوجل ہی کی ہے مگر بہت سے ایسے ہیں کہ خدا کے وجود کے منکر ہیں۔ یہ خدا کی ملکیت کے کیسے قائل ہوں

گے۔ بہت سے خدائی میں شرکت کے دعوے دار ہیں اور اپنی اپنی اگرچہ مجازی، عارضی ہی ملکیت کے دعوے دار تو سبھی ہیں، مگر یوم جزا قیامت کے دن کا معاملہ ایسا ہوگا کہ ملحدین و شرکین بھی مان لیں گے کہ اس کا وجود ہے اور صرف وہی مالک ہے۔
نیز اس دن سب کی عارضی مجازی ملکیت بھی ختم ہو جائے گی۔ خالص اللہ عزوجل ہی کی ملکیت باقی رہے گی۔

لَمِنَ الْمَلَائِكَةِ الْيَوْمَ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (مومن)

اس خصوصیت کی وجہ سے یوم جزا کا مالک فرمایا۔

انسان کی پانچ قسمیں ہیں:-

اول: وہ جو ذہین، فطین، اور فراخ دل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ صاحب کمال کو اس کے کمال سے پہچان لیتے ہیں، اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔
دوم: جو انعام و اکرام کے بعد ہی کسی کے کمال کو جانتے ہیں، اور اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

سوم: وہ جو انعام و اکرام پا کر بھی اس شبہ میں گرفتار رہتے ہیں کہ شاید یہ انعام و اکرام کسی غرض کی وجہ سے ہے۔ غرض نکل جانے کے بعد بند ہو جائے گا۔ ایسے لوگوں کو اگر یہ توقع ہو کہ آئندہ بھی یہ فیضان کرم جاری رہے گا تو ممدوح کی مدح و ستائش میں لگے رہتے ہیں۔

چہارم: وہ سائل سرشت، غافل لوگ جو کسی باکمال کے کمال کو صرف کمال سے پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور صلاحیت رکھتے بھی ہیں تو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ داد و دہش بھی انہیں اعتراف کمال پر آمادہ نہیں کرتی، ان کی افتاد طبع یہ ہے کہ جب تک انہیں مار کا ڈرنہ ہو سیدھے نہیں ہوتے۔

پنجم: وہ سافل وارذل جو مار کی دھمکی سے بھی راہ راست پر نہیں آتے۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے حمد الہی پر آمادہ کرنے کے لیے اللہ عزوجل کا تصور ہی کافی ہے۔ دوسری قسم کے لوگوں کے لیے اس کی صفت ربوبیت و رحمت کا اعتقاد حمد الہی بجالانے کے لیے کافی ہے

۔ رہ گئے تین اخیر قسم کے لوگ تو ان کے لیے فرمایا گیا:

یوم جزا کا مالک ہے۔ اگر اس کی حمد کرو گے، اس کا اس دن بھی اچھا صلہ پاؤ گے، اور اگر اس کی حمد نہیں کرو گے، اس کا شکر نہیں کرو گے۔ ناشکری کی سزا پاؤ گے۔ اور جو اس پر بھی اس کا شکر گزار بندہ نہ ہو سکا۔ وہ ضرور ناشکری کی سزا پائے گا۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ:

اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

سابقہ آیتوں میں اس کا بیان تھا کہ اللہ عزوجل تمام صفات کمالیہ کا جامع ہے، اور سارے عالم کو اس دنیا میں بھی ان گنت نعمتوں کا عطا فرمانے والا ہے اور یوم جزا میں بھی مستحقین کو عطا فرمائے گا۔ تو ایسے عظمت والے کرم والے کی عظمت دل میں بھی راسخ ہونی چاہئے اور زبان کو بھی اس کی مدح میں مشغول ہونا چاہیے۔ اور جو ارجح کو بھی اس کی برتری اور علو کو اپنے افعال سے ظاہر کرنا چاہیے۔ اس لیے اب بندہ اظہار عبودیت کرتے ہوئے عرض کرتا ہے۔

اے سارے کمالات کا جامع! اور سارے جہان کا پالنے والا! سب سے بڑا مہربان، رحمت والا! اے یوم جزا کا مالک! جب تو ایسا ہے اور تیرے ان کمالات میں کوئی شریک نہیں۔ تو ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ کسی کے لیے انتہائی تذلل، فروتنی، عاجزی کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔ اس حد تک کہ اس کے آگے فروتنی کی کوئی حد نہ ہو، اس کا دار و مدار اعتقاد پر ہے، اور اگر انتہائی حد سے کچھ کم ہے تو یہ تعظیم ہے۔ اس کو یوں سمجھئے۔ سارے علما حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ بے کس پناہ کی حاضری کے آداب میں لکھتے ہیں:

يقف كما يقف في الصلوة (ہندیہ: فتح القدیر، طحطاوی)

یوں کھڑا ہو جیسے نماز میں کھڑا ہوتا ہے۔

یعنی ہاتھ باندھ کر۔ یوں ہی تمام دنیا میں دستور ہے کہ بزرگان دین کے حضور تلامذہ نیاز مند دوزانو بیٹھتے ہیں۔ مگر یہ عبادت نہیں تعظیم ہے، مگر نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا بلکہ

رکوع اور سجدے کے مابین بے ہاتھ باندھے کھڑا ہونا اور قعدہ میں دو زانو بیٹھنا عبادت ہے۔
 افعال باعتبار ظاہر کے یکساں ہیں، مگر ایک جگہ تعظیم دوسری جگہ عبادت، ایسا کیوں؟
 تذلل اور خضوع کے مختلف درجے ہیں۔ ایک درجہ وہ ہے جو چھوٹا بھائی بڑے بھائی
 کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ جو بیٹا باپ کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو ہر سعید نو عمر بوڑھے
 بزرگ کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو ہران پڑھ دیندار عالم دین کے لیے کرتا ہے۔ ایک
 وہ جو ہر مرید اپنے پیر کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو عامہ مسلمین اولیائے کرام کے لیے
 کرتے ہیں۔ ایک وہ ہے جو ہر مسلمان صحابہ کرام کے لیے کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو ہر امتی
 اپنی نبی کے لیے کرتا ہے۔ ان سب سے اوپر وہ خضوع اور تذلل ہے جو بندہ اپنے معبود کے
 لیے کرتا ہے۔ سات پہلے والے خضوع و تذلل تو ہیں مگر غایت خضوع اور تذلل نہیں۔ غایت
 خضوع اور تذلل انتہائی عاجزی و فروتنی وہ ہے جو بندہ اپنے معبود کے لیے کرتا ہے، یہی درجہ
 عبادت ہے۔

عبادت کے افعال میں سب سے زیادہ جو عبادت کے ساتھ مختص ہے وہ سجدہ ہے مگر
 سجدہ بھی مطلقاً عبادت نہیں، ورنہ ہر سجدہ عبادت ہوتا۔ اور اللہ عزوجل کے سوا کبھی کسی اور کے
 لیے سجدہ کرنا شرک ہوتا، اور کسی شریعت میں جائز نہ ہوتا۔ حالاں کہ اگلی شریعت میں سجدہ
 تعظیسی غیر خدا کے لیے نہ صرف جائز بلکہ بعض جگہ فرض تھا مثلاً فرشتوں کو جو حکم تھا کہ حضرت
 آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ اگر یہ سجدہ فرض نہ ہوتا تو سجدہ نہ کرنے اور اس سے انکار
 کرنے کی وجہ سے ابلیس کافر اور راندہ بارگاہ نہ ہوتا۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ سجدہ بھی اگر غایت خضوع و تذلل سے نہ ہو تو عبادت نہیں تعظیم
 ہے۔ اسی وجہ سے ہماری شریعت میں سجدہ عبادت غیر خدا کے لیے شرک ہے مگر سجدہ تعظیسی
 شرک نہیں حرام ہے۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ کسی فعل کے عبادت ہونے اور نہ ہونے کا دار و مدار انسان کے
 اعتقاد پر ہے اگر کوئی کام کسی کے لیے اس تصور کے ساتھ کیا جائے کہ ہم اپنے بس میں جتنی
 فروتنی جتنا تذلل رکھتے ہیں، بس اسی کے لیے ہے تو یہ کام عبادت ہوگا اور اگر تصور میں فروتنی

وتذلل کچھ کم رہا تو عبادت نہیں تعظیم ہے۔

عبادت چوں کہ غایت خضوع انتہائی تذلل کا نام ہے، اور غایت خضوع اور تذلل صرف اسی کے حضور کرنا تقاضائے عقل و خرد ہے، جو سب سے زیادہ عظمت و جبروت والا ہو، اور وہ ذات صرف اللہ عزوجل ہی کی ہے۔ اس لیے اللہ عزوجل کے سوا کسی اور کی عبادت مقتضائے عقل کے منافی ہے۔

بندے نے "ایاک نعبد" کہہ کر جب اپنی یہ حیثیت متعین کر دی کہ میں اس وقت رب العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوں، اس سے خطاب کر رہا ہوں، اور بادشاہ کی بارگاہ میں حاضری کے وقت بادشاہ کے علاوہ کسی اور سے عرض مطلب کرنا انتہائی حماقت ہے تو عرض کرتا ہے۔

ایاک نستعین ۵

اے اللہ! اس وقت جب کہ ہم تیری عبادت کر رہے ہیں، تیری بارگاہ میں حاضر ہیں، صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں، تیری بارگاہ میں حاضری کے وقت کسی اور سے کیا مانگیں۔ "ایاک نعبد" کے بعد اس کے ساتھ "ایاک نستعین" عرض کرنا قرینہ ہے کہ حالت عبادت میں جب کہ رب العالمین کی بارگاہ میں حاضری ہے اس کے سوا اور کسی سے مدد چاہنا، آداب بارگاہ کے منافی ہے۔ لہذا اس سے یہ استدلال کرنا کہ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور سے مدد طلب کرنا شرک ہے، باطل ہو گیا۔

یا یہ کہا جائے گا کہ یہ حصر، حصر اضافی ہے۔ مشرکین کے معبودان باطل کے اعتبار سے۔ کیوں کہ مشرکین اپنے معبودوں کی عبادت بھی کرتے تھے، اور ان سے مدد بھی مانگتے تھے، تو مومن موحدان کے اس غلط عقیدے پر تعریف کر تے ہوئے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کرتا ہے کہ اے اللہ ہم ان باطل معبودوں سے بے زار ہیں، ہم ان باطل معبودوں کو نہ پوجیں نہ ان سے مدد چاہیں، ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں، اور صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں، ان باطل معبودوں سے نہیں۔

ورنہ اگر حصر حقیقی مانا جائے اور اس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ اللہ عزوجل کے سوا کسی

سے مطلقاً مدد مانگنا جائز نہیں، شرک ہے۔ تو لازم آئے گا کہ تمام دنیا کے کل مسلمان مشرک ہو جائیں۔ اس لیے کہ ہر شخص زندگی میں قدم قدم پر غیروں سے مدد مانگتا ہے، لیتا ہے۔ اور اگر یہ تخصیص کی جائے عوام سے مانگنا جائز اور انبیاء و اولیا سے شرک یا زندوں سے مدد مانگنا جائز اور مزارات میں آسودگان سے شرک۔ تو یہ تخصیص بے جا ہوگی۔ اس لیے شرک میں زندہ، مردہ، نبی، امتی، ولی، عامی کی تخصیص نہیں۔ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں، شرک ہے۔

تو کیا انبیاء و اولیا کی عبادت شرک اور عوام کی ثواب ہے۔ وفات پانے والوں کی عبادت شرک اور زندوں کی طاعت۔ یہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے دین کے ساتھ عقل بھی چھین لی گئی ہو۔ اسی طرح جب پوری امت کا اس پر عملی اعتقادی، قوی، اجماع ہے کہ اپنے کاموں میں اپنے متعلقین اپنے بزرگوں سے مدد مانگنی اور یعنی جائز ہے اور یہ ایسا ک نشعین کے منافی نہیں تو انبیاء و اولیا سے بعد وصال بھی مدد مانگنا بلا کسی ادنیٰ شائبہ ممانعت کے جائز ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی قدس سرہ السامی نے احیاء العلوم میں فرمایا:

من یستمد فی حیاتہ یستمد بعد مماتہ۔

جس سے زندگی میں مدد مانگی جاسکتی ہے اس سے بعد وصال بھی مانگی جاسکتی ہے۔ اور سیدی احمد بن مرزوق مغربی قدس سرہ نے فرمایا: یہ دیار مغرب کے صف اول کے اولیا و فقہا میں ہیں:

وصال شدہ کی امداد زندہ سے زیادہ قوی ہے

اس پر شیخ ابوالعباس حضرمی نے فرمایا:

یہ بات بالکل صحیح ہے اس لیے کہ وصال یافتہ بزرگ بارگاہ حق جل مجدہ میں حاضر ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ "امحۃ اللمعات" میں یہ تینوں اقوال نقل

کر کے فرماتے ہیں کہ:

اس بارے میں بزرگان دین کے اقوال شمار سے باہر ہیں۔

یہی شیخ اسی "امحۃ اللمعات" میں اور عارف باللہ ملا عبد الرحمن جامی قدس سرہ

"نفحات الانس" میں فرماتے ہیں۔ شیخ ابوالحسن قرشی نے فرمایا:

میں ایسے چار بزرگوں کو جانتا ہوں جو اپنے اپنے مزارات میں ویسے ہی تصرف کرتے ہیں جیسے زندہ۔ شیخ معروف کرنی، شیخ عبدالقادر گیلانی (غوث اعظم)، شیخ عقیل منجی، اور شیخ حیات حرانی قدس اللہ اسرارہم۔

اس پر حضرت محدث دہلوی قدس سرہ نے فرمایا: ان چار ہی میں حصر نہیں۔ انہوں نے جو دیکھا اور پایا بیان کیا اور اگر نظر دقیق سے دیکھا جائے تو انبیاء، اولیا سے مدد مانگنا حقیقت میں اللہ عزوجل ہی سے مدد مانگنا ہے۔ اس لیے کہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام اپنے اپنے وابستگان دامن کو جو امداد کرتے ہیں، وہ اللہ کی دی ہوئی قوت اس کے عطا کردہ اختیار اور اس کے اذن سے کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد منقول ہے:

”إِنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطَّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَانْفُخْ فِيهَا فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ

اللَّهِ وَأَبْرَأُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأَخِي الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ“ (۱۳۸۳)

میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی صورت بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً پرندہ ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے۔ اور مادر زاد اندھے کو اور سفید داغ والے کو اچھا کرتا ہوں، اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے۔

اور یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ بادشاہ اپنی رعایا کے کاموں کو سرانجام دینے کے لیے جن افراد کو مقرر کرے، تو رعایا کا ان افراد سے مدد مانگنا حقیقت میں بادشاہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ اللہ عزوجل نے انبیائے کرام اور اولیائے عظام کو لوگوں کی امداد، دیکھیری، فریادری، مشکل کشائی، حاجت روائی کی قوت دی ہے یا نہیں۔ یہ بخاری شریف کی اس حدیث قدسی سے ظاہر ہے جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

مَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّىٰ أَحْبَبْتَهُ فَإِذَا أَحْبَبْتَهُ فَكُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يَبْصُرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي

بہا، (زاد الشيخ الدهلوی فی الاشعة) وفؤادہ الذی یعقل بہ ولسانہ الذی
یتکلم بہ فبی یسمع و بی یبصر و بی یبطش و بی یمشی (اشعة اللغات: ص:

۱۹۳-۱۹۴ ج ۲)

بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو اپنا محبوب
بنا لیتا ہوں۔ پھر جب اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ
سنتا ہے، اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس
سے وہ پکڑتا ہے، اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ (دوسری روایت میں اتنا
زیادہ ہے) اور اس کا دل ہو جاتا ہوں جس سے وہ جانتا ہے، اس کی زبان ہو جاتا ہوں جس
سے وہ بولتا ہے، (دوسری روایت میں یوں ہے) تو وہ مجھی سے سنتا ہے اور مجھی سے دیکھتا ہے
اور مجھی سے پکڑتا ہے اور مجھی سے چلتا ہے۔

اللہ عزوجل ہاتھ پاؤں، زبان، دل، آنکھ، کان سے منزہ ہے۔ اور کسی بندے کے
ہاتھ، پاؤں، آنکھ، زبان، دل ہونے سے اور زیادہ منزہ ہے، پھر اس حدیث کا کیا مطلب
ہے، اسے اس المفسرین امام فخر الدین رازی کے قلم حق رقم سے سنئے فرماتے ہیں:

”کذالک العبد اذا واطب علی الطاعات بلغ الی المقام الذی یقول
اللہ کنت لہ سمعا و بصرا فاذا صار نور جلال اللہ سمعا لہ سمع القریب
و البعید و اذا صار ذالک النور بصرا لہ رای القریب و البعید و اذا صار ذالک
النور یدا لہ قدر علی التصرف فی الصعب و السهل و البعید و القریب .

(تفسیر کبیر: سورہ کسوف: ج ۲۱ ص: ۹۱)

ایسے ہی جب بندہ نیکیوں پر پابندی کرتا ہے تو اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اللہ عزوجل
اس کے لیے یہ فرماتا ہے کہ میں اس کا کان اور آنکھ ہو جاتا ہوں۔ پس جب اللہ کے جلال کا
نور اس کے لیے کان ہو گیا تو وہ دور و نزدیک کی سب سنے گا اور جب یہ نور اس کی آنکھ ہو گیا تو
دور و نزدیک سب دیکھے گا، اور جب یہ نور اس کا ہاتھ ہو گیا تو سخت نرم زمین دور و نزدیک ہر
جگہ تصرف پر قادر ہو جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو محبوب بنا لیتا ہے تو اس کے کان میں یہ قوت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دور کی بھی آواز سنتا ہے اور قریب کی بھی، پست بھی اور بلند بھی۔ اور اس کی آنکھ میں یہ قوت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دور کی چیزوں کو بھی دیکھتی ہے اور نزدیک کی بھی ظاہر چیزوں کو بھی اور پوشیدہ چیزوں کو بھی۔ اور اس کے ہاتھ میں یہ قوت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ پہاڑ، میدان، خشک وتر، دور و نزدیک ہر جگہ تصرف کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کی متفقہ عقائد کی کتابوں میں تصریح ہے: ”کرامات الاولیاء حق“ اولیاء کی کرامت حق ہے۔

علامہ ابوالبرکات نسفی قدس سرہ اس کی تفصیل میں فرماتے ہیں:

”تظہر الکرامة علی طریق نقض العادة للولی من قطع المسافة البعيدة فی الملة القليلة فظهور الطعام والشراب واللباس عند الحاجة والمشي علی الماء والطيران فی الهواء وکلام الجماد والمعجماء واندفاع المتوجه من البلاء وکفاية المهم عن الاعداء .“

ولی سے ما فوق العادت کرامت ظاہر ہوتی ہے۔ لمسی مسافت تھوڑی دیر میں طے کرنا، کھانے اور پینے کی چیز اور لباس ضرورت کے وقت مل جانا، پانی پر چلنا، فضا میں اڑنا، جماد اور بے زبان کا کلام کرنا، اپنی طرف توجہ کرنے والے کی بلا دور کرنا، دشمنوں کے شر سے بچانا۔

اسی پر علامہ سعد الدین تفتازانی قدس سرہ فرماتے ہیں:

وامثال هذا اکثر من ان یحصی (شرح عقائد: ص ۱۰۷)
اس کی مثالیں ان گنت ہیں۔

الغرض! قرآن و احادیث، اقوال سلف و خلف سے یہ ثابت ہے کہ اللہ عزوجل نے انبیائے کرام تو انبیائے کرام، اولیائے عظام کو بھی یہ قدرت دی ہے کہ وہ لوگوں کی دادی و دست گیری، مشکل کشائی، حاجت روائی، فرمائیں، اس لیے انبیائے کرام و اولیائے عظام سے مدد مانگنا، حقیقت میں اللہ عزوجل ہی سے مدد مانگنا ہے۔ اس لیے انبیائے کرام اور

اولیائے عظام سے مدد مانگنا ”ایاک نستعین“ کے منافی نہیں۔

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

ہم کو سیدھا راستہ چلا۔ راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا۔ نہ ان کا جن پر غضب
ہوا، اور نہ بہکے ہوؤں کا۔

کسی سے مانگنے کا سب سے موثر طریقہ یہی ہے کہ پہلے منعم کی حمد و ستائش کی
جائے پھر اس کے ساتھ اخلاص و نیازی مندی ظاہر کی جائے۔ پھر سوال کیا جائے۔ اللہ
عز و جل نے غایت کرم سے اپنے بندوں کو یہ طریقہ تعلیم فرمایا۔ پہلے اس کی حمد کی گئی، اس
کے اوصاف کمالیہ کا ذکر کیا گیا، پھر اس کی بارگاہ میں عجز و نیاز ظاہر کیا گیا۔ اس کے بعد
سوال کیا گیا اور سوال بھی وہ کہ اس سے اہم اس سے اعظم دوسرا کوئی سوال ہی نہیں۔ سوال
میں منعم کی حیثیت کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ سوال جب اسی منعم سے ہے جو رب العالمین
سے تو اس سے معمولی سوال کم ہمتی ہے۔ اس لیے سوال میں وہ تلقین کیا گیا جو سب سے اہم
و اعظم ہے۔ منعم جب مائل بکرم ہو تو صرف اپنی ذات کے لیے سوال کم ظرفی ہوگی، اس
لیے تعلیم دی گئی کہ صرف اپنے لیے نہ مانگے بلکہ اپنے تمام رفقا کے لیے مانگے۔ اس لیے جمع
کی ضمیر ذکر کی گئی۔

ہدایت کا معنی ہے شفقت و مہربانی کے ساتھ کسی کو منزل تک پہنچانا۔ یہ منزل مختلف
ہے، معاشی، سیاسی، مذہبی وغیرہ وغیرہ۔ یہاں کسی منزل کی تخصیص نہیں کی گئی۔ یہ اشارہ
دیتے ہوئے کہ ہماری منزل کوئی بھی ہو اے اللہ! ہر منزل تک ہمیں اپنے کرم سے پہنچا۔ خواہ
وہ منزل دینی ہو خواہ دنیوی۔ معاشی ہو یا سیاسی، جسمانی ہو یا روحانی۔

پھر اسباب ہدایت چار ہیں: وجدان، حواس، عقل، وحی۔ تین اول اسباب میں قدم
قدم پر ٹھوکر کا اندیشہ ہے۔ مختلف جذبات ان تینوں کو مغلوب کر لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے
انسان بہک جاتا ہے۔ ان چاروں میں نرالی ترتیب ہے۔ وجدان غلطی کرتا ہے تو حواس اس کو
بچاتے ہیں۔ حواس غلطی کرتے ہیں تو عقل اس کی دست گیری کرتی ہے اور جب عقل ٹھوکر

کھاتی ہے تو اس کو صحیح راہ پر لگانے کے لیے وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس عرض کا ایک مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ اے اللہ! ہمارے وجدان کو اور ہمارے حواس اور ہماری عقل کو غلط روی سے بچا، اور وحی کی روشنی میں منزل مقصود تک پہنچا۔ ایک مومن جو سیدھے راستے پر گامزن ہے یہ دعا اس لیے مانگ رہا ہے کہ کہیں نفس شیطانی جذبات وغیرہ ہمیں اس سیدھے راستے سے ہٹا نہ دے۔ اس لیے اندیشے کے تحت وہ ثبات قدمی استقامت اور تادم آخر اس پر دوام کا سوال کر رہا ہے۔

علاوہ ازیں ہدایت کے درجات مختلف ہیں۔ عوام کے اور خواص کے اور سالکین کے اور واصیلین کے اور ابرار کے اور مقربین کے اور صدیقین کے اور صلحا کے اور شہدا کے اور انبیائے کرام کے اور مومن بندہ ایک درجے کے بعد دوسرے درجے پر ترقی کا سوال کر رہا ہے۔ گویا عرض کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی درجے پر ہمیں روک مت دے، اپنے کرم سے یکے بعد دیگرے درجات پر ترقی عطا فرما تا رہ۔ ”صراط الذین انعمت علیہم“ سے اس کی طرف بھی اشارہ ہے۔

صراط مستقیم: سے یا تو مراد ہر ایک نیک مقصود کا راستہ خواہ وہ کوئی ہو، یا خاص اسلام مراد ہے۔ یا قرآن مراد ہے، یا خلق نبوی مراد ہے۔ یا صحابہ کرام اور اہل بیت عظام مراد ہیں۔

بندے نے صراط مستقیم پر ثبات کی دعا مانگی، اللہ عزوجل خوب جانتا ہے کہ سیدھی راہ کیا ہے؟ بارگاہ ایزدی میں درخواست کے لیے اتنی عرضی کافی تھی۔ ”ہمیں سیدھے راستے پر چلا“ مگر قرآن مجید صرف دعا و مناجات کا مجموعہ نہیں یہ خلق خدا کی دوامی اور کامل رہنمائی کا نسخہ کیا بھی ہے۔ اس لیے صراط مستقیم کی توضیح کے لیے اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو بھی ذکر فرما دیا، تاکہ حق کے متلاشی کو دشواری نہ پیش آئے۔

صراط مستقیم کا مثبت پہلو یہ ہے کہ صراط مستقیم وہ ہے جس پر چل کر لوگ کامیاب ہو چکے ہیں۔ اور اللہ عزوجل کے انعام بے کراں سے سرفراز ہوئے ہیں۔ یہاں ان کا تذکرہ اجمال کے ساتھ ہے، مگر سورہ نساء میں ان کی تفصیل مذکور ہے۔ ”فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ

أَنعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ“ انہیں ان کا ساتھ ملے گا جس پر اللہ نے احسان کیا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہدا اور نیک لوگ۔

اب اس درخواست کا ما حاصل یہ ہوا کہ ہمیں انبیاء صدیقین شہدا صالحین کے راستے پر چلا۔ اب یہ درخواست اتنی مکمل ہو گئی کہ اس میں کہیں خلا نہیں۔ مگر سوائے ملحدین کے تمام مذہب والے اس کے مدعی ہیں کہ ہم انبیاء و صدیقین شہدا اور صالحین کے راستے پر ہیں۔ اس لیے غلط دعوی داروں کے گمان فاسد کو ختم کرنے کے لیے منفی پہلو کو بھی ذکر فرمایا کہ یہ بھی ساتھ ساتھ ذہن میں رکھو کہ جو قومیں غضب الہی کی مورد بنیں اور جو گمراہ ہو گئیں وہ راہ راست پر نہیں اس لیے یہ بھی غرض کرو کہ مورد غضب اور گمراہ قوموں کے راستے سے بچائے رکھ۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ اپنے مدلول کے لحاظ سے عام ہے۔ اور مراد ہر گمراہ قوم ہے۔ خواہ یہود ہوں خواہ نصاریٰ، اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب، مجوس ہوں یا مشرکین، دہریے ہوں یا ملحدین سب کو شامل ہے۔

مگر بہت سے مفسرین نے ”مغضوب علیہم“ سے یہود مراد لیا ہے۔ اور ضالین سے نصاریٰ اس تخصیص کا سبب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جن انبیائے کرام پر ایمان کا ادا کرتے ہیں ان کے نبی ہونے ان کے مذہب کے برحق ہونے کا اعتراف قرآن مجید میں بار بار کیا گیا ہے۔ ان کے فضائل و مناقب سے قرآن مجید مالا مال ہے۔ ان کے اوپر نازل شدہ کتابوں کی جگہ جگہ تصدیق فرمائی گئی ہے اس لیے ان دونوں کو اپنے ذاتی اعتقاد کے علاوہ قرآن مجید کے اعتراف صداقت کی وجہ سے بہت بڑا غرہ تھا کہ ہم لوگ صراط مستقیم پر ہیں، ہم انبیاء و صدیقین، شہدا و صالحین کے راستے پر ہیں حالاں کہ ان کا یہ غرہ تین وجہ سے باطل تھا۔ اول یہ کہ انہوں نے نبی کے لائے ہوئے دین کو بدل ڈالا۔ دوم یہ کہ کتاب الہی میں تحریف کر ڈالی۔ سوم یہ کہ اسلام نے سارے دین کو منسوخ کر دیا۔ ان کے اس غرہ فاسدہ پر تعریض کے لیے خصوصیت سے فرمایا گیا کہ صراط مستقیم یہود جیسے مورد غضب قوم اور نصاریٰ جیسے گمراہ قوم کا طریقہ نہیں۔

نیز اس میں حبیہ ہے کہ جو صراط مستقیم سے ہٹے گا وہ غضب الہی کا مستحق ہے اور گمراہ

ہے۔ یہود کو مغضوب علیہم فرمانا اور نصاریٰ کو ضالین سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ یہود کی حالت نصاریٰ سے بہت زیادہ بدتر ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے اس بد نصیب قوم پر اللہ عزوجل نے جتنا زیادہ احسان فرمایا ہے اگلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں مگر اس بد طینت قوم نے بجائے شکر کے جتنی ناشکری کی ہے اور جتنی سرکشی کی ہے اور جتنا تمرد کیا اور کسی قوم نے نہیں کیا۔

احکام: سورتوں کی ابتدا میں جو بسم اللہ ہے یہ قرآن مجید کا جز ہے، مگر سورہ فاتحہ یا کسی سورہ کا جز نہیں۔ اس پر دلیل یہ حدیث ہے جسے امام مسلم نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: میں نے صلوٰۃ اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھے آدھے تقسیم کر دی ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا جب بندہ ”الحمد لله رب العالمین“ کہتا ہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ (الحدیث) اس حدیث میں ”صلوٰۃ“ سے سورہ فاتحہ کا مراد ہونا متعین ہے، اور اسے شروع فرمایا ”الحمد لله“ سے تو معلوم ہوا کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جز نہیں، اور جب سورہ فاتحہ کا جز نہیں تو کسی سورہ کا جز نہیں لعدم القائل بالفصل، بسم اللہ کا نزول دوسورتوں کے مابین فصل کے لیے ہے۔ سورہ نمل میں جو بسم اللہ ہے وہ سورہ نمل کا جز ہے۔

جہری نمازوں میں بھی بسم اللہ کو آہستہ پڑھیں گے۔ سورہ فاتحہ میں بالاتفاق سات آیتیں ہیں۔ ہم احناف کے نزدیک ”انعمت علیہم“ ایک آیت ہے اور غیر المغضوب علیہم ولا الضالین الگ آیت۔

اور شوافع وغیرہ جو بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کا جز مانتے ہیں وہ بسم اللہ کو ایک آیت اور انعمت علیہم سے آخر تک کو ایک آیت کہتے ہیں۔ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، جو قصدانہ پڑھے تو نماز واجب الاعدادہ ہے اور بھول کر نہ پڑھے تو سجدہ سہو واجب۔

امام کے پیچھے مقتدی کو قرآن مجید پڑھنا مطلقاً منع ہے۔ اس کے اطلاق میں سورہ فاتحہ بھی داخل ہے۔ مقتدی کو سورہ فاتحہ کا بھی پڑھنا منع ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

إِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

جب قرآن پڑھا جائے تو اسے بغور سنو اور چپ رہو امید کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ یہ اپنے عموم کے لحاظ سے نماز وغیر نماز دونوں کو شامل ہے۔ علاوہ ازیں امام ابو داؤد و نسائی و ابن ماجہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔ جب تکبیر کہے تو تکبیر کہو اور جب وہ قراءت کرے تو چپ رہو۔

نیز صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب امام قراءت کرے تو چپ رہو۔ نیز امام محمد نے موطا میں اور امام ترمذی نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جو امام کے پیچھے ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

سورہ بقرہ

سورہ بقرہ مدنی ہے، اس میں دو سو چھیاسی یا ستاسی آیتیں، چالیس رکوع، چھ ہزار اکیس الفاظ، اور بیس ہزار حروف ہیں۔

فضائل:

امام مسلم سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنا لو۔ (کہ گھروں میں اللہ عزوجل کا ذکر نہ کرو) شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے، جس میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔

یہی امام سیدنا ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن پڑھا کرو۔ قرآن قیامت کے دن اپنی تلاوت کرنے والوں کا شفیع ہوگا۔ دو نورانی سورتیں سورہ بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو۔ یہ دونوں بادل یا چھتری بن کر یا قطار در قطار پرندوں کے جھنڈ کی طرح قیامت کے دن آئیں گی اور اپنی تلاوت کرنے والوں کی حمایت میں جھگڑا کریں گی۔ سورہ بقرہ پڑھو، یہ برکت ہے، اس کا چھوڑنا حسرت ہے، باطل پرست اس کی استطاعت نہیں پاتے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ وہ ایک رات سورہ بقرہ کی تلاوت کر رہے تھے، ان کا گھوڑا ان کے پاس ہی بندھا تھا، اچانک وہ بھڑکا، یہ چیپ ہو گئے تو گھوڑا بھی ساکن ہو گیا، دوبارہ تلاوت شروع کی تو گھوڑا پھر بھڑکا، انہوں نے تلاوت بند کر دی، تو گھوڑے نے بھی بھڑکنا بند کر دیا، اب تلاوت شروع کی تو گھوڑا پھر بھڑکا، انہوں نے اب تلاوت بند کر دی۔ ان کے بچے بھی قریب ہی سوئے ہوئے تھے یہ ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گھوڑے کے بھڑکنے سے بچے کو چوٹ لگ جائے یہ اپنے بچے کو گھوڑے سے دور کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ فضا میں

ایک چھیر ہے، جس میں چراغوں کے مثل کچھ روشن چیزیں ہیں، صبح کو خدمت اقدس میں حاضر ہو کر پورا واقعہ سنایا تو حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اسید! اسے پڑھا کرو، یہ فرشتے تھے جو تمہاری تلاوت سننے آئے تھے، اگر تم اسے پڑھتے رہتے تو صبح کو لوگ انہیں دیکھتے۔ کسی سے چھپتے نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث میں وارد ہے کہ فرمایا: ہر چیز کا ایک سنام ہوتا ہے اور قرآن کا سنام سورہ بقرہ ہے، سنام کے معنی اونٹ کے کوہان کے ہیں۔ یہاں مراد بلندی ہے۔ (صاوی)

ایک حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے پوچھا: قرآن کا کون سا حصہ افضل ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول جانیں۔ فرمایا: ”سورہ بقرہ“ پھر دریافت فرمایا کہ سورہ بقرہ کا کون سا حصہ افضل ہے۔ صحابہ نے عرض کیا اللہ و رسول جانیں۔ فرمایا: آیۃ الکرسی، خالد بن معدان نے فرمایا: سورہ بقرہ قرآن کا خیمہ ہے۔

حضرت ابن عربی نے فرمایا: سورہ بقرہ میں ۷۱ ہزار حکم اور ہزار نبی ہیں۔ ہزار خیر ہے۔ ہزار حکمتیں ہیں۔ اسے یاد کرنا برکت ہے۔ اس کا چھوڑنا حسرت ہے، باطل پرست مثلاً جادوگر اس کی استطاعت نہیں پاتے، جس گھر میں پڑھی جائے تین دن تک وہاں شیاطین داخل نہ ہوں گے۔

فوائد:

جس گھر میں جن خبیث اور جادو کا اثر ہو اس گھر میں با وضو با طہارت ایک ہفتہ سورہ بقرہ کی تلاوت کی جائے آسیب کا عمل دخل ختم ہو جائے گا۔

خلاصہ:

یہ سورہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی، مگر مصحف شریف میں ابتدا میں سورہ فاتحہ کے ساتھ حسب ارشاد ربانی رکھی گئی۔ اس لیے کہ یہ سورہ پاک دلائل و آیات کے ساتھ ساتھ کثیر اعمال و عقائد کا خزانہ ہے، مکہ معظمہ میں اسلام کے بلا واسطہ حریف صرف مشرکین تھے۔ جو

بے علم ان پڑھ وحشی خونخوار طرح طرح کے اوہام و خرافات وغیرہ انسانی افعال کے عادی تھے، وہ نہ قیامت کے قائل تھے نہ اعمال و عقائد کی جزا و سزا کے نہ کتب الہیہ پر ایمان رکھتے تھے، نہ نبوت کے قائل تھے، اس لیے مکی سورتوں میں ایسے مضامین زیادہ تھے جو براہ راست ان کی جہالت و ضلالت کی بیخ کنی کرنے والے تھے۔

مگر جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو براہ راست یہاں تصادم یہود سے ہوا۔ مدینہ طیبہ کے اصل باشندے اگرچہ انصار کرام تھے، جن کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام تھی، مگر مدینہ طیبہ پر اقتدار اصل میں یہود کا تھا، وہ ہر طرح انصار پر بالادستی رکھتے تھے، مدینہ طیبہ کی زر خیز زمین ان کے قبضے میں تھی، تجارت ان کے ہاتھ میں تھی، وہ چالاک کیا دتھے، یہود بزعم خویش نہ صرف اہل مدینہ بلکہ پوری دنیا سے اپنے کو برتر جانتے تھے، توریت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان کا بھی دعویٰ رکھتے تھے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں تشریف لانے کے بعد جب انصار مسلمان ہو گئے، اور قرب و جوار کے باشندے بھی اسلام قبول کرنے لگے، تو یہود کو صاف نظر آیا کہ اب ان کے دن گئے، اس لیے اگرچہ بظاہر انہوں نے دوستی کے معاہدے کی حامی بھری مگر در پردہ اسلام کی جڑ کاٹنے میں انہوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال پر بے اجا اعتراضات حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے طرح طرح کے سوالات، نکتہ چینی حتیٰ کہ آپ کے قتل کی کوشش، دسیسہ کاری، انصار و مہاجرین کو لڑانے کی سازش، انصار کو بھڑکانے کی ترکیب اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اپنی قوم اپنے مذہب کی فوقیت کا پروپیگنڈہ۔

یہود کے علاوہ یہودی سازش سے منافقین پیدا ہوئے، مکہ میں صرف دو فریق تھے یا تو کھلے مخالف یا کھلے مومن۔ یہاں مارا آستین وجود میں آئے۔ ان کا فتنہ بہت سنگین تھا، یہ قسمیں کھا کھا کر ایمان کا دعویٰ کرتے، نمازیں پڑھتے، جہاد میں شریک ہوتے مگر اسلام اور مسلمان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔

یہ وجوہ تھے جن کی وجہ سے عام خطاب کے بجائے یہود و منافقین بھی خاص طور سے

مخاطب بنائے گئے۔ اور مشرکین کے ساتھ یہود و منافقین پر بھی رد شروع ہوا۔ اب اس کی ضرورت شدید تھی کہ اسلام کے عقائد و اعمال کی تفصیل کے ساتھ ساتھ ان کی خوبیاں بیان کی جائیں، دلائل و براہین پیش کیے جائیں تاکہ چالاک کیا دحریف کی ترکیب کار گرنے ہو۔

اس لیے اس سورہ میں قرآن کے کتاب الہی ہونے اور پیغمبر اسلام کے رسول اللہ ہونے، وجود باری، توحید باری، اس کے صفات کمالیہ کے اثبات، قیامت، جنت و دوزخ، جزا سزا، بعث بعد الموت پر دلائل و براہین ذکر کیے گئے۔

اور علاوہ عبادت کے بہت سے معاملات کے قوانین نازل ہوئے، اور جب اسلام کے قدیم حریف کفار مکہ نے بزور شمشیر، اسلام کو مٹانا چاہا تو جہد البقا کے بطور دفاع کی اجازت دی گئی اور جنگ و صلح کے حکا بیان ہوئے۔

الغافل یہ سورہ پاک اسلام کے اصول و فروع کے کثیر حصہ پر حاوی ہے۔ اس لیے خالد بن معدان نے فرمایا کہ سورہ بقرہ قرآن کا خیمہ ہے، جیسے ایک خیمے میں صاحب خیمہ کی ضروریات کی اشیا موجود ہوتی ہیں، اسی طرح ایک صاحب بصیرت کو صاف نظر آئے گا کہ سورہ بقرہ میں اس کے عقائد و اعمال کی درستگی اور نکھارنے کے لیے بہت کچھ مذکور ہے۔

الْم:

چند سورتوں کے شروع میں حروف تہجی مفرد یا مرکب مذکور ہیں، جیسے الھم، الر، ہم، ص، ن وغیرہ۔ ان کو مقطعات قرآنیہ کہتے ہیں۔ یہ تشابہات میں سے ہیں۔ قرآن مجید کی اپنے معانی پر دلالت کے واضح اور خفی ہونے کے اعتبار سے دو قسمیں ہیں۔ محکم اور متشابہ۔

محکم: وہ ہے جس کی دلالت اس کے معنی پر واضح ہو۔

متشابہ: وہ ہے جس کی دلالت اس کے معنی پر واضح نہ ہو (جلالین)

متشابہ کے بارے میں تین مذاہب ہیں: اسلم، احکم، زائغ۔

اسلم: یہ ہے کہ اس کا علم اللہ عزوجل کے حوالے کیا جائے اور کوئی تاویل نہ کی

جائے۔

احکم: یہ ہے کہ اس کی تاویل کی جائے مگر ایسی تاویل نہ کی جائے جو محکمات کے

معارض ہو۔

زائغ: وہ لوگ ہیں جو ایسی تاویل کرتے ہیں جو محکمات کے معارض ہے۔
زائغین کا مذہب ناقابل اعتبار ہے، رہ گئے اسلم اور احکم ان دونوں کی تائید صحابہ
وسلف سے ملتی ہے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہر کتاب میں کچھ راز ہیں۔ اور اللہ
عزوجل کا راز قرآن میں اوائل سورہ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ہر کتاب کی کچھ منتخب باتیں ہیں، اور اس
کتاب قرآن کی منتخب بات، حروف تہجی (مقطعات) ہیں۔ (خازن)
ان دونوں ارشادات سے مذہب اسلم اختیار کرنے والے حضرات دلیل لاتے ہیں
مگر خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا:

یا کھيحص يا حم عسق (بيضاوی)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مقطعات اللہ عزوجل کے اسماء ہیں۔ اور یہ ایک تاویل
ہے، اس لیے اس سے مذہب احکم کی تائید ہوتی ہے۔

اب تاویل کرنے والوں کے اس بارے میں کثیر اقوال ہیں:

۱۔ یہ حروف تہجی کے اسماء ہیں۔

۲۔ قرآن کے اسماء ہیں۔

۳۔ یہ سورتوں کے اسماء ہیں۔

۴۔ ہر حرف اللہ عزوجل کے کسی اسم کا رمز ہے۔ مثلاً الف: اسم جلالت اللہ کا، لام:

لطیف کا۔ میم مجید کا۔

۵۔ یہ حروف اللہ عزوجل کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہیں۔ مثلاً الف: الاء اللہ

(اللہ کے انعام) کی جانب، لام: اللہ عزوجل کے لطف کی جانب، میم: اللہ عزوجل کے

ملک کی جانب۔

۶۔ یہ اشارے ہیں فرشتوں کے اسماء کی جانب۔

۷۔ یہ اشارے ہیں کسی نبی کے نام کی جانب۔

۸۔ الف سے اللہ کی جانب، لام سے جبرئیل کی جانب، میم سے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب اشارہ ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر اتری ہے۔ (صاوی، روح البیان وغیرہ)

۹۔ سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: الف میں چھ ایسی صفت ہیں جو اللہ عزوجل کی چھ صفات کے مماثل ہیں۔

۱۔ ابتدا: اللہ عزوجل اول ہے۔

۲۔ سیدھا ہونا: اللہ عزوجل عادل ہے، جو ظلم نہیں کرتا۔

۳۔ انفرادیت: اللہ عزوجل فرد واحد ہے۔

۴۔ کسی حرف کے ساتھ نہ ملنا: اللہ عزوجل تمام موجودات سے منفرد ہے۔

۵۔ سب حروف الف کے محتاج ہیں۔ مگر الف کسی کا محتاج نہیں: اللہ عزوجل غنی مطلق ہے، اور ساری خلق اس کی محتاج۔

۶۔ الف کے معنی الفت کے ہیں: اللہ عزوجل ہی اس لائق ہے کہ اس سے الفت کی جائے۔ (روح المعانی)

۱۰۔ الف کا مخرج حلق کا اندرونی ابتدائی حصہ اور لام کا مخرج وسط زبان اور میم کا مخرج دونوں ہونٹ ہیں۔ حروف کے مخارج کی ابتدا اندر ن حلق اور انتہا ہونٹ ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت ذکر الہی میں مصروف رہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے 'ہم' عسقی سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنے محاربے کا استخراج فرمایا۔

ابوالحکم عبدالسلام بن برجان نے اپنی تفسیر میں "الم، فطبت الروم" سے اس وقت جب کہ نصاریٰ کا بیت المقدس پر قبضہ تھا۔ اس کے فتح کی تاریخ ۵۸۳ھ کا استخراج کیا۔ سید الکاشفین سیدنا محی الدین ابن عربی قدس سرہ نے بھی فتوحات میں اسی حصے سے اور ایک اور طریقے سے فتح بیت المقدس کی تاریخ کا استخراج فرمایا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حضور

اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مقطعات کا علم ہے ورنہ خطاب لغو ہوگا۔

اس پر دلیل یہ حدیث ہے کہ جبرئیل امین جب سورہ مریم لے کر حاضر ہوئے اور پڑھا: کاف، تو حضور نے فرمایا: میں نے جان لیا۔ پھر جب پڑھا: **هـ**، تو فرمایا: میں نے جان لیا۔ جب پڑھا: **يـ**، تو فرمایا: میں نے جان لیا۔ جب پڑھا: **عـ**، تو فرمایا: میں نے جان لیا۔ پھر جب پڑھا: **صـ**، تو فرمایا: میں نے جان لیا۔ جبرئیل نے متحیر ہو کر عرض کیا: آپ نے کیسے جان لیا؟ میں نے تو نہیں جانا۔ (روح البیان، بیضاوی، روح المعانی)

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو سید الانبیاء ہیں۔ حضور کی امت کے اولیائے کرام ان کے معانی جانتے ہیں۔ (روح المعانی)

فائدہ:

یہ حروف اس کی دلیل ہیں کہ قرآن مجید حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں۔ اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دنیا میں کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا۔ اور جس نے پڑھنا لکھنا نہ سیکھا ہو وہ اپنی فطری صلاحیت سے فصیح کلام بول سکتا ہے مگر کسی کلمے کی جچے نہیں کر سکتا۔ نہ یہ بتا سکتا ہے کہ اس کلمے میں کون کون حروف تہجی ہیں۔ بلکہ وہ سرے سے ان حروف تہجی کو جانے گا ہی نہیں۔ مگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس کلام کے بارے میں دعویٰ فرمایا کہ اللہ عزوجل کا کلام ہے اس میں نہایت مرصع حسن ترتیب کے ساتھ حروف تہجی موجود ہیں۔ تو ماننا پڑے گا کہ یہ کلام حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے، حقیقت میں اللہ عزوجل ہی کا ہے۔

مشرکین قرآن مجید کی تلاوت کے وقت شور مچاتے کہ نہ خود قرآن مجید سنیں نہ دوسروں کو سننے دیں۔ جب یہ مقطعات نازل ہوئے اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی تلاوت کی تو وہ یہ عجیب و غریب کلمہ سن کر متحیر ہو جاتے کہ آخر اس کے معنی کیا ہوں گے۔ اور اس سوچ میں خاموش ہو جاتے۔

لطیفہ:

جب الم نازل ہوا تو یہودیوں نے کہا کہ الف کے ایک عدد لام کے تیس، میم کے

چالیس۔ کل میزان اکہتر ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت اکہتر سال باقی رہے گی، ہم اس امت میں شامل ہو کر کیا کریں۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا تو یہودیوں نے کہا اس کے علاوہ اور کچھ ہے تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے المص تلاوت فرمایا، تو یہودیوں نے کہا یہ اس سے زیادہ ہے، ایک سو اکٹھ۔ اب انہوں نے پوچھا اس کے علاوہ اور کچھ ہے، تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے المر کی تلاوت کی، اس کے عدد دو سو اکہتر ہیں تو وہ جاہل مبہوت ہو کر بولے کہ آپ نے ہم پر خلط ملط کر دیا۔ ہم کس کو لیں۔ (تفسیر زاہدی)

تناسب:

اس کے قبل سورہ فاتحہ تھی جو محکم ہے، اس کے معانی اس کے کلمات سب پر واضح ہیں۔ سورہ بقرہ کی ابتدا مقطعات سے کی، جس کے معانی ہم کو معلوم نہیں۔ یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی دونوں قسموں کی جانب کہ اس کا کچھ حصہ محکم ہے، جس کے معانی واضح ہیں، اور کچھ حصہ متشابہ ہے، جن کے معانی معلوم نہیں۔ تاکہ ابتدا ہی سے قاری دونوں قسموں پر مطلع ہو کر ہوشیار رہے۔ قرآن مجید میں ہر جگہ معانی معلوم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ محکمات میں حتی المقدور غور و فکر، تلاش و جستجو کرے اور متشابہات کا علم اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سپرد کرے۔

خواص:

مقطعات قرآنیہ کے بے شمار خواص ہیں، جو شخص تمام مقطعات کا اپنے نام کے عدد دو بار روزانہ طلوع فجر کے وقت پڑھنے پر مداومت کرے وہ عزیز خلاق ہو، اس کا سب پر رعب ہو، ہمیشہ ہر کام میں مظفر و منصور رہے، کبھی رزق کی تنگی نہ ہو، ان کا مجموعہ یہ ہے۔

الم، المص، الر، المر، کھیمص، طہ، طسم، طس، یس، ص،

حم، حم، عسق، ق، ن۔

اور اگر الم و حم کو چھ بار اور المر کو پانچ بار طسم دو بار پڑھے تو

تا شیر زیادہ ہوگی۔

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۝ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ
وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

ترجمہ: اس عظیم الشان کتاب میں کوئی شک نہیں۔ اللہ کا خوف رکھنے والوں کے لیے
ہدایت ہے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کو کما حقہ ادا کرتے ہیں اور ہماری دی ہوئی
چیزوں سے خرچ کرتے ہیں۔

مناسبت:

سورہ فاتحہ میں بندوں نے اللہ عزوجل سے دعا کی تھی کہ ہم کو صراط مستقیم پر چلا۔ اب
اللہ عزوجل کی طرف سے بندے کو مشرودہ دیا جاتا ہے۔ اے بندے! تجھے صراط مستقیم پر ثابت
رکھنے کے لیے یہ عظیم الشان کتاب ہم نے اتاری ہے جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، اور
ہمارا خوف رکھنے والوں کے لیے مطلوب تک پہنچانے کی کفیل ہے۔ گویا یہ ارشاد بندے کی
سابقہ دعاؤں کی مقبولیت کی نوید ہے۔

ذَلِكَ کا معنی وہ ہے، جو دور کے اشارے کے لیے آتا ہے۔ یہ ارشاد
کتاب کا جز ہے۔ اور چوں کہ کتاب قریب تر ہے، اس لیے بجائے ”ذَلِكَ“ کے ”هَذَا“
آنا پابنہ تھا، جس کا معنی ”یہ“ ہے۔ کتاب کی عظمت شان ظاہر کرنے کے لیے ذَلِك کا لفظ
استعمال فرمایا۔

”اس میں کوئی شک نہیں“ کا محمل دو ہے۔ ایک یہ کہ اس کے ارشادات
کا حرف حرف حق ہے۔ کہیں کوئی غلط بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس بارے میں کوئی شک نہیں
کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس معنی کو پہلا معنی لازم ہے۔ اس لیے کہ جب یہ یقینی طور پر اللہ کی
کتاب ہے اور اللہ عزوجل صادق القول ہے تو اس کے ارشادات حق ہیں، جن میں کسی غلطی
کا امکان نہیں۔ اس لیے اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

اور جو لوگ کسی طرح کا شک کرتے ہیں، وہ یا تو اپنے دل کی بیماری کی وجہ سے شک
کرتے ہیں یا جہالت و سفاہت کی بنا پر ورنہ اس کے کتاب الہی ہونے کے دلائل اتنے ٹھوس

و ناقابل انکار ہیں کہ جو بھی ذی عقل انصاف پسندان کو بغور دیکھے گا تو اسے کوئی چارہ کار نہیں سوائے اس کے کہ مان لے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔

اور یہی حال اس کے مضامین کا ہے کہ ہر ہر ارشاد کی صداقت کے دلائل اتنے قوی ہیں کہ ان کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

اللہ کا خوف رکھنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

ہدایت کے دو معنی ہیں۔ ایک راستہ دکھانا، دوسرے مطلوب تک پہنچانا۔ یہاں دوسرا معنی متعین ہے۔ اس لیے کہ ہدایت کو متقیوں کے لیے خاص فرمایا اور مطلوب تک پہنچانا ان متقیوں ہی کے لیے خاص ہے۔ جن کے اوصاف ان آیات میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ لوگ مطلوب تک رسائی نہیں حاصل کر سکتے۔ لہذا قرآن، ہدایت بمعنی ایصال الی المطلوب متقیوں کے علاوہ دوسرے افراد کے لیے نہیں۔ اس بنا پر تخصیص ہوئی کہ یہ کتاب اللہ کا خوف رکھنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔ یعنی انہیں ان کے مطلوب حقیقی تک پہنچانے والی ہے۔ ہدایت کے مفعول ثانی کا ترک عموم پر دلالت کرتا ہے کہ یہ متقیوں کو ان کے ہر مطلوب تک پہنچانے والی ہے۔ خواہ وہ مطلوب دینی ہو یا دنیوی، جسمانی ہو یا روحانی، مذہبی ہو یا معاشی، سیاسی ہو یا سماجی۔

تقویٰ کے معنی ڈرنے کے ہیں۔ اور ڈرنے کے لیے لازم ہے کہ جس سے ڈر ہو اس کی فرماں برداری کی جائے۔ یہاں اللہ عزوجل سے ڈرنے والے مراد ہیں۔ تو حاصل یہ ہوا کہ متقی وہ ہے جو اللہ عزوجل کا تابع فرمان ہو۔ فرماں برداری یہ ہے کہ جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے انہیں کرے اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان سے دور رہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے فرمایا: تقویٰ کے سات درجے ہیں:

۱۔ کفر سے بچنا

۲۔ بد مذہبی سے بچنا

۳۔ ہر گناہ کبیرہ سے بچنا

۴۔ ہر گناہ صغیرہ سے بچنا

۵۔ شہات سے بچنا

۶۔ شہوات سے بچنا

۷۔ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی اور کی طرف توجہ سے بچنا

ان میں ہر بعد والا درجہ پہلے والے سے اعلیٰ ہے۔ اور ساتواں انحص خاص کے ساتھ خاص ہے۔ تیسری اور چوتھی آیتوں میں ان متقیوں کی کچھ علامتیں بیان کی گئی ہیں۔

پہلی علامت:

غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ غیب کے معنی لغت میں غائب شدہ چیز کے ہیں، اور یہاں مراد وہ چیزیں ہیں جو بداہت عقل اور حواس پنج گانہ یعنی باصرہ، شامہ، ذائقہ، سامعہ، لامہ کی دسترس سے باہر ہوں۔ یعنی جسے بداہت عقل یا حواس سے نہ جانا سکے۔

اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس پر کوئی دلیل قائم ہو۔

دوسرے وہ چیز جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو۔ (تفسیر بیضاوی)

یہاں دلیل عام ہے، خواہ عقلی ہو، خواہ سمعی، جس غیر پر دلیل قائم ہو وہ عطائی ہے اور جس پر کوئی دلیل عقلی یا سمعی نہ قائم ہو وہ ذاتی خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ جن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب سوائے اللہ عزوجل کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ اس سے مراد یہی ذاتی ہے، جو خاصہ الوہیت ہے۔ اور جن آیتوں میں انبیائے کرام کے لیے علم غیب کا اثبات ہے، ان سے مراد عطائی ہے۔

یہاں خاص بات یہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ متقیوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان نام ہے دل سے کسی بات کے سچ جاننے کا، اسی کو تصدیق بھی کہتے ہیں۔ اور تصدیق علم کی قسم ہے تو ثابت ہوا کہ متقیوں کو غیب کا علم حاصل ہے۔ کیوں کہ تصدیق بے علم کے محال ہے، تو ثابت ہو گیا کہ ہر مسلمان غیب جانتا ہے۔ مگر وہ اقل قلیل ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کو غیب جاننے والا غیب کا عالم نہیں کہتے۔ کیوں کہ عالم ہونے کے لیے معتد بہ علم کا حاصل ہونا لازم ہے۔ جس طرح ہر مسلمان بہت سے عقائد و احکام کا علم رکھتا ہے، مگر عالم نہیں کہتے۔ عالم اسے کہتے ہیں جو ایک معتد بہ مقدار علم رکھتا ہو، اسی طرح علم

غیب میں بھی ہے۔

اس سے مراد یہاں اللہ عزوجل کی ذات، صفات، فرشتے، وحی، احوال قبر، حشر و نشر، جنت و دوزخ وغیرہ ہیں۔ ان چیزوں کو کوئی بھی نہ حواس سے معلوم کر سکتا ہے نہ بداہت عقل سے۔
دوسری علامت:

نماز کو کما حقہ ادا کرتے ہیں۔ کما حقہ ادا کرنے کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ پابندی کے ساتھ اس کے وقت پر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ نہ قضا ہوتی ہے نہ مکروہ وقت میں ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ نماز کو اس کے تمام شرائط و آداب ظاہری و باطنی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ نماز کے شرائط اور آداب ظاہری کتب فقہ میں مصرح ہیں۔ آداب باطنی کی بنیاد احسان ہے، جسے حدیث جبرئیل میں بیان فرمایا:

ان تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك.

یوں عبادت کرو گویا تم اپنے معبود کو دیکھ رہے ہو۔ یہ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

یعنی کسی بھی عبادت کے وقت اتنا حضور قلب ہو کہ بندے کے ذہن میں یہ تصور جما ہو کہ ہم اللہ عزوجل کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ احسان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اگر کسی کی رسائی اس اعلیٰ درجہ تک نہ ہو، تو احسان کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم یہ تصور ہو کہ ہم اللہ عزوجل کو دیکھ رہے ہیں۔ ان دونوں تصور کا نتیجہ ہوگا کہ بندے کا ذہن غیر اللہ سے صاف ہوگا۔ عاجزی، فروتنی، خشوع و خضوع ہوگا۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ نماز میں ایسی لذت ملے گی کہ نماز کے مقابلے میں دونوں جہاں کی نعمتیں ہیچ محسوس ہوں گی۔

اے کہ می گوئی چرا جائے بجانے می خری

ایں سخن ما ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

ان آداب ظاہری و باطنی کا مختصر بیان، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ عزوجل نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جو خوب اچھی طرح وضو کر کے انہیں ان کے وقت پر کامل خشوع

وخصوع کے ساتھ ادا کرے، اس کے لیے اللہ عزوجل کا وعدہ ہے کہ اسے بخش دے گا اور جو ایسا نہ کرے اس کے لیے کوئی وعدہ نہیں، چاہے بخشے چاہے عذاب دے۔

تیسری علامت:

ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے، اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ”مما“ میں من تعیضیہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ تقویٰ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، سب خرچ کریں بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا کافی ہے، بلکہ عوام کے لیے کل کا کل خرچ کرنا منع ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا:

”وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ

مَلُومًا مَّحْسُورًا“ (بنی اسرائیل)

اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہو امت رکھ اور نہ بالکل کھول رکھ کہ تو بیٹھ جائے، لوگ ملامت کریں اور تو پچھتائے۔

رہ گئے خواص جو مقام رضا و تسلیم پر فائز ہیں کہ ان کے دل پر مال کی موجودگی اور عدم موجودگی سب برابر ہے۔ ان کے معاملات الگ ہیں۔

خرچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں اللہ عزوجل نے انہیں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے اور جہاں حکم دیا ہے، وہیں خرچ کرتے ہیں۔ یہ زکوٰۃ اور دیگر تمام مصارف خیر صدقات و نوافل کو شامل ہے۔ ان علامتوں کی یہ ترتیب اس بنا پر ہے کہ ایمان سب پر مقدم ہے۔ بے ایمان کا کوئی عمل خیر کارآمد نہیں۔ ایمان کے بعد عبادات میں سب سے اہم نماز ہے۔ اسی وجہ سے نماز کا مکلف ہر بالغ عاقل مسلمان ہے۔ مال دار ہو یا تنگ دست، آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، تندرست ہو یا بیمار، مسافر ہو یا مقیم بخلاف دیگر فرائض کے کہ ان میں اتنا عموم نہیں۔ مثلاً روزہ ہے کہ بیمار اور مسافر کو حائلہ اور دودھ پلانے والی کو بہ شرائط یہ اجازت ہے کہ رمضان میں نہ رکھیں، دوسرے دنوں میں رکھیں۔ شیخ فانی کو اجازت ہے کہ روزے کے بجائے کفارہ ادا کرے۔ زکوٰۃ صرف صاحب نصاب آزاد بالغ پر فرض ہے، وہ بھی سال میں صرف ایک بار، وہ بھی وسعت کے ساتھ کہ فوراً ادائیگی واجب نہیں۔ زندگی میں جب بھی ادا

کرے، ادا ہی ہوگی۔ حج زندگی میں صرف ایک بار فرض ہے، وہ بھی ایسے شرائط کے ساتھ کہ ان سب کا تحقق بہت کم ہوتا ہے۔ اس لیے نماز کو مقدم فرمایا۔ روزہ اور حج اس وقت تک فرض نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے ان دونوں کا تذکرہ یہاں نہیں۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ
يُوقِنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

اور جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو (اے محبوب) تم پر اتارا گیا اور جو تم سے پہلے اتارا گیا، اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ اس طریقہ پر ہیں جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے، اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

ان آیات میں سلسلہ وار متقیوں کی علامتیں بیان ہو رہی ہیں۔ تین علامتیں ان سے پہلے کی آیات میں مذکور تھیں، چوتھی علامت یہ بتائی گئی کہ متقی وہ لوگ ہیں جو ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر من جانب اللہ اترا ہے۔ پانچویں علامت یہ بتائی گئی کہ وہ لوگ اگلے انبیائے کرام پر جو کچھ اترا ہے، اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ چھٹی علامت یہ بتائی گئی کہ یہ لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

مَا أَنْزَلَ:

عام ہے، خواہ وہ فرشتے کے واسطے سے اتارا گیا ہو یا فرشتے کے واسطے کے بغیر ہو۔ مثلاً اللہ عزوجل نے نبی سے خود کلام فرمایا ہو یا نبی کے دل میں القا فرمایا ہو۔ ان پر ایمان لانا ویسا ہی ضروری ہے جیسے ان پر ضروری ہے جو بواسطہ ملک ہو۔

ان علامات میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان بالغیب مطلقاً معتبر نہیں۔ معتبر وہی ہے جو وحی الہی کے مطابق ہو۔ جیسے ہنود، مجوس، بدھشت وغیرہ۔ سینکڑوں ان دیکھی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مثلاً دیوی، دیوتا، اہرمن، تاج، آواگون، نرک، سورگ وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ معتبر نہیں۔ اس لیے کہ وحی ربانی کے مطابق نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہے، اسی طرح عبادت کرنا اور نیکی کے نام پر خرچ کرنا وہی معتبر ہے جو وحی کے مطابق ہو ورنہ سب بے کار مفت کی مشقت اور ارضاعت مال ہے۔

یہ یہود و نصاریٰ کا رد ہے۔ یہود کو یہ زعم تھا کہ چونکہ ہم توراہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمیں کسی اور کتاب پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ یوں ہی نصاریٰ انجیل پر ایمان کو کافی جانتے تھے، یہ ان کی جہالت تھی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ محض توراہ و انجیل یا کسی سابقہ آسمانی کتاب پر ایمان کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ تمام اگلی کتابوں پر ایمان لایا جائے اور ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید پر بھی ایمان لایا جائے۔ اگر اگلی کتابوں پر ایمان ہو مگر قرآن پر ایمان نہ ہو تو اب یہ ایمان بے کار ہے۔

اور بہ نظر دقیق اگلی کتابوں پر ایمان مستلزم ہے، قرآن پر ایمان کو اس لیے کہ تمام اگلی کتابوں میں قرآن و صاحب قرآن کا ذکر موجود ہے اور سب میں قرآن و صاحب قرآن پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ اس لیے اگلی کتابوں پر صحیح ایمان اسی کا ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے۔ قرآن کی تکذیب اگلی تمام کتابوں کی تکذیب ہے۔ اسی کو بیان فرمایا کہ متقی یعنی مومن وہ ہے جو قرآن پر بھی ایمان رکھتا ہو اور اگلی کتابوں پر بھی ایمان رکھتا ہے۔

قرآن پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مذکور تمام باتوں پر تفصیلی طور پر ایمان رکھا جائے۔ ان سب کو تفصیلی طور پر حق مانا جائے اور اگلی کتابوں پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اجمالی طور پر ان سب کو حق مانا جائے۔

یہ آیت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ جب اسلام کا یہ مطالبہ ہے اللہ عزوجل کے تمام انبیا کو حق مانیں، ان پر نازل شدہ کتاب پر ایمان لائیں تو اگر بالفرض حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی ہوتا تو جیسے وما انزل من قبل فرمایا گیا ہے، وما انزل من بعد بھی ضرور فرمایا جاتا۔ وما انزل الیک وما انزل من قبلك پر اقتصار اس کی دلیل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔

آخرت سے مراد قیامت کے بعد کا عالم ہے۔ آخرت پر یقین اسلام کا بہت اہم مسئلہ ہے، اور یہ یقین انسان کے اللہ عزوجل کی طرف رجوع اور شریعت کی پابندی کی بنیاد ہے، جس کے دل میں یہ یقین جتنا راسخ ہوگا، اس کے دل میں اتنا ہی اللہ عزوجل کا خوف ہوگا، اتنا ہی

زیادہ وہ اعمال صالحہ اخلاق حسنہ سے آراستہ اور معاصی و سینات سے بے زار ہوگا۔

یقین کے تین درجے ہیں: علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔

علم الیقین: وہ درجہ ہے جو کسی چیز کے بارے میں سن کر یا صحیح غور و فکر کے بعد

حاصل ہوتا ہے

عین الیقین: وہ درجہ ہے جو کسی چیز کے بارے میں اسے دیکھ کر حاصل ہوتا ہے۔

حق الیقین: وہ درجہ ہے جو کسی چیز کے بارے میں اسے دیکھنے کے بعد برتنے پر

حاصل ہوتا ہے۔

آخرت پر یقین کا علم الیقین کے درجہ تک ہر مسلمان مکلف ہے۔ پھر اپنی اپنی

استعداد مجاہدہ، ریاضت، انابت الی اللہ، شغل باللہ کے ساتھ ساتھ یہ ترقی کرتا رہتا ہے، تو

عین الیقین تک پہنچتا ہے، پھر مزید ترقی کر کے حق الیقین تک۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ عین الیقین اولیائے کرام کا درجہ ہے اور حق الیقین

انبیائے کرام کے ساتھ خاص ہے۔ (روح البیان)

متقیوں کی علامتوں کے بعد تقویٰ کا ثمرہ بیان ہوا کہ جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے

ہیں اور مذکورہ اوصاف کے ساتھ متصف ہیں، یہی لوگ ہر طرح پر مقصد میں مکمل طور پر

کامیاب ہیں۔ فلاح ہر قسم کی مکمل کامیابی کو کہتے ہیں۔ خواہ دنیوی ہو، خواہ اخروی۔ اب

مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہیں، اور آخرت میں بھی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْتَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ

اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

جو لوگ کفر پر اڑے ہیں، انہیں تم ڈراؤ یا نہ ڈراؤ دونوں یکساں ہے۔ یہ لوگ ہرگز

ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر کر دی، اور ان کی

آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

تناسب:

انسان کی تین قسمیں ہیں:

مومن مخلص: جو زبان سے بھی اسلام کی حقانیت کا اقرار کرتے ہیں، اور دل سے بھی اس کو حق مانتے ہیں۔

خالص کافر: جو زبان سے بھی اپنے کفر کا اقرار کرتے ہیں، اور ان کے دل میں بھی کفر بھرا ہے۔

منافق: جو زبان سے اسلام کے حق ہونے کا اقرار کرتے ہیں، مگر ان کے دل میں کفر بھرا ہوا ہے۔ ابتدائی پانچ آیتیں مومنین مخلصین سے متعلق تھیں۔ یہ دو آیتیں خالص کافروں کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد تیرہ آیتوں میں منافقین کے احوال مذکور ہیں۔

یہ آیتیں ابو جہل وغیرہ ان ضدی ہٹ دھرم سرکشوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی حقانیت کے دلائل قاہرہ و براہین ساطعہ روز روشن کی طرح ظاہر و باہر دیکھے۔ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ کفر پر اڑے رہے، حق واضح ہونے کے بعد بھی اسے قبول نہیں کیا۔ یہ ان سرکشوں کی نفسانی کیفیت کا بیان ہے۔ گویا یہ فرمایا جا رہا ہے۔ سمجھایا بجھایا اسے جاتا ہے جو سمجھا بوجھانہ ہو۔ سب کچھ سمجھنے کے بعد اپنی ضد پر اڑے رہنے والے کا علاج یہی ہے کہ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا گیا:

فَذَرْنَهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝

اب انہیں چھوڑ دو اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ جب کسی شخص کا کوئی لڑکا نالائق نکل جاتا ہے، تو شفیق باپ پہلے اسے سمجھاتا ہے، جب سمجھانے سے نہیں مانتا تو اسے انعام و اکرام کی امید دلاتا ہے، روشن مستقبل کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس پر بھی نہیں مانتا تو اسے ڈارتا ہے، دھمکاتا ہے، کچھ سزا بھی دیتا ہے۔ اب بھی اگر وہ راہِ راست پر نہیں آتا تو یہی کہتا ہے: جانے دو کجخت کو اب اسے سمجھانا بجھانا، ڈرانا دھمکانا بے کار ہے۔ یہی صورت یہاں پر ہے۔ پہلے ان سرکشوں کو نرمی سے سمجھایا بجھایا گیا، اس پر راہِ راست پر نہیں آئے۔ تو دنیا و آخرت کی کامیابی کی امید دلائی گئی، اس پر بھی حق قبول نہیں کیا تو انہیں ڈرایا دھمکایا گیا۔ کئی موقع پر بطور عبرت دنیا میں سزائیں بھی ملیں، پھر بھی انہوں نے حق قبول نہیں کیا، تو اب فرمایا جاتا ہے کہ انہیں ان کی

حالت پر چھوڑ دو۔ یہ لوگ ایمان قبول کرنے والے نہیں۔

اس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سعی بلیغ کے باوجود ان سرکشوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو انتہائی صدمہ اور افسوس رہتا تھا۔ یہاں تک کہ فرمایا گیا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ
أَسْفًا (الکہف)

تو تم مارے افسوس کے اپنی جان پر کھیل جاؤ گے۔ اگر یہ اس بات پر ایمان نہ لائیں۔

گویا اللہ عزوجل یہ فرما رہا ہے کہ تمہارا کام پیغام حق پہنچانا ہے، لوگوں کو حق کی دعوت دینا ہے، لوگ قبول کر لیں تو بہت اچھی بات ہے، کچھ لوگ نہ مانیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو ان کے پیچھے اپنی جان ہلکانہ کرو۔

دلوں اور کانوں پر مہر کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے مسلسل سرکشی اور عناد کیا، حق کو دبانے بلکہ مٹانے کی کوشش کی۔ داعی حق پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شہید کر دینے تک کی کوششیں کی۔ دعوت حق کے سبب اتنا ستایا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہجرت کرنی پڑی۔ ان سب جرائم کی سزا یہ ہے کہ ان کے لیے اب معافی کا دروازہ بند ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بادشاہ کے باغی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو بادشاہ کے جاہ و جلال و قوت سے واقف نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو کسی کے بہکانے و رغلانے سے بغاوت کر بیٹھتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں بادشاہ سے عداوت و دشمنی ہوتی ہے۔ اس بنا پر بغاوت کرتے ہیں۔

دو پہلے قسم والے باغی سمجھانے بچھانے، غلط فہمی دور کرنے سے اطاعت شعار ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ انہیں معافی بھی دیتا ہے، اور اپنے مخلصین کے زمرے میں شامل بھی کر لیتا ہے۔ لیکن دنیا کا کوئی ایسا بے وقوف بادشاہ نہ ہوگا کہ تیسرے قسم کے باغیوں کو معاف کر دے۔ یا انہیں اپنے مخلصین کے زمرے میں شامل کرے۔ اگر بالفرض تیسرے قسم کے

باغیوں کے بارے میں کوئی سفارش بھی کرے گا تو بادشاہ کو اگر اپنی سلطنت اور جان عزیز ہے، تو ہرگز ہرگز اس سفارش کو قبول نہیں کرے گا۔ تیسری قسم کے باغیوں کو بادشاہ کی اطاعت کے لیے سمجھانا بھگانا بے سود ہے۔ ایسے موقع پر بھی کہا جاتا ہے یہ عقل کے اوندھے ہو گئے ہیں، اندھے بہرے ہو گئے ہیں، انہیں سمجھانا بھگانا بے کار ہے۔ ابو جہل وغیرہ متمردين اسی تیسری قسم کے باغیوں میں سے تھے، جو اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت میں اتنے اندھے، بہرے اور پاگل ہو چکے تھے کہ گویا ان کی آنکھیں حق دیکھ نہیں رہی تھیں۔ ان کے کان حق سن نہیں رہے تھے۔ ان کے دل حق سمجھ نہیں رہے تھے۔ حق دیکھنے اور سننے اور سمجھنے سے انہیں جو عناد تھا اسی کو مہر اور پردے سے تعبیر کیا گیا۔ گویا یہ فرمایا گیا کہ مخلصین کے زمرے میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ انہیں اپنے عناد اور حق سے بغاوت کی سزا ضرور ملے گی۔



ارض مقدس اور یہودی تغلب

ارض فلسطین کی عظمت و برتری کے لئے یہی کافی ہے کہ اسے قرآن کریم نے ارض مقدس کہا اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ جیسے اولوالعزم رسول کی امت کو حکم دیا گیا:

يَقُومُوا ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ (پ ۶. مائدہ: ۸۷. آیت ۲۱)

اور جب اس بزدل قوم نے وہاں کے مغتلبین، جبارین کی ظاہری قوت کی داستان سن کر وہاں جانے سے انکار کر دیا اور یوں کہا:

إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا أَبَدًا مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هُنَا

قَاعِدُونَ. (پ ۶. مائدہ: ۸۷. آیت ۲۲)

ترجمہ: جب تک یہ اس میں ہیں ہم کبھی نہیں جائیں گے۔ آپ اور آپ کے پروردگار جائیں، لڑیں اور ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

تو چالیس سال تک صحرا نوردی کے عذاب میں مبتلا رہی۔

اس ارض مقدس کے بارے میں فرمایا گیا:

بَارَكْنَا حَوْلَهُ. (پ ۱۵. بنی اسرائیل: سورہ نمبر ۱۳. آیت ۱)

ترجمہ: اس سرزمین کا ادب رب العالمین کو اتنا ملحوظ ہے کہ وہاں داخل ہونے والے

ایک گروہ کو داخلہ کے وقت اس ادب کا مامور کیا گیا۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ (پ ۱. بقرہ: ع ۶ آیت ۵۸)

ترجمہ: اور دروازے میں داخل ہوتے وقت سر جھکائے رکھنا اور کہو، ہمیں معاف

کر دیا جائے۔ لیکن جب اس متمدن قوم نے اس ادب کو ملحوظ نہ رکھا تو طاعون جیسی موذی وبا میں گرفتار ہوئی۔

ہمارا قبلہ اول اور امم ماضیہ کا قبلہ مستقل بیت المقدس ہے۔ جہاں ہمارے نبی نہ

صرف ہمارے بنی بلکہ نبیوں کے نبی، نبی الانبیاء سید عالم ﷺ نے تمام انبیائے کرام کی امامت فرمائی۔ وہ بیت المقدس متبرک معبد جس کی بنیاد حضرت داؤد خلیفۃ اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رکھی اور جسے حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکمل فرمایا۔ اگر صفا و مروہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قدموں سے مس ہو جانے کے وجہ سے شعائر اللہ میں داخل ہو گئے، تو وہ بابرکت سرزمین جسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر بنی آخر الزمان ﷺ تک ہر نبی نے شرف بخشا ہو، جو سب کا معبد ہو، قبلہ ہو اکثر کا مسکن ہو، عظمت و تقدس کی کس منزل پر ہوگی، اس کا اندازہ آسان نہیں۔

لیکن یہ ارض مقدس اپنی عظمت اپنے تقدس میں جتنی رفیع الشان ہے، دین داروں کے لئے امتحان و ابتلا کی اتنی ہی بڑی کسوٹی بھی ہے۔ ابھی سن چکے! قوم موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب بامر الہی اس سرزمین کا رخ کیا تو جبارین و ظالمین کا سامنا ہوا۔

اسی ارض مقدس کو طالوت اور بخت نصر نے اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ باشندگان ارض پاک کے قتل کے ساتھ ساتھ معبد مقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر صلیبی لٹیروں نے اس ارض مقدس میں وہ ظلم ڈھائے کہ طالوت اور بخت نصر کے مظالم بے حقیقت ہو کر رہ گئے۔

اللہ اللہ! ایک وہ بھی وقت تھا، اسی ارض مقدس پر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قبضہ کیا تھا۔ لیکن ایک قطرہ خون زمین پر نہ بہا۔ لیکن انہیں امن پسندوں کی اولاد کی لاشیں ان کے خون میں امن و سلامتی کے ٹھیکیداروں، صلیبی درندوں نے تیرائیں بالآخر ۹۰ سال بعد شیردل غازی سلطان صلاح الدین ایوبی نے ان صلیبی سوراؤں کو سمندر پار ڈھکیل کر ارض مقدس کو پاک کر دیا۔

پھر ارض مقدس کی پاسبانی عثمانی ترکوں کو سونپی گئی، اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان بہادروں نے صدیوں تک پورے یورپ کے مقابل سینہ سپر ہو کر پاسبانی کا حق ادا کر دیا۔ صلیبی معرکوں میں انجام کار ذلت و رسوائی اٹھانے والے یورپین نے اگرچہ ہر عہد میں ارض پاک پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھے ہوں گے۔ مگر عثمانی ترکوں سے ارض مقدس چھیننے کی جرأت کبھی نہ کر سکے۔

خلافت اسلامیہ مٹ چکی تھی مگر عثمانی سلاطین نے کچھ نہ کچھ اس کی آن بان باقی رکھی۔ مصر، شام، عراق، حجاز، فلسطین، لبنان، سمرقند، بخارہ، کاشغر، پورا چینی ترکستان عثمانیوں کے ہلالی پرچم کے نیچے جمع تھا۔ اسی اتحاد و وفاق کے نتیجے میں سلطنت ترک اتنی قوی تھی کہ صدیوں تک زار روس پوری قوت سے ٹکراتا رہا لیکن اسے ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

یورپ کے مکار، روباہ صفت سیاست دانوں نے ترکوں سے بار بار ٹکرانے کے بعد یہ اچھی طرح آزمایا تھا کہ جب تک مسلمانوں کا شیرازہ منتشر نہ کیا جائے گا، عثمانی شیروں کو زیر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے ففٹھ کالم کے ذریعہ ترکوں کے صوبوں میں قومی عصبیت کا شیطان پیدا کرنا شروع کیا۔ مصریوں کو پڑھایا کہ تم شاندار ماضی کے مالک ہو تمہاری آیب آبرو مندانہ تاریخ ہے، تم کیوں ترکوں کے غلام بنے ہوئے ہو؟ شامیوں کو بھڑکایا تم جغرافیائی حیثیت سے، نسلی حیثیت سے، لسانی حیثیت سے، ترکوں سے الگ تھلک ہو، ان سے برتر ہو، پھر کیا وجہ ہے کہ ترک تم کو غلام بنائے ہوئے ہیں؟ عراقیوں کو اور غلایا تم دولت عباسیہ کے کروفر کے وارث ہو، تم تمام دنیائے اسلام کے مرکز رہ چکے ہو۔ آج کیوں اتنے نامرد بن گئے ہو کہ یہ ترک تم پر مسلط ہیں، حجازیوں کو اکسایا تم ان مجاہدین کی اولاد ہو جنہوں نے سب سے پہلے کلمہ اسلام کو اپنایا اور سارے جہاں میں پھیلایا۔ تمہارا کوئی حریف نہیں۔ آخرا ب اتنے کیوں گر گئے ہو کہ سمندر پار کے ترک تم پر حکومت کر رہے ہیں۔ پھر اب کیا تھا مصر، عراق، شام حجاز سب نے بیک وقت انقلاب زندہ باد کے ساتھ ساتھ اعلان آزادی کر دیا۔ اس طرح آنا فانا وہ قوت مجتمع جس نے پانچ سو سال تک یورپ کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال رکھا تھا، پاش پاش ہو کے رہ گئی۔ ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا ہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پھر کیا تھا، بڑی آسانی کے ساتھ برطانیہ نے ارض مقدس پر قبضہ کر کے یورپ کے کروڑوں صلیبی دیوانوں کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا۔ ساری دنیائے اسلام تڑپ کر رہ گئی۔ فلسطین کا غم مسلمانوں کے سینہ میں ناسور بن کے رہ گیا۔ روئے، گڑ گڑائے، جلسے کئے، جلوس نکالے

، بیانا دیئے، فریادیں کیں مگر سب کچھ بے سود، اسی وقت کے لئے فرمایا گیا ہے:
 دعائہم لایستجاب ایسے لوگوں کی دعائیں قبول نہیں کی جاتیں۔ اپنے گلے میں
 پھانسی کا پھندا ڈال کر جاں بری کی دعا کرنا قدرت کے ساتھ ٹھٹھا ہے۔

اب بھی وقت ہے کہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کیا جاتا۔ لیکن وطنیت کا بھوت اور سرکش
 ہوتا گیا۔ الگ ہو گئے تھے، لیکن مل کے رہتے اور کم از کم ارض مقدس کی بازیابی کے معاملے
 میں متحد رہتے تو شاید ساری دنیائے اسلام کو یہ ذلت آفریں دور نہ دیکھنا پڑتا۔ نجدیوں کی
 تلواریں بے نیام ہوئیں، تو ارض مقدس کی بازیابی کے لئے نہیں بلکہ حرمین طہین کے بے
 گناہوں کے خون پینے کے لئے اور جنت المعلىٰ و جنت البقیع میں آرام فرمانے والے
 اسلاف کے مزارت کھودنے کے لئے۔ جو صفت گورکنوں سے اور توقع ہی کیا ہو سکتی ہے۔

عربوں کے آپس میں اختلافات و انتشار تشنت و تفرق نے دنیائے اسلام کو وہ روز
 بد دکھایا کہ ۱۹۴۹ء میں امریکہ و برطانیہ نے اپنی اسلام و مسلمان دشمنی کا ناقابل تردید ثبوت
 پیش کرتے ہوئے بین الاقوامی آئین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے، ارض مقدس کی تقسیم کر کے
 اپنی کوکھ سے اپنی سیاسی ناجائز اولاد یہودی مملکت "اسرائیل" کو جنم دیا۔ یہودی مملکت کا وجود
 ساری دنیا کے مسلمانوں کی حمیت ملی، غیرت دینی کو کھلا ہوا چیلنج تھا، لیکن سوائے چم شورشغب
 اور دو ایک بار ہاتھ پائی کے اور کچھ نہ ہو سکا۔

اگرچہ برطانیہ نے اپنے قبضہ کے روز فردا ہی سے ساری دنیا میں بکھرنے ہوئے
 یہودیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر فلسطین میں آباد کرنا شروع کر دیا تھا، اور حکومت کے تمام اعلیٰ
 عہدے اور تجارتی و زراعتی بالا دستیاں یہودیوں کو دیں مگر برطانیہ کی انتھک کوششوں کے
 باوجود فلسطین میں یہودی آبادی ۳۳ فیصدی سے زائد نہ ہو سکی۔ آئین اور انصاف کا تقاضا تو
 یہ تھا کہ پورا ملک ۶۶ فیصد سے زائد آبادی اور وہاں کے ہزار ہا سال ساکن عرب کے حوالے
 کرتے لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی کے زخموں سے نسلا بعد نسل تڑپا ہوا یورپ اپنے آباؤ
 اجداد کی ذلت و رسوائیوں کا انتقام لینے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع شاید نہ پاتا۔ جوش انتقام
 میں اندھے ہونے والے یورپ نے اپنے خود ساختہ آئین کی دھجیاں بکھیر دیں اور ارض

فلسطین کی تقسیم کر کے ارض مقدس کے صحیح مالکوں سے چھین کر ۶۶ فیصد کو ۳۳ فیصد کینے درندوں کا غلام بنا دیا۔

عربوں کی بے کسی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ہمارا حق ہمیں نہیں مل سکے گا تو یہ اسکیم پیش کی کہ اس خطہ میں سیکولر مخلوط حکومت قائم کر دی جائے اور دونوں فرقوں کو اپنی اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔ لیکن کینہ پرور برطانیہ نے یہ بھی نہیں سنا اور اپنی ضد اور ہٹ پوری کر کے رہا۔ ہزاروں سال کے باشندوں پر نو آبادیہودی کتوں کو حاکم بنا کے چھوڑا۔ دنیائے اسلام خصوصاً عرب کے لئے یہ معمولی حادثہ نہیں تھا۔ کون اسلامی دل ہے جو نہ تڑپا ہو۔ کون اسلامی روح ہے جو بے چین نہ ہوئی ہو؟ کون زبان ہے جو چیخی نہ ہو؟ لیکن قصر بکھنم کے ارکان بے حیائی اور درندگی کی اس منزل پہ تھے جہاں ”ہرچہ خواہی کن“ فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔

روس سے متاثر علاقہ نے یہودی ریاست کو امریکہ کی مغربی ایشیا میں اجارہ داری کا اڈہ کہا اور آج بھی کہتے ہیں لیکن میں اسے یورپ کے صلیبی درندوں کی ذلت آمیز شکست کا انتقام کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ امریکہ و برطانیہ کو اجارہ دارانہ غلامی کے لئے مغربی ایشیا میں کمی نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ بہت سے جاہ پرست اقتدار کے بھوکے اپنی دینی غیرت و حمیت امریکہ و برطانیہ کو رہن دے سکتے تھے۔ اور اب ابھی دے رہے ہیں۔ تو اس کے لئے دنیا کے انصاف پسند حلقہ میں بدنام ہونے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لعنت کا تمغہ حاصل کرنے کے لئے یہودی مملکت جن کر اپنی سیاسی بد کرداری کا اعلان کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اگر اردن یا نجدی مملکت کو اجارہ داری کا اڈہ بناتے تو شاہ رچرڈ کی فرار کی کالک برطانیہ کی پیشانی سے مٹ تو جاتی، مگر اس کے قلب و جگر کے اس ناسور کا علاج کیا ہوتا جو فلسطین پر صلیبی پرچم نہ لہرانے پر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا مداوا تو ان کینہ پرور انتقام جو، سفاکوں کے نزدیک یہی تھا کہ ارض مقدس ان فاتحین کے قبضہ میں نہ رہے جنہوں نے ان کے ہم مذہبوں سے چھینا تھا۔

عرب کے لئے اب بھی وقت تھا کہ ملت کی آبرو بچانے کے لئے اپنے اقتدار کی

ہوس سے دست کش ہو کر پوری ملت کی پیشانی پر لگے ہوئے کلنگ کے ٹمکے کو دور کرنے کی کوشش کرتے لیکن افسوس صد افسوس! ایسا نہ ہو سکا۔

نہ اردن و عراق کی کشمکش ختم ہو سکی۔ نہ نجد اور مصر میں اتفاق ہو سکا۔ نہ امام نواز اور حریت پسند بھائیوں میں صلح ہو سکی۔ ایک دوسرے کے خلاف اعصابی بلکہ سلامتی جنگ تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود اندرونی طور پر وہ افتراق و شقاق کہ الامان والحفیظ!

یہی کربل ناصر جو آج رو رہے ہیں۔ کل اخوان المسلمین کے خلاف کیا کیا نہیں کر چکے ہیں۔ شاہ فاروق کے حامیوں پر وہ کون ظلم نہیں کئے، جو فراعنہ پہلے نہیں کر چکے ہیں۔ عراق میں اندرونی خون خرابہ نہیں ہوا کہ شام میں نہیں ہوا۔ ذرا ذرا سی ملکیتیں اور نہ پڑوسیوں سے صلح اور نہ آپس میں اتحاد، اپنی صلاحیتیں، قوتیں اپنے بھائیوں کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں۔ ان سب پر طرہ یہ ہے کہ عیاشی، تن آسانی، میں وہ انہماک کہ پیرس و لندن کو پیچھے چھوڑنے کی جد و جہد، ہر سال عروس نو سے ہمکناری، ہر سال نیو ماڈل کار، چاہے رہنے کو گھر نہ ہو، دنیا کے بیش قیمت سے بیش قیمت کپڑے بدن پر، یورپ کے اسپتال کوالٹی کے صوفے، عربوں کے خیموں میں، جب شاہ سعود کے حرم میں اکٹھے سوکینزیس محل سرا کے درو دیوار کو چھوڑے، فرش اور زینے غلافوں سے آراستہ اور قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے وارثین عیش و عشرت کے رنگینیوں میں:

تفو بر توایے چرخ گردوں تفو

دوسری طرف یہودی شب و روز محنت و جاں بازی اور اسلحہ کی فراہمی و مشق جنگ میں مصروف ہیں۔ کسی یہودی سربراہ مملکت کے محل میں ایک سے زائد بیویاں نہ ہوگی۔ کوئی خیمہ میں شب و روز گزارنے والے یہودی کے گھر کار نہ ہوگی۔ عرب سامان عیش و عشرت، لہو و لعب جمع کرتے رہے اور یہودی اسلحے، عرب موسم بہار میں عروس نو کے ساتھ پیرس و نیویارک میں ہنی مون مناتے رہے، اور یہودی تیر و تفنگ کی مشق کرتے رہے۔ عرب اپنے بھائیوں کے زیر کرنے، ہلکت دینے کے جوڑ توڑ میں، اور یہودی عرب کو صفحہ دنیا سے مٹانے

کی تیاری میں۔ اس کا نتیجہ جو نکلتا چاہئے تھا وہ نکلا۔ اب رونے سے کیا حاصل! مسبب الاسباب جل مجدہ نے ہمیں پہلے بتا دیا تھا:

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ. (پ ۱۰. الانفال: ع ۲. آیت ۴۶)

ترجمہ: آپس میں اختلاف نہ کرو، ورنہ تمہاری ہوا کھڑ جائے گی۔

اس کریم مولیٰ نے ہمیں واضح طور پر بتا دیا تھا:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ. (پ ۶. مائدہ: آیت ۴۷)

ترجمہ: تم مومنوں کا سب سے بدتر دشمن یہود کو پاؤ گے۔

کاش کہ ماضی قریب کی ذلت و رسوائی ہی عربوں کے لئے تازیانہ عبرت ہوتی۔ دنیا کی ذلیل ترین مٹھی بھر قوم سے اتنی سنگین شکست کھانے کے بعد بھی آنکھیں کھل جاتیں تو افسوس کم ہوتا مگر اب بھی نہ تو قومیت کا بھوت اٹرا، اور نہ آپس کی کینہ پروری و حصول جاہ و مال کی لڑائی ختم ہوئی۔ اب بھی وہی پھوٹ اپنے بھائی کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے مشورے۔

نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کا شجر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

☆☆☆

یہود کے بارے میں

ایک آیت کی تشریح

یہودیوں کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَضْرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَاؤُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۝

(بقرہ: آیت ۶۱ ب ۶۱- کو ع ۷)

ترجمہ: اور ان پر ذلت اور گداگری چھاپ دی گئی ہے، اور وہ من جانب اللہ نشانہ

غضب ہیں۔

جو لوگ یہودیوں کی ۱۹۴۹ء سے قبل کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے ان پر فرمان خداوندی کی یہ صداقت مہر نیم روز کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ خدا کی خدائی میں یہودیوں سے بدتر ذلیل و کمینہ و رسوائے زمانہ کوئی قوم نہ ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ فرعون نے صدیوں تک ان کو غلام بنائے رکھا۔ طالوت نے ان کا بھر کس نکالا۔ بخت نصر نے انہیں خاک میں ملایا۔ بازرین نے ان کی عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیر دیں اور عیسائیوں کے اقتدار نے ان کو ایسا ملیا میٹ کیا کہ ڈیڑھ ہزار سال سے در بدر کی ٹھوکروں کے سوا کہیں اطمینان سے سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکی۔ ملک بملک مارے مارے پھرتے۔ جہاں جاتے، ڈر ڈرائے جاتے، نہ کہیں سکون نہ چین، عزت و ناموس و وقار و عظمت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ صورت ایسی نکبت آگیاں کہ لکھ جی بھی صورتنا بھیک منگا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے شورروں کی صورتیں بھی یہودیوں کے مقابلے میں کچھ آب رکھتی ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرمان خداوندی کسی معینہ مدت تک کے لیے نہیں۔ خدا کی مسلط کی ہوئی ذلت و مسکنت ایسی نہیں کہ اسے کوئی دور کر سکے۔ پھر جب کہ بعض آیات میں ”السی یوم القیامة“ کی حد ہے تو قیامت

سے پہلے یہ رسوائی و ذلت ختم ہونا فرمان خداوندی کی تکذیب ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ۱۹۴۹ء میں ساری دنیائے اسلام کے علی الرغم یہودی مملکت کا قیام ہو گیا۔ کیا قیام مملکت ذلت و مسکنت کا اختتام نہیں؟ اچھا! اگر قیام مملکت رسوائی و عکبت کا اختتام نہیں تو اپنے حریف عربوں کی متحدہ طاقت کو ہر تصادم میں شکست دینا ان کے علاقہ پر قبضہ کر لینا، مفتوح عربوں کو ان کے گھروں سے نکال کر بھیڑ بکری کے گلے کی طرح ہانک کر ملک سے باہر کر دینا تو ضرور ذلت و مسکنت کا اختتام ہے۔ ایسی صورت میں مذکورہ بالا ارشاد قرآن کی توجیہ کیا ہوگی؟ خصوصاً اس صورت میں کہ کثیر علما نے اس آیت کے تحت یہ لکھا ہے کہ یہود کی ذلت و مسکنت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج روئے زمین پر یہود کی کوئی سلطنت نہیں۔ ان علما کے پیرواب کیا کہیں گے؟

یہ سوال ۱۹۴۹ء کے بعد بار بار اٹھا ہے۔ علما نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے اس کا ایک جواب لکھا تھا جو رسالہ پاسان میں چھپ بھی چکا ہے۔ اسی جواب کو آج ضروری تشریح کے ساتھ ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں۔

اگر چہ آیت مذکورہ میں ذلت و مسکنت کی ضرب یہود پر مطلق بیان کی گئی ہے، لیکن دوسری آیت میں یہ مقید ہے:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا تَفْتَفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ ۝
(آل عمران: پ ۴ رکوع ۳ آیت ۱۱۲)

ترجمہ: ان یہودیوں پر ذلت چھاپ دی گئی ہے جہاں بھی رہیں۔ مگر یہ کہ اللہ کی رسی پکڑ لیں یا اور لوگوں کی رسی پکڑ لیں۔

چوں کہ قرآن کریم کا اصول ہے:

”القرآن یفسر بعضہ بعضا“ قرآن مجید کی بعض آیت بعض کی تفسیر ہیں۔

لہذا جو آیتیں اس مضمون کی عام ہیں وہ اسی آیت سے خاص ہوں گی۔ اب صاف مطلب یہ ہوا کہ یہود لاکھ سر چکیں، لاکھ کوشش کریں، ہاتھ پیر ماریں، از خود اپنے بل بوتے پر قہر خداوندی کی چھاپ ہرگز نہیں مٹا سکتے۔ ہاں! اگر توفیق ایزدی و سنگیری فرمائے، اور مومن بن کر اللہ کی رسی پکڑ لیں تو یہ ذلت و رسوائی کا داغ مٹ سکتا ہے۔ اگر شقاوت ازلی انہیں یہ

سعادت حاصل نہ کرنے دے تو دوسری صورت یہ ہے کہ دنیا میں کسی کے دست نگر ہو کر ان کی غلامی کا طوق گلے میں ڈال لیں تو یہ داغ دور ہو سکتا ہے۔

یہود کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ اس فرمان ایزدی کے حرف حرف نقطہ نقطہ کی صداقت پر برہان قاطع ہے۔

عیسائیوں نے قوت حاصل کرتے ہی اس منحوس قوم کا اس طرح قلع قمع کیا کہ انہوں نے اپنی دانست میں اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ ارض مقدس ان کے ناپاک وجود سے یکسر خالی ہو گئی۔ یہ اپنی جان لے کر ادھر ادھر بھاگے۔

اسلام آیا، تو اس نے ابتداءً اپنی امن پسندی کی بنا پر ان کے ساتھ شریفانہ معاہدہ کر کے ان کو تمام شہری حقوق دیئے۔ لیکن یہ اپنی فطری شر پسندی، احسان فراموشی، غداری، منافقانہ رویے کی بنا پر اسلام کو پھیننے سے پہلے ہی ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ کون سی دسیسہ کاری تھی جو انہوں نے نہیں کی! کون سی سازش تھی جسے انہوں نے نہ کیا ہو! مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا، حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جھوٹ کرنا، آپ کے خلاف پروپیگنڈا، منافقین کی پشت پناہی کرنا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی جدوجہد، معاندین اسلام کی مالی امداد، ان کے لیے سراغ رسانی، معاہدہ کی خلاف ورزی، سخت ترین نازک موقع پر محاربین سے مل کر مسلمانوں کا قلع قمع، مدینے پر حملہ کی تیاریاں، لیکن خدائی حفاظت و صیانت اور امداد و اعانت کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ غداری، احسان فراموشی، نمک حرامی کے نتیجے میں یہ پہلے مدینہ طیبہ سے پھر پورے جزیرہ عرب سے نکالے گئے۔ دوسری طرف اسلام کی حقانیت و صداقت نے ان کے باطل مذہب کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ جن کو توفیق ملی وہ اللہ کی رسی پکڑ کر ذات و کبیت سے نجات پا گئے۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور کعب احبار کے نام سے کون واقف نہیں۔ دامن اسلام میں آکر یہ حضرات عزت و عظمت کی کس بلندی پر پہنچے، وہ ہزاروں کے لیے باعث رشک ہے۔

یہ جلوہ انجیل من اللہ کا ہے۔ اگر یہ اللہ کی رسی پکڑ لیں تو قہر خداوندی کی زد سے نکل سکتے ہیں۔ لیکن جو بد نصیب یہ سعادت نہ حاصل کر سکے وہ ساڑھے تیرہ سو سال در بدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ اسلام میں سینکڑوں انقلابات آئے، خلافت اسلامیہ ختم ہوئی۔ مملکت قائم ہوئی، بنی امیہ فنا ہوئے، ان کی جگہ بنی عباس نے لی، بنی عباس کا کوکب اقبال غروب ہوا، بنی فاطمہ بساط سیاست پر چمکے، مرکزی قوتیں ختم ہوئیں۔ طوائف اہملو کی پھیلی۔ حتیٰ کہ یورپ کے صلیبی ڈاکوؤں نے ارض مقدس پر قبضہ کر لیا۔ مگر اس غضب کی ماری قوم کو کبھی حوصلہ نہ ہوا کہ ارض مقدس تو کیا کسی دور دراز ویرانے میں ہی ایوان سلطنت کے نام سے ایک بھٹ ہی بنا لیتی۔ غضب خداوندی کی بجلیوں نے ان کانشین ایسا پھونکا کہ کہیں یک سینکے کا بھی پتا نہیں تھا۔

پھر اس کے بعد صلیبی دیوانوں اور مجاہدین اسلام میں آٹھ سو سال تک زور آزمائی ہوتی رہی۔ ایک تیسرے حریف کو اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں مل سکتا کہ اس کے دوشمنوں میں جنگ و جدال برپا ہو۔ ایک چالاک حریف دشمنوں کی چند روزہ لڑائی سے بہت بڑا فائدہ حاصل کر لیتا ہے۔ مگر وہی جو حساس ہو، غیرت مند ہو، باحمیت ہو، لیکن جس کا خمیر ہی خلاق دو عالم نے ذلت و نکبت سے بنایا ہو، اسے کیا احساس! اور بالفرض احساس بھی ہو تو دنیا کے گوشے گوشے میں پراگندہ قوم کر ہی کیا سکتی ہے۔

بالآخر عربوں کی قومی انفراد پسندی اور اس کے تحت ابھرنے والے نعرہ آزادی نے وہ روز بد دکھایا کہ برطانیہ ارض مقدس پر قابض ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ دنیا کی ہر قوم استعماری قوتوں سے متنفر ہو چکی تھی۔ اور بڑی سے بڑی طاقت سے لڑ کر آزاد ہونا جان چکی تھی۔ برطانیہ خوب جانتا تھا کہ ارض فلسطین پر ہم بہت دنوں اپنے اقتدار کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ اور جلد ہی وہ دن آنے والا ہے کہ یہ ارض مقدس چھوڑ کر جانا ہے۔ کینہ پرور، مسلم دشمن، انگریز نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ارض مقدس کے جن وارثین نے عیسائیوں سے چھین کر ساڑھے تیرہ سو سال تک اس پر انہیں قابض نہیں ہونے دیا، جن مردان خدا نے ان کے آباؤ اجداد کو وہ شرمناک شکستیں دی ہیں، جن کو سن کر وہ آج بھی عرق عرق ہیں۔ انہیں یہ امانت سپرد کی جائے۔ لہذا اس نے دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو بلا کر فلسطین میں آباد کرنا شروع کر دیا۔ انہیں

سکھایا پڑھایا، ورغلیا، ان کے سینوں میں مسلم دشمنی کا دبا ہوا جذبہ ابھارا، اور اقوام متحدہ کی وساطت سے امریکہ، فرانس، روس تینوں کی ہمنوائی سے دنیا کی رائے عامہ کے برخلاف آئین و انصاف کو ذبح کر کے یہودی ریاست کو جنم دیا۔ یہودیوں میں اب بھی یہ قوت نہ تھی کہ وہ اس کی ہمت کر سکتے کہ اپنی مملکت قائم کریں، یا دنیا کی کوئی انصاف پسند کچھری انہیں دنیا کے کسی خطے میں ایک انچ زمین پر حکومت قائم کرنے کی اجازت دیتی۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ نے اسلام و عرب دشمنی میں انہیں اپنے ایٹمی ہتھیاروں کے سہارے جنم دیا۔

یہ جلوہ ہے ”و حبل من الناس“ کا کہ کہیں ذلت سے چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتے مگر یہ کسی کی گود میں جا بیٹھیں۔ یہودی مملکت کا نظم و نسق اگرچہ ان کے ہاتھ میں ہے، مگر اس کے قیام و بقا و حفاظت کی ساری ذمہ داری امریکہ و برطانیہ کے سر ہے۔

اور ۱۹۵۶ء میں جو ہوا یا ابھی جون کے پہلے ہفتہ میں جو کچھ ہوا یہ یہودیوں کا کیا نہیں بلکہ در پردہ امریکہ کا کارستانی ہے۔ اخبارات پڑھنے والے جانتے ہیں کہ امریکہ کا چھٹا بیڑا بحر روم میں موجود تھا، جس نے مصر کے راڈار سسٹم کو جام کر لیا۔ امریکن جاسوسی طیارہ نے مصری فضائیہ کے خفیہ پیغامات یہودیوں تک پہنچائے، بمباری کرنے والے طیاروں کے پائلٹ بجائے عبرانی کے انگریزی میں بات کرتے سنے گئے۔ یہ یہودیوں اور مصر و عرب کا مقابلہ نہ تھا، یہ عرب اور امریکن تصادم تھا۔

اسے بھی جانے دیجئے۔ یہودیوں کو اتنے کثیر اسلحے، طیارے، ناپام بم کہاں سے ملے اس کا ایک ہی جواب ہے، امریکہ، پھر عربوں پر یہ عبوری فتح یہودیوں کی نہیں، امریکہ کی ہے۔ آج بھی ان تمام سامان جنگ سے آراستہ ہونے کے باوجود اگر امریکہ وغیرہ یہودیوں کی پشت پناہی سے ہٹ جائیں اور عرب کے مقابلہ پر صرف یہود رہ جائیں تو دنیا دیکھے گی کہ چند روز میں یہودی مملکت کا وجود باقی نہ رہے گا۔

ایسی صورت میں جب کہ قرآن کریم نے ”الا بحبل من اللہ، و، و حبل من الناس“ کا استثناء فرمایا ہے، اور واقعات نے بتا دیا کہ یہودی مملکت کا قیام و بقا ترقی و فتوحات امریکہ کی رہن منت ہیں، تو یہود کی یہ مملکت اور اس کی فتوحات ارشاد قرآنی کے ہرگز منافی

نہیں بلکہ اگر بہ نظر دقیق دیکھا جائے تو ارشاد قرآنی میں ”حبل من الناس“ کا استثناء بتا رہا ہے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کی خبر قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے ہی دے دی تھی۔ قرآن کریم کا استثناء محض اتفاق نہیں یا محض اظہار اندیشہ کے طور پر نہیں، بلکہ آئندہ جو کچھ ہونے والا تھا اس کی آگاہی ہے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ دنیا کی یہ ذلیل ترین قوم کسی کی گود میں بیٹھ کر اپنی خواری و ذات مٹانے کی کوشش کرے گی۔ اور اس میں ایک گونہ کامیاب ہوگی، اور آج یہی ہوا۔

یہ تو اس تقدیر پر کلام تھا کہ یہودیوں کی اس مملکت اور تغلب کو عزت مان لیا جائے اور اگر حقیقت امر پر نظر کی جائے تو آج بھی ذلت و مسکنت کی خدائی چھاپ ان کی پیشانیوں سے دور نہیں ہوئی۔ صاحب تخت و تاج ہونے ہی سے عزت نہیں ملتی۔ عزت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں وقار لوگ ذکر خیر کریں، مدح و ثنا کریں، ان کا کوئی وزن دنیا کی نظروں میں ہو، وہ کسی کے دست نگر در یوزہ گر نہ رہیں۔ اس معنی کر یہودی جتنے ذلیل آج ہیں، شاید اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ دنیا کی اکثریت انہیں چور، غاصب، جارح، ظالم، شقی، بے رحم، دغا باز، کمینہ کہہ رہی ہے، جس طرح نہتے شہریوں کی دولت لوٹنے والا انہیں قتل کرنے والا، ان کے گھروں کو پھونکنے والا ڈاکو کسی کی نظر میں عزیز نہیں ہوتا، اسی طرح آج کے یہودی بھی کسی اعتبار سے ذی عزت نہیں کہے جاسکتے۔ محتاجی و مسکنت کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں امر کی بھیک کے محتاج ہیں۔ آج اگر امریکہ اپنی بھیک روک لے تو ان یہودی گدا گروں کو دنیا میں کوئی بھیک دینے والا نہ ملے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے کہ یہود کی یہ ذلت و مسکنت خود ان کی اپنی قوتوں سے ختم نہ ہوگی۔ ہاں! اگر یہ اللہ کی رسی پکڑیں، تو دور ہو سکتی ہے، اور اگر یہ سعادت ان کی قسمت میں نہیں تو اگر کسی غیر کی پناہ میں آجائیں تو ان کے حصار میں در بدر کی ٹھوکروں سے بچ سکتے ہیں۔ یہی حال یہود کا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال کے بعد امریکہ کی پشت پناہی میں ان کو یہ قوت حاصل ہوئی ہے کہ عرب پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، لیکن رسوائی، محتاجی، در یوزہ گری، بھک منگی، گداگری، اب بھی چٹی ہوئی ہے۔

خلائی سفر اور قرآن

خلائی کشتیوں کے کارناموں نے دنیا کو ایک بہت اہم موڑ پر لا کھڑا کر دیا ہے۔
 طحیدین اسے الحاد کی مذہب پر فتحِ عظیم خیال کرتے ہیں۔ منکرین خدا کی جراتیں اتنی بڑھ گئیں
 ہیں کہ وہ بے محابا اسے انکارِ خالق کی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ خلا باز کا یہ نعرہ پوری دنیا میں
 گونجا: ”میں نے خدا کو بہت تلاش کیا، کہیں نہیں ملا“۔

مجھے سخت حیرت ہے کہ اگر کوئی خلائی کشتی چاند کے قریب پہنچ گئی، یا چاند تک پہنچ
 جائے، یا بالفرض انسان چاند میں آباد ہو جائے۔ وہاں سے زمین تک رسل و رسائل، آمد
 و رفت کا باقاعدہ نظام قائم ہو جائے۔ چاند ہی نہیں دیگر تمام سیارے مسخر ہو جائیں۔ سارا نظام
 شمسی انسان کے زیر نگیں ہو جائے، اور ان خلا بازوں کو کہیں آسمان نہ ملے اور بقول خلا باز
 خدا نہ ملے، فرشتے نہ ملیں تو اسے مذہب کیسے مفتوح ہو جائیگا، یہ کم از کم مجھ بور یہ نشین کی سمجھ
 سے بالاتر ہے۔ اور مذاہب مفتوح ہو جائیں تو ہو جائیں، اسلام کبھی مفتوح نہیں ہو سکتا۔

سائنس کی روزمرہ متبادل معلومات منکرین خدا کی پہلی پناہ نہیں بلکہ اس کے پہلے بھی
 یہ لوگ اس کی آڑ لے کر پرستارانِ خدا عزوجل پر ہلہ بول چکے ہیں لیکن دنیا نے دیکھا کہ
 اسلام اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ اپنی جگہ قائم رہا۔ اٹنے سائنس و فلسفہ کو منہ کی کھانی
 پڑی۔ آج سے بارہ سو سال پہلے جب بطلموس کی سائنس یونانی سے ترجمہ ہو کر عربی زبان
 میں منتقل ہوئی تو اسی قسم کا زلزلہ آیا تھا علمائے متکلمین نے جب بطلموس کے نظریات کا رد
 شروع کیا، تو بڑی بڑی پھبتیاں کسی گئیں لیکن دنیا نے دیکھا کہ آج خود پرستارانِ فلسفہ نے
 بطلموس کی ساری تحقیق کو افسانہ پارینہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

بطلموس کہتا تھا : آسمان نو ہیں۔

آج کی سائنس کہتی ہے : آسمان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

بطلموس کہتا تھا : آسمان گردش کر رہے ہیں، زمین ساکن ہے۔
 آج کی سائنس کہتی ہے : زمین حرکت کر رہی ہے
 بطلموس کہتا تھا : تمام ستارے خواہ ثابت ہوں یا سیارے
 آسمانوں میں مرکوز ہیں۔

آج کی سائنس کہتی ہے : سب ستارے فضا میں معلق اپنی اپنی جگہ محور پر
 چل پھر رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

بطلموس کے مقلدین نے اسلام کو لکارا تھا مگر دنیا نے دیکھا کہ آج کی نت نئی
 معلومات نے بطلموس کے دفتر معلومات کے ایک ایک لفظ کو مٹا کر رکھ دیا۔ لیکن اسلام بجمہ
 تعالیٰ اپنی جگہ قائم رہا۔ اس کے معتقدات غیر متبدلہ باقی رہے، اس کا ایک لفظ بھی تبدیل نہ
 ہوا۔ لا مبدل لکلمات اللہ ۵ (پ ۷ ع ۱۰، انعام آیت ۳۴)

اور آج بھی میں پورے یقین کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ جس طرح بطلموس
 اور فلسفہ یونان کے توہمات اسلام کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اسی طرح روس و امریکہ کے منظومات
 بھی اسلام کو مٹا کیا سکیں گے اس کے دامن پر ایک چھینٹ بھی نہیں ڈال سکے۔ بلکہ مجھے یہ
 کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ جس طرح آج کے نظریات نے فلسفہ بطلموس کے جیب
 و گریباں کا ایک تار بھی نہیں چھوڑا۔ اسی طرح ایک دن آئے گا کہ ان مدعیان تحقیق کی دجیاں
 فضائے بسیط پر اڑتی نظر آئیں گی۔

کون نہیں جانتا کہ آج سے ہزار ہا سال پہلے حکمائے یونان نے زمین کی گردش کا
 قول کیا تھا لیکن پھر انہیں میں وہ پیدا ہوئے جنہوں نے حرکت زمین کا انکار کیا اور آسمان کی
 گردش کی تھیوری پیش کی اور اس پر اتنا زور دیا کہ ساری دنیا کو یقین کرنا پڑا کہ یہی واقعہ ہے،
 حتیٰ کہ شرق سے لے کر غرب تک دنیا کے گوشے گوشے میں گردش چرخ، فلک دوّار کا محاورہ
 تک پھیل گیا۔ لیکن زمانہ نے پھر کروٹ بدلی اور آج یورپین نظر بازوں نے اپنی دور بینوں،
 خوردبینوں سے اپنی قوت بھرا چھی طرح دیکھ بھال چھان بین کر یہ اذعا کیا کہ آسمان کا وجود ہی
 نہیں کہ اس کی گردش کا سوال پیدا ہو۔ بس زمین ہے وہی گردش کر رہی ہے اور زمین ہی

گردش ہماری زندگی کی بنیاد ہے۔

کہنا یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس کی تھیوریاں آپس میں ٹکراتی رہیں اور ٹکراتی رہیں گی۔ ان میں رد و بدل ہوا اور ہوتا رہے گا۔ انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کے منظومات بدلتے رہے اور بدلتے رہیں گے، مگر اسلام کے معتقدات چودہ سو سال سے اپنی جگہ قائم ہیں، قائم رہیں گے، ان میں نہ کوئی تغیر ہوا نہ ہوگا، نہ کوئی ترمیم ہوئی اور نہ ہوگی۔

ہزار فلسفیوں کی چٹاں چٹیں بدلی

نبی کی بات مگر آج تک نہیں بدلی

آج جو خلیجان ہے وہ دراصل بعض علما کی آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ کی بطلموس کے

توہمات کے ساتھ مطابقت کی بلا ضرورت کوشش کی وجہ سے ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں فرمایا گیا۔ آسمان کے سات طبق ہیں۔ بطلموس نے کہا: آسمان نو ہیں۔ لوگوں نے یہ تطبیق دی، سات آسمان سب سے سیارے کے ہیں، آٹھویں کرسی، نویں عرش ہے۔ اس تطبیق کا حاصل یہ ہوا کہ چاند، سورج، زہرہ، مشتری وغیرہ آسمانوں میں ہیں، یہ بات علما سے نکل کر عوام میں ایسی پھیلی کہ عوام و خواص کی زبان زد ہو گئی اور علما کے منہ سے سنی ہوئی بات کو عوام نے مذہب کا جز سمجھ لیا، اور آج جب کہ خلائی مشاہدین نے یہ بتایا کہ سیارے آسمان میں نہیں بلکہ زمین کی طرح فضا میں اپنے مرکز پر قائم ہیں۔ تو لوگوں نے ہزاروں سوالات کھڑے کر دیئے۔ اسی طرح عام ذہنوں میں یہ بات بسی ہوئی ہے کہ اللہ عزوجل آسمان میں ہے حتیٰ کہ عوام میں یہ کفری بول عام ہے ”نیچے نیچے اوپر خدا“ چاند کے قریب تک پہنچنے والوں کو جب نہ آسمان ملانہ آسمان میں بسنے والا خدا تو انہوں نے کہہ دیا کہ میں نے خدا کو بہت ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔

لیکن قرآن کریم و احادیث کا مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں یہ کہیں نہیں فرمایا گیا کہ چاند و سورج و دیگر سیارے آسمان میں مرکوز ہیں اور نہ کہیں یہ ہے کہ اللہ عزوجل آسمان یا زمین میں اسی طرح ہے جیسے ہم اور آپ رہتے ہیں۔ لہذا اس مزعوم پر اسلام کے اصول پر اعتراض نری حماقت ہے۔ ہاں! نصوص قرآنیہ و ارشادات

نبو یہ میں اگر کہیں یہ ہوتا کہ چاند و سورج دیگر سیارے اور ستارے آسمان میں مرکوز ہیں یا جڑے ہوئے ہیں اور سیاروں تک پہنچنے کے بعد بھی کہیں آسمان نہ ملتا تو البتہ اسلام کے اصول پر اعتراض درست ہوتا۔ یہ کتنے ظلم کی بات ہے کہ بطلموس یا بطلموس کے بعض کورانہ تقلید کرنے والوں کی باتوں کو اسلام کے اصول سمجھ کر اسلام کی حقانیت و صداقت کو چیلنج کیا جائے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ ساری دنیا کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ قرآن و حدیث میں یہ کہیں نہیں کہ سیارے یا ثوابت آسمانوں میں جڑے ہیں یا مرکوز ہیں۔ جو اس کا دعویٰ کرے وہ ثبوت لائے، رہ گئے بطلموس کے توہمات وہ نہ اسلام کے معتقدات ہیں اور نہ اس کی صداقت کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔

اس سلسلہ میں چند آیتوں کے ظاہر معنی یا غلط معنی لے کر لوگ شور مچا سکتے ہیں۔ اس لیے ان آیات کی اصل مراد واضح کر دیتا ہوں۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (انبیاء: ۱۷-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰)

چاند و سورج وغیرہ فلک میں تیرتے ہیں۔

فلک کے معنی لوگوں نے آسمان کر دیا ہے اور یہی ساری غلط فہمی کی بنیاد ہے۔ اس آیت میں فلک سے مراد آسمان نہیں۔ مدار ہے۔ اب آیت کا ترجمہ یہ ہو سب اپنے مدار میں تیرتے ہیں۔ سید المفسرین سیدنا حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

يدورون في فلكة كفلكة المغزل

ترجمہ: یہ ایک گولائی میں گھومتے ہیں جو تکلے کے مکڑے کے مثل ہے۔

ہر معمولی عقل والا جانتا ہے کہ اگر آیت مذکورہ میں فلک سے مراد آسمان ہوتا تو اس کی تفسیر کی کوئی حاجت نہ تھی۔ کون ہے جو آسمان نہیں جانتا، اس کی تفسیر فلكة كفلكة المغزل سے کرنا اس پر نص قاطع ہے کہ آیت میں فلک سے مراد آسمان نہیں، مدار ہے۔ اسی بنا پر امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا:

ہر ایک ایک گھیرے میں پیر رہے ہیں۔

آیت کا صاف و صریح مطلب یہ ہوا کہ چاند و سورج وغیرہ اپنے اپنے مدار پر چلتے ہیں۔ یہ مدار کہاں ہے؟ آسمان میں ہے، فضاؤں میں ہے، اس کی کوئی تعین اس آیت میں نہیں۔ اگر سیاروں کا مدار آسمان میں ہے، جیسا کہ بطلموس کہتا ہے کہ تو بھی آیت کے معنی درست اور اگر فضا میں ہے جیسا کہ آج کے فلاسفہ کہتے ہیں تو بھی صحیح۔ کسی نظریہ کسی تھیوری کے معارض نہیں۔ فلسفہ و سائنس کے نظریات بدلتے رہے اور بدلتے رہیں گے مگر قرآن مجید کا ارشاد اپنی جگہ صادق ہے اور ہمیشہ صادق رہے گا، پیدا کرنے والے نے اپنی مخلوق کو رہنے کے لیے جو جگہ دی ہے، اس کو وہی خوب جانتا ہے۔ دوسروں کو صحیح علم اگر ہے تو اس کے بتانے سے، ورنہ سوائے انکل پتچہ کے اور کچھ نہیں۔

چاند و سورج اور ستاروں کے آسمان میں ہونے پر یہ استدلال کیا جاتا ہے۔ ایک آیت میں فرمایا: **وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۝ (الملك: ۲۹-۱۶-آیت ۵)**
ترجمہ: ہم نے آسمان کو چراغوں سے زینت دی۔

اس آیت سے سطح میں یہ دلیل لاتے ہیں کہ ستارے آسمان میں ہیں لیکن دقیقہ میں نظریں جانتی ہیں کہ اس آیت سے یہ قطعاً لازم نہیں کہ ستارے آسمان میں پیوست ہیں یا جڑے ہوئے ہیں یا نکلے ہوئے ہیں، زینت دینے کے لیے مرکوز ہونا، جڑا ہونا، نکا ہونا لازم نہیں۔

اس کو یوں سمجھئے کہ ایک محل بیچ باغ میں تعمیر ہو۔ یہ باغ اس محل کے لیے یقیناً زینت ہے مگر کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا اس باغ کے پودے محل کی دیواروں پر چھتوں پر اگے ہوئے ہیں۔ اور نہ یہ کوئی طریقہ ہے، جس طرح باغ کے پودوں اور محل کے درمیان فصل ہوتے ہوئے بھی باغ محل کی زینت ہے اسی طرح ستارے اگر آسمان سے علاحدہ دور ہوں، مگر چوں کہ ان کی جگہ گاہٹ سادہ آسمان میں ایک دلکش منظر پیدا کرتی ہے اور دیکھنے میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستارے آسمان میں لٹکے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ فرمانا بالکل درست ہے:

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۝ (الملك: ۲۹-۱۶-آیت ۵)
ترجمہ: ہم نے آسمان کو چراغوں سے زینت دی۔

دیکھنے میں یہ آسمان کی زینت ہیں اور یہی اس آیت سے مراد ہے دوسری آیت سے اور واضح ہوتا ہے۔ فرمایا گیا:

وَزَيِّنَّا لِلنَّظَرِ ۝ (سورہ حجر: آیت ۱۶)

اور ہم نے اسے مزین فرمایا دیکھنے والوں کے لیے۔

دیکھنے والوں کی قید اس کا افادہ کرتی ہیں کہ ستاروں کا آسمانوں کے لیے زینت ہونا ہمارے دیکھنے میں ہے، اس سے کہے انکار ہے کہ رات میں نیل گوں آسمان میں یہ ستارے اپنی جگہ جگ سے آراستہ پیراستہ انجمن معلوم ہوتے ہیں۔

غرض کہ مزین کرنے سے آسمان میں مرکوز ہونا، جڑا ہوا ہونا حتیٰ کہ ٹکا ہوا ہونا مراد نہیں بلکہ آیت ثانیہ وَزَيِّنَّا لِلنَّظَرِ کی روشنی میں مراد یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی نظر میں ستارے آسمان خصوصاً پہلے آسمان کی زینت ہیں۔ رہ گئی ان کی جگہ کہاں ہے، اس پر آیت کی کوئی دلالت نہیں۔

اس مقام پر سب سے بڑا احتمالہ ان آیتوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

تَبْرَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا ۝

(الفرقان: بی۱۹-ع-۴-آیت ۶۱)

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات! جس نے سما میں بروج بنائے اور ان میں چراغ

(سورج) اور روشن چاند پیدا کیے۔

اور اس قسم کی وہ کثیر آیتیں جن میں یہ مذکور ہے کہ سما میں چاند اور سورج بنائے۔

لیکن قرآن کریم کے اسلوب بیان اور لغات پر نظر رکھنے والا جانتا ہے کہ ”سما“ کے معنی قرآن کریم میں بلکہ لغت عرب میں صرف آسمان کے نہیں، ”سما“ کے اصل معنی بلندی کے ہیں اور بادل یا آسمان اس کے معنی ثانی ہیں۔ چوں کہ بادل اور آسمان اوپر ہی ہوتے ہیں اس لیے ان کو بھی ”سما“ کہا جاتا ہے۔ متعدد جگہ قرآن کریم میں ”سما“ آسمان کے علاوہ دوسرے معنی میں وارد ہے۔

سورہ بقرہ کے تیسرے رکوع میں ”وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً“ ہے (آیت ۲۲)

اور سورہ بقرہ کے بیسویں رکوع میں ”وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ“

(آیت ۱۶۴)

اور اللہ نے بلندی یعنی بادل سے پانی برسایا۔

”سما“ کا معنی تفسیر صاوی میں ہے:

قوله من السماء ای اللغویة وهی : ما اعلا وارتفع والمراد السحاب .

سما کے معنی یہاں لغوی ہیں۔ یعنی جو اوپر ہو اور بلند ہو اور مراد بادل ہے۔

علاوہ ازیں لغت کی مشہور متداول کتاب المنجد میں ہے:

السماء ما نشاهدہ فوقنا کقبضہ رقاء محیط بالأرض . ما یحیط بالأرض

من الفضاء الواسع . کل ما علاک . رواق البیت . سقف کل شیء .

ظهر الفرس . المطر . السحاب .

سما کے معنی مندرجہ ذیل ہیں (۱) وہ نیل گوں گنبد جو زمین کو گھیرے ہے جسے ہم اپنے

اوپر دیکھتے ہیں (۲) یہ کشادہ فضا جو زمین کو گھیرے ہے۔ (۳) ہر وہ چیز جو تیرے اوپر ہو۔

(۴) گھر کا برآمدہ (۵) ہر چیز کی چھت (۶) گھوڑے کی پیٹھ (۷) بارش (۸) بادل۔

جب سما اتنے معنوں میں مشترک ہے، اور صرف آسمان کے معنی میں منفرد نہیں۔ نیز

قرآن کریم میں سما بمعنی بلندی اور بادل مستعمل ہے تو ان آیات میں جن میں یہ مذکور ہے کہ

”چاند و سورج سما میں بنائے“ اس سے آسمان مراد لینا متعین نہیں، بمعنی بلندی اور فضائے

محیط بھی ہو سکتا ہے۔ پس اگر خلائی کشتی کے مشاہدین کی بات صحیح ہے کہ چاند آسمان میں نہیں

فضا میں ہے تو وہ ان آیات کے معارض نہیں اس لیے کہ بر تقدیر صدق قائل ”سما“ سے مراد

فضائے بسیط ہوگی اور آیت کے معنی یہ ہوں گے ”پاک ہے وہ ذات! جس نے فضائے بسیط

میں بروج پیدا فرمائے، اور اس میں چاند و سورج بنائے“۔

یا ”سما“ کے معنی مطلق بلندی کے لو تو اب یہ معنی ہوئے ”پاک ہے وہ ذات! جس

نے بلندی میں بروج بنائے اور اس میں چاند و سورج پیدا فرمائے۔ بلندی کا مفہوم دونوں

صورتوں میں صادق ہے، خواہ ستارے آسمان میں ہوں، خواہ فضا میں۔

رہ گیا یہ سوال کہ آسمان ہے کہاں؟ اس سوال کی جواب دہی ہمارے ذمہ ضروری نہیں، اس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی چیز کی جگہ معلوم نہ ہونے سے اس کا عدم لازم نہیں۔ ہزاروں آدمیوں کو آپ بازاروں میں دیکھتے ہیں، پھر اپنے گھر چلے جاتے ہیں، دوسرے دن پھر آتے ہیں، آپ کو یہ معلوم نہیں کہ درمیانی زمانہ میں یہ کہاں رہے مگر پھر بھی آپ یہ یقین کرتے ہیں کہ یہ درمیانی وقفہ میں موجود تھے۔ اسی طرح اگر بالفرض یہ معلوم نہ ہو کہ آسمان کہاں ہیں، اور ہم نہ بتا سکیں تو بھی آسمان کے وجود پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن یہاں ایسا بھی نہیں نظر اوپر اٹھائیے یہ نیل گوں قبہ جسے ہم دیکھ رہے ہیں، آسمان ہے۔ ارشاد ہے:

”أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ“ (سورۃ ص: ۲۶-۱۵۶-آیت ۶)

کیا یہ آسمان کو نہیں دیکھتے۔

رہ گیا یہ ہم سے کتنی دور ہے۔ یہ اگر ہمیں نہ معلوم ہو تو اس سے بھی اس کے وجود پر کیسے شبہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمالیہ کی چوٹیاں ہم میں سے ہزاروں انسان میلوں کی دوری سے دیکھتے ہیں، مگر درمیانی مسافت کسی کو نہیں معلوم! اس سے ہمالیہ کی بلند و بالا چوٹیوں کے وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لہے میدانوں میں دور دراز کی بستی اندھیرے میں جھلکتی ہے۔ نئے رہ پیا کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ کتنی دور ہے، کیا فاصلہ نہ معلوم ہونے کی بنیاد پر کوئی دانش مند اس کے وجود سے انکار کر سکتا ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو اگر ہمیں زمین سے آسمان کے فاصلہ کی مقدار معلوم نہیں تو ہم یا کوئی عقل والا آسمان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔

ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہوا:

۱۔ چاند یا دیگر سیاروں تک پہنچ جانا عقلاً ممکن اور شرعاً واقع ہے۔

۲۔ شرعی طور پر یہ متیقن نہیں کہ چاند و سورج آسمان میں مرکوز یا جڑے ہوئے ہیں۔

۳۔ شرعی طور پر یہ قطعی ثابت نہیں کہ آسمان زمین سے کتنے فاصلے پر ہے۔

۴۔ جن آیتوں کے ظاہر سے متبادر ہوتا ہے کہ چاند و سورج ”سما“ میں ہیں۔ ان

میں سما کے معنی بلندی کے ہیں، یا فضائے بسیط کے۔

میں نے باوجود نا اہلیت کے ہزاروں سوالوں اور بحثوں کے بعد یہ مختصر سی توجیہ

ناظرین کے سامنے عرض کر دی ہے۔ علمائے اصلاح کا طالب ہوں، اور دیگر طبقے کے حضرات سے اس پر کامل غور و خوض کا۔ اس سلسلے میں ہر شبہ کے جواب کے لیے یا بصورت وضوح حق، حق قبول کرنے کے لیے حاضر ہوں۔

اس مضمون کا یہ بھی مطلب نہیں کہ میں نے خلائی باحوصلہ مسافرین کی ہر بات کو واقعی تسلیم کر لیا ہے۔ بلکہ ان میں بحث کی بہت کچھ گنجائش ہے، جس کے لیے مجھے بات بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ آئندہ خود ساری دنیا سنے گی، اور دیکھے گی۔ لیکن عام لوگ چوں کہ اس سے متاثر ہیں اور طرح طرح کے سوالات کر رہے ہیں۔ اس لیے میں نے خلائی باد پیادوں کی باتوں کو بفرض صدق مانتے ہوئے یہ کلام کیا ہے۔

لَعَلَّ اللّٰهُ يُحَدِّثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝

(حواشی)

(۱) یہ مضمون ابتدائی کاوش ہے۔ بعد میں، میں نے اسی موضوع پر ”اسلام اور چاند کا سفر“ تصنیف کی، جس میں ناقابل انکار دلائل سے ثابت کیا کہ چاند، سورج، اور جملہ ستارے آسمان کے نیچے ہیں۔ اور اس پر ہونے والے جملہ شبہات کے جوابات درج ہیں۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ ”تفسیر مدارک“ میں فلک کی تفسیر میں ہے:

عن ابن عباس ان المراد بالفلک السماء، والجمهور علی ان الفلک موج مکفوف تحت السماء تجری فیہ الشمس والقمر والنجوم.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ فلک سے مراد آسمان ہے۔ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ فلک سے مراد ”موج مکفوف“ ہے جو آسمان کے نیچے ہے، جس میں سورج، چاند اور تارے چلتے ہیں۔

جمہور اور حضرت ابن عباس کا اختلاف اس میں ہے کہ اس آیت میں فلک کا کیا معنی ہے؟ آسمان یا موج مکفوف۔ مگر وہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ چاند و سورج و ستارے آسمان کے نیچے ہیں۔

چنانچہ عینی اور فتح الباری میں اسی آیت کی تفسیر میں ان سے منقول ہے: ای
 یندورون حولہ“ یہ سب اس (آسمان) کے گرد گھومتے ہیں، اور یہ متعین کہ گرد سے مراد
 آسمان کا اوپری حصہ نہیں۔ اس لیے کہ خود انہیں حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ
 عنہم سے دوسری روایت یہ ہے:

ان الشمس والقمر وجوہہما ممایلی السماوات وظہورہما ممایلی
 الارض . (مدارک)

چاند و سورج کے چہرے آسمان کی طرف ہیں اور ان کی پیٹھ زمین کی طرف۔ یہ اسی
 وقت درست ہوگا کہ چاند و سورج آسمان کے نیچے ہوں۔
 علاوہ ازیں حسان بن عطیہ فرماتے ہیں:

الشمس والقمر والنجوم مسخرة فی فلک بین السماء والارض .
 (درمنثور: ص ۳۱۵)

سورج، چاند، ستارے، آسمان و زمین کے مابین ایک گھیرے میں مسخر ہیں۔ اسی میں
 ابن زید سے ہے کہ انہوں نے ”کل فی فلک یسجون“ کی تفسیر میں فرمایا:
 ”الفلک الذی بین السماء والارض مجاری النجوم
 والشمس والقمر“

زمین و آسمان کے درمیان وہ گھیرا ہے جو ستارے اور سورج چاند کی گزرگاہ ہے۔

ستاروں کے بارے میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

”النجوم معلقة بالقنادیل بین السماء والارض کتعلیق القنادیل فی

المساجد“ (فتح الباری: ص: ۶۸۶ . ج: ۱۳)

ستارے پہلے آسمان اور زمین کے درمیان قندیلون میں اس طرح لٹکے ہوئے ہیں

جیسے مسجدوں میں قندیلیں ہوتی ہیں۔

تفسیر کبیر میں عطا مشہور تابعی کا قول ہے:

”انہا فی قنادیل معلقة بین السماء والارض بسلاسل من النور وذلک

السلاسل فی ایدی الملائکة“ (ج: ۸. ص: ۱۳۸)

ستارے زمین و آسمان کے درمیان نورانی زنجیروں میں لٹکی ہوئی قدیلوں کے اندر ہیں اور یہ زنجیریں فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔

اور یہی مضمون حضرت ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے تفسیر عزیزی میں بھی

منقول ہے۔

یہ نصوص اس پر دلیل ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ چاند سورج اور ستارے آسمان کے نیچے ہیں۔

☆☆☆

شرح حدیث جبرئیل

حدیث جبرئیل:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ ﷺ کان یوما بارزا للناس اذا اتاہ رجل یمشی فقال یا رسول اللہ! ما الایمان؟ قال: الایمان ان تؤمن باللہ وملائکتہ ورسلہ ولقائہ وتؤمن بالبعث الآخر. قال یا رسول اللہ! ما الاسلام؟ قال: الاسلام ان تعبد اللہ ولا تشرك به شیئا وتقیم الصلوٰۃ وتؤتی الزکوٰۃ المفروضۃ وتصوم رمضان. قال یا رسول اللہ! ما الاحسان؟ قال: الاحسان ان تعبد اللہ كأنک تراه فان لم تکن تراه فانه یراک. قال یا رسول اللہ! متى الساعة؟ قال ما المسمول عنها باعلم من السائل ولكن سأحدثک عن اشراطہا: اذا ولدت المرأۃ ربثها فذاک من اشراطہا، واذا کان الحفاة العراة رؤس الناس فذاک من اشراطہا، فی خمس لا یعلمہن الا اللہ ان اللہ عنده علم الساعة وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام ثم انصرف الرجل فقال ردوا علی فاخذوا لیروا. فلم یروا شیئا فقال: هذا جبرئیل جاء لیعلم الناس دینہم. (بخاری کتاب التفسیر سورۃ لقمان ص: ۷۰۴ اول - الایمان ص: ۱۲ مسلم

ایمان ۵- ابن ماجہ مقدمہ ۹ فتن ۲۵ سنن امام احمد ۲۶۰۲)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مجمع عام میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص پیدل چلتا ہوا خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اور کہا: یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ایمان یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اس کی ملاقات پر اور قبر سے آخری بار اٹھنے پر ایمان لائے۔ اس نے کہا: یا رسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت کرے

اس طرح کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اور نماز ادا کرے، اور فرض زکوٰۃ دے، اور رمضان کا روزہ رکھے، اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ احسان کیا ہے فرمایا احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے پھر اس طرح کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے اس نے عرض کیا قیامت کب آئے گی؟ فرمایا جس سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس کی نشانیوں کو بتاتا ہوں۔ جب عورت اپنے آقا کو جنے، یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور جب ننگے پاؤں ننگے بدن رہنے والے، لوگوں کے سردار ہو جائیں، یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے (قیامت کا وقت) ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنہیں اللہ کے سوا (بے اس کے بتائے) کوئی نہیں جانتا (جیسا کہ قرآن مجید میں ہے) بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، اور بارش برساتا ہے۔ مادہ کے پیوں میں کیا ہے؟ جانتا ہے۔ پھر وہ شخص لوٹ گیا۔ آنحضرت نے فرمایا: اسے واپس لاؤ۔ لوگوں نے لوٹانے کی کوشش کی مگر (جب باہر جا کر دیکھا) تو وہ غائب تھے فرمایا: یہ جبرئیل تھے، لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے۔

تشریحات

تکمیل ۱: قرطبی نے کہا: یہ حدیث اس لائق ہے کہ اس کو ام السنۃ کہا جائے۔ اس لیے کہ یہ احادیث کے جملہ علوم کو مضمّن ہے۔ اسی لیے امام بغوی نے مصابیح اور شرح السنۃ دونوں کتابوں کو اسی حدیث سے شروع کیا، جیسے قرآن کریم سورۃ فاتحہ سے شروع کیا گیا کہ وہ ام الكتاب ہے۔ اجمالی طور سے قرآن کریم کے جملہ علوم پر مشتمل ہے۔ امام قاضی عیاض نے فرمایا کہ یہ حدیث تمام ظاہری باطنی عبادات کے وظائف پر مشتمل ہے، خواہ ایمان ہو، خواہ جوارح کے اعمال ہوں، خواہ دلوں کا اخلاص ہو، یہاں تک کہ شریعت کے کل علوم اس کی طرف راجع ہیں، اور اس سے نکلتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ہم اس مبارک حدیث کے جو مختلف حصے، مختلف صحابہ کرام یا مختلف کتابوں میں ہیں، سب کو یکجا کر کے اپنے الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

بخاری و مسلم کے علاوہ یہ حدیث بالفاظ مختلفہ کچھ زیادتی کی قدرے تقدیم و تاخیر کے ساتھ خود حضرت ابو ہریرہ، نیز حضرت عمر، حضرت انس، حضرت جریر بن عبد اللہ بخلی، حضرت ابن عباس، حضرت ابو عامر اشعری اور حضرت عبد اللہ بن عمر سے ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، مسند امام احمد بن حنبل، بزار، صحیح ابوعوانہ، طبرانی وغیرہ میں مذکور ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بغیر کسی امتیاز کے صحابہ کرام کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ اگر کوئی نا آشنا جنسی حاضر ہوتا، پہچان نہیں سکتا تھا۔ اسے پوچھنا پڑتا رسول اللہ! کون ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: اگر اجازت ہو تو ہم حضور کے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ بنا دیں، جس پر تشریف رکھیں، تاکہ اجنبیوں کو پوچھنا نہ پڑے۔ اجازت ملنے پر صحابہ نے ایک چبوترہ بنا دیا، جس پر حضور تشریف رکھا کرتے۔ اور صحابہ اس کے پہلو میں بیٹھتے۔ ایک دن مجمع عام میں حضور اسی چبوترے پر اخیر عمر پاک میں خطبہ دے رہے تھے۔ فرمایا: مجھ سے جو چاہو پوچھو۔ حاضرین پر ہیبت طاری ہو گئی، جس کی وجہ سے کوئی کچھ دریافت نہ کر سکا کہ اچانک ایک صاحب پیدل چلتے ہوئے نمودار ہوئے۔ نہایت خوبصورت، انتہائی سفید و شفاف کپڑے پہنے ہوئے، جس پر نام کو بھی میل نہ تھا۔ ان کے بدن سے بہترین خوشبو اٹھ رہی تھی، داڑھی اور بال بالکل سیاہ۔ نہ تو ان کی ہیبت مسافروں جیسی تھی۔ نہ ان پر سفر کا کوئی اثر تھا، تعجب یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی انہیں پہچانتا بھی نہ تھا۔ حاضرین نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ کر کہا ہم پہچانتے نہیں یہ کون ہیں؟

انہوں نے فرش کے کنارے پہنچ کر عرض کیا: السلام علیک یا رسول اللہ! حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے نزدیک آ جاؤں۔ فرمایا: آ جاؤ۔ کئی بار نزدیک آنے کا اذن طلب کیا۔ ہر بار اجازت ملی، وہ لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے آنحضور کے بالکل نزدیک آ کر آنحضور کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر اور اپنا ہاتھ حضور کے زانو پر رکھ کر بیٹھ گئے، اور مندرجہ ذیل سوالات کیے: یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی تمام کتابوں اور اس کے کس رسولوں جملہ نبیوں پر اور اس کی ملاقات پر اور موت پر اور قیامت کے دن قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنے پر ایمان لاؤ۔ حساب، میزان، جنت، دوزخ پر

ایمان لاؤ۔ اور تقدیر پر ایمان لاؤ کہ اس کا اچھا، برا، بیٹھا، کڑوا، سب خدا کی طرف سے ہے۔ یہ جواب سن کر اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ حاضرین کو حیرت ہوئی، سوال بھی کرتے ہیں، اور تصدیق بھی کرتے ہیں۔

پھر انہوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اس کی گواہی دو کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ اور فرض نماز پابندی کے ساتھ ادا کرو، اور فرض زکوٰۃ دو، رمضان کے روزہ رکھو، اگر بیت اللہ جانے کی استطاعت ہو تو حج کرو، عمرہ کرو، جنابت سے غسل کرو، کامل طریقے سے وضو کرو۔ اس نے عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا۔

پھر پوچھا یا رسول اللہ! احسان کے بارے میں بتائیے؟ فرمایا: احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو، اس طرح اس کی خشیت رکھو گویا اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

انہوں نے عرض کیا: آپ نے سچ فرمایا۔

پھر دریافت کیا: قیامت کب آئے گی؟ اس سوال پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے گردن جھکالی، کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ انہوں نے تین بار یہی سوال دہرایا، تو سراقہ اسے اٹھا کر فرمایا:

قیامت کے بارے میں جس سے سوال کیا گیا وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔

اس کے بعد انہوں نے قیامت کی نشانیاں پوچھیں۔ یا یہ کہ آنحضرت نے از خود فرمایا: میں تمہیں قیامت کی کچھ نشانیاں بتاتا ہوں۔ فرمایا: قیامت کی نشانیاں یہ ہیں کہ باندی اپنے آقا کو جنے گی، ننگے پاؤں، ننگے بدن رہنے والے، گونگے، بہرے حکومت کریں گے۔ بھیک منگے، بکریوں کالے اونٹوں کے چرواہے محلوں میں فخر کریں گے۔

قیامت کب آئے گی، یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ پھر آنحضرت نے سورہ لقمان کی یہ اخیر آیت تلاوت فرمائی۔

ترجمہ: اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے، وہ بارش برساتا ہے، اور ماؤں کے پیٹ میں

کیا ہے، جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا، کل کیا کمائے گا، کسی کو نہیں معلوم کہ کہاں مرے گا، اس میں کوئی شک نہیں، اللہ جاننے والا بتانے والا ہے۔

اس کے بعد یہ شخص چلے گئے، جب چلے گئے، تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انہیں واپس لاؤ۔ صحابہ کرام نے ہر طرف تلاش کیا مگر وہ نہیں ملے۔ اب حضور نے فرمایا۔ تم لوگ جانتے ہو، یہ کون تھے؟ یہ جبرئیل تھے، تم لوگوں نے اس وقت کچھ نہیں پوچھا یہ تو آئے تھے کہ تم کو تمہارا دین سکھائیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، جب بھی جبرئیل آئے میں نے پہچان لیا مگر اب کی بار نہ پہچان سکا۔ یہ واپس ہونے کے لیے جب مڑ چکے تھے جب پہچانا۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ تین دن کے بعد حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے ملاقات کی اور دریافت فرمایا۔ تمہیں معلوم ہے وہ سائل کون تھے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں۔ فرمایا: وہ جبرئیل تھے، تمہیں دین سکھانے آئے تھے۔

نکات ۲: بخاری میں جتنا حدیث کا متن ہے۔ اس پر وارد بہت سے شبہات اس حدیث کے متفرق متون کو جمع کر دینے سے دور ہو گئے۔ اسی سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ روایتوں میں جو تقدیم و تاخیر کی زیادتی ہے، وہ راویوں کی طرف سے ہے کہ انہوں نے اپنی یادداشت یا ضرورت کے مطابق ذکر کیا۔

اب چند ضروری گوشوں کی توضیح باقی رہ گئی ہے، وہ حاضر ہے۔

(الف) جبرئیل اس خاص بیت کے ساتھ اجنبی بن کر کیوں حاضر ہوئے؟ مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگوں کو اس بات سے روک دیا گیا تھا کہ ہم لوگ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوالات کریں۔ اس لیے ہم لوگوں کی خواہش رہتی تھی کہ کوئی ذہین دیہاتی آکر کچھ پوچھے اور ہم سنیں۔ اسی حدیث کا ابتدائی حصہ یہ ہے کہ اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اذن دے دیا تھا جو پوچھنا چاہو پوچھو مگر بیت کی وجہ سے کوئی کچھ نہ پوچھ سکا۔ اس لیے جبرئیل امین اجنبی بن کر حاضر ہوئے، تاکہ صحابہ یہی سمجھیں کہ یہ کوئی دیہاتی ہیں۔ اگر صحابہ کرام کو یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ جبرئیل ہیں، تو

اس کا امکان تھا کہ صحابہ پر ان کی ہیبت طاری ہو جاتی۔ یا ہو سکتا تھا ان کی زیارت میں انہماک ہو جاتا اور ان کے سوالات و جوابات کو کما حقہ مستحضر نہ رکھ پاتے۔

(ب) بچھونے کے کنارے کھڑے ہو کر سلام کرنے کے بعد بار بار نزدیک آنے کا اذن مانگنا اس لیے تھا کہ تمام حاضرین ان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ نیز یہ بتانا تھا کہ بزرگوں کے بہت نزدیک بلا ان کی اجازت نہیں ہونا چاہئے، خصوصاً جب مجلس بھری ہو۔

(ج) گردنیں پھلانگتے اس لیے آئے کہ ہو سکتا ہے کہ بغیر اس کے قریب آنا ممکن نہ ہو نیز یہ بدویانہ طریقہ اس لیے اختیار کیا کہ لوگ یہی سمجھیں کہ واقعی یہ کوئی بدوی ہیں۔

(د) گھٹنے سے گھٹنے ملا کر، زانوے اقدس پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے۔ یہ بتانے کے لیے کہ تلمیذ و استاذ میں جتنی موانست ہوگی، قرب ہوگا، اتنا ہی زیادہ فیض ہوگا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فوضع یدہ علیٰ فخذیہ.

اس میں ید یہ کی ضمیر کا مرجع متعین ہے کہ رجل ہے۔ البتہ فخذ یہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مرجع حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوں، تو وہ معنی ہوں گے کہ جو ہم نے بیان کیا۔ دوسرے یہ کہ اس کا مرجع بھی رجل ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ آنے والے نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے زانو پر رکھے۔ اس میں ادب زیادہ ہے، اور پہلے میں یگانگت کا بہت زیادہ اظہار نیز بدویت کا بھی۔ ہم نے پہلی شق اس لیے اختیار کی کہ سلیمان تیمی کی روایت میں یہ تصریح ہے:

وضع یدہ علیٰ رکتی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

ایک روایت دوسری کی تفسیر ہوتی ہے۔ نیز بغوی اور اسماعیل تیمی نے اسی پر جزم فرمایا۔ اور طیبی نے اسی کو ترجیح دی۔

(ہ) سفید شفاف بے داغ لباس پہن کر حاضر ہوئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ تلمیذ کو

استاذ کے سامنے اس طرح حاضر ہونا چاہئے کہ اس کا ذہن پندار کے داغ سے ملوث نہ ہو۔

(و) سیاہ بال جوانی کی نشانی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ طلب علم کا بہترین زمانہ

جوانی ہے۔

(ز) انتہائی خوبصورت بہترین خوشبو کے ساتھ آنے میں تلقین ہے کہ تلمیذ کو استاذ کے حضور اچھی ہیئت میں حاضر ہونا چاہئے، جس سے اس کی طرف میلان قلب ہو۔ ایسی ہیئت میں نہ حاضر ہو کہ اسے تکذریا نفرت ہو۔

۳۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالملائکہ وایمان بالکتب کی تشریح:

ہر مسلمان جانتا ہے۔ اور اس کی تفصیل کتاب میں متعدد جگہ آئے گی۔ تو صیح طلب باتیں تین ہیں۔ موت پر ایمان، اور اس کی ملاقات پر ایمان اور بعثت آخر پر ایمان۔ (الف) موت ایسی چیز ہے کہ اس کا سبھی کو یقین ہے، پھر اس پر خصوصیت سے ایمان لانے کا ذکر غالباً اس بنا پر ہے کہ موت کا یقین سب کو ضرور ہے مگر اس سے غفلت بھی عام ہے۔ مراد یہ ہے کہ موت سے غفلت نہ برتی جائے، اسے یاد رکھا جائے یا اس سے پوری دنیا کا کلیۃً فنا ہو جانا مراد ہے۔

(ب) بعثت سے مراد، قیامت کے دن قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنا ہے، اور یہ بہر حال آخر ہے۔ اب آخر صرف توضیح و تاکید کے لیے ہے۔ جیسے کہتے ہیں: کاس الذاہب“ حالاں کہ اس کا معنی ہے کل گذشتہ کے، یا اس بنا پر کہ بعثت دو ہیں۔ ایک عدم سے وجود میں آنا، یا ماں کے پیٹ سے دنیا میں آنا۔ دوسرے قیامت کے دن۔ یہ دوسرا پہلے کی بہ نسبت آخر ہوا۔ (ج) یوم آخر سے مراد قیامت ہے۔ اس کو یوم آخر پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن جو احوال و احوال اور معاملات پیش آئیں گے، ان سب پر ایمان لانا، مثلاً حساب کتاب، وزن اعمال، پل صراط پر گزر، جنت و دوزخ، جیسا کہ حضرت ابن عباس کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے۔

(د) اللہ کی ملاقات سے مراد یہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں حاضری ضروری ہے۔ یا یہ کہ اس کی رویت مراد ہے کہ مومنین کو اس کی زیارت ہوگی۔ جیسا کہ اس کے بارے میں احادیث مشہورہ وارد ہیں۔ یہ اگرچہ یوم آخر کے احوال میں داخل ہے۔ مگر اہمیت کی وجہ سے اس کو علاحدہ بھی ذکر کیا۔

۴۔ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔
لیکن یہ کلیۃً صحیح نہیں۔ یہاں جن امور کو اسلام بتایا، وفد عبد القیس کی حدیث میں انہیں
کو ایمان بتایا۔

نیز قرآن مجید میں ہے:

فَاخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِنَ
الْمُسْلِمِينَ. (ذُرِّيَّتْ: آیت ۲۶، ۲۵)

اس بستی میں جتنے مومن تھے، ہم نے سب کو باہر کیا، ہم نے اس بستی میں صرف ایک
گھر مسلمان کا پایا۔

یہاں حضرت لوط علیہ السلام کے گھر والوں کو مومن بھی فرمایا، اور مسلمان بھی۔ اس
سے ظاہر کہ مومن اور مسلمان مرادف ہیں، تو ثابت ہوا کہ ایمان اور اسلام بھی مرادف ہیں۔
لیکن اس حدیث جبرئیل اور دیگر احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام
متغائر ہیں۔ نیز قرآن مجید ہی میں ہے:

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا. قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ
الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (حجرات: آیت ۱۴)

گنواروں نے کہا، ہم ایمان لے آئے، آپ فرمادو! ایمان نہیں لائے۔ ہاں یہ کہو، ہم
تابع ہو گئے، ابھی تمہارے دلوں میں ایمان کہاں داخل ہوا۔

اس آیت میں ایمان کی نفی کر کے، اسلام کا اثبات ہے۔ اس سے ظاہر کہ ایمان اور
اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوا کہ
اطلاق میں کہیں کہیں تغایر کی بو آتی ہے، ورنہ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔

ہم نے نزہۃ القاری کتاب الایمان کی ابتدا میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایمان، تصدیق
اور اقرار باللسان دونوں کا نام ہے، ایمان کے لغوی معنی تصدیق کے ہیں۔ اور اسلام کے لغوی
معنی تابع دار ہونے کے ہیں۔ شرع میں اسلام کے معنی ہیں، اس دین کا پابند ہونا جو خدا کی
طرف سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لائے، ظاہر ہے کہ انسان کسی دین کا پابند اسی

وقت ہوگا جب اس کے اصول کو سچ جانے اور اس کے صحیح ہونے کا اقرار کرے۔ اور یہی جاننا ایمان ہے، اور جب انسان کسی کے اصول کو سچ جان لے گا، اور اس کا اقرار بھی کر لے گا تو اس کا پابند بھی ہوگا۔ لہذا ایمان و اسلام ایک ہوئے۔

ہاں! اطلاق میں کہیں کہیں اسلام ظاہری اعمال کی ادائیگی پر بولا گیا ہے۔ اس لحاظ سے فرق صرف اعتباری ہوگا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں۔ حدیث جبرئیل اور سورہ حجرات کی اس آیت میں یہی اطلاق ہے، ورنہ حدیث جبرئیل کا اخیر اس کا رد ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سب کو دین فرمایا جس میں ایمان بھی داخل ہے، اور خود قرآن مجید میں ہے:

مَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۖ (آل عمران : آیت ۸۵)

جو اسلام کے سوا کسی دین کو قبول کرے اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور ارشاد ہوا۔

وَرَضِيَ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا ۖ (ماندہ: آیت ۳)

اور تمہارے لیے دین اسلام کو میں نے پسند کیا۔

ان آیات میں صرف اسلام کو دین بتایا۔ کیا ایمان دین سے خارج ہے؟ اگر اس کا جواب نئی میں ہے، اور ضرور نئی میں ہے، تو ثابت کہ ایمان اور اسلام دو متضاد چیزیں نہیں۔ مسلمانوں کے عرف میں بولتے ہیں: فلاں ایمان لایا۔ یا بولتے ہیں فلاں اسلام لایا۔ دونوں کے معنی بلا کسی دغدغہ کے ایک ہیں۔ ہاں! اطلاق کے اعتبار سے شریعت میں اس کے مابین عموم خصوص مطلق کی نسبت ہوگی۔ ایمان اور اسلام دونوں کا ایک مفہوم پر اطلاق جیسے وفد عبد القیس والی حدیث میں۔ اور سورہ ذریت کی مذکورہ آیت میں۔ اور اسلام کا اور ایمان کا الگ الگ معنوں میں اطلاق جیسے سورہ حجرات کی آیت میں۔

تقدیر: کا مطلب یہ ہے کہ ہر بھلائی برائی اللہ عزوجل نے اپنے علم ازلی کے موافق مقدر کر دی ہے، جو بات جیسے ہونے والی تھی، اور جو شخص جو کچھ کرنے والا تھا، اللہ عزوجل اسے ازل سے جانتا تھا، اسی کے مطابق لکھ لیا۔ اب اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، محال ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ عزوجل نے لوگوں کے احوال جانے بغیر جو چاہا لکھ دیا۔ اور اب ہم اس

لکھنے کی وجہ سے ویسا ہی کرنے پر مجبور ہیں۔ بلکہ مثلاً زید کے ذمے برائی لکھی، اس لیے کہ اللہ عزوجل کو معلوم تھا کہ برائی کرے گا اگر زید بھلائی کرنے والا ہوتا تو اس کے ذمے بھلائی لکھتا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اللہ عزوجل نے انسان کو جمادات پتھر کنکر کی طرح بے حس و حرکت بے اختیار نہیں بنایا۔ بلکہ ایک نوع اختیار بھی دیا ہے کہ کسی کام کو چاہے تو کرے۔ چاہے تو نہ کرے۔ اسی کے ساتھ عقل بھی دی کہ وہ بھلے برے، نفع نقصان کو پہچان سکے۔ اور ہر قسم کے سامان و اسباب مہیا فرمادئے کہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ان اسباب سے کام لے۔ اسی اختیار پر مواخذہ ہے، اپنے آپ کو جمادات کی طرح مجبور محض سمجھنا یا بالکل مختار سمجھتا دونوں گمراہی ہے۔

تقدیر کے منکرین کو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس امت کا مجوس فرمایا۔ وجہ شبہہ یہ ہے کہ مجوس دو خالق مانتے ہیں۔ خالق خیر و ادا، خالق شر و ہرمن۔ اور قدریہ یعنی تقدیر کے منکرین، وہ انسان کو اپنے افعال کا خالق مانتے ہیں۔ انہوں نے دو ہی نہیں کروڑوں خالق مانے۔

تقدیر و قضا، ہم معنی ہیں۔ قضا کی تین قسمیں ہیں۔ مبرم حقیقی، جو علم الہی میں کسی چیز پر معلق نہیں۔ معلق محض، ملائکہ کے صحیفوں میں جس کا معلق ہونا ظاہر فرمادیا گیا ہو۔ معلق شبہہ مبرم، صحف ملائکہ میں جس کی تعلیق مذکور نہیں۔ مگر وہ علم الہی میں معلق ہے۔

مبرم حقیقی کی تبدیلی محال ہے۔ اگر محبوبان بارگاہ اس بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں تو انہیں اس سے روک دیا جاتا ہے۔ مثلاً فرشتے قوم لوط پر عذاب لے کر آئے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باں قرب و اختصاص بہت کچھ عرض و معروض کی، یہاں تک کہ ان کی عرض کو قرآن کریم نے مجادلے سے تعبیر فرمایا۔ ارشاد ہے:

يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ۝ (سورہ: آیت ۷۴)

ابراہیم ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگا۔

مگر چوں کہ یہ عذاب مبرم حقیقی تھا، اس لیے نہ رُکا۔

قضائے معلق اولیائے کرام کی دعاؤں، ان کی توجہ اور اعمال حسنہ سے نل جاتی ہے۔

معلق شبہہ مبرم تک عامہ اولیائے کرام کی رسائی نہیں۔ اکابر کی ہے۔ جو ان کی دعا

اور توجہ سے ٹل جاتی ہے۔

حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی کو فرمایا ہے:

”إِنِّي أَرُدُّ الْقَضَاءَ بَعْدَ مَا أُبْرِمَ“

میں قضائے مبرم کو بدل دیتا ہوں۔

اور اسی کو حدیث میں فرمایا گیا:

إِنَّ الدُّعَاءَ يَرُدُّ الْقَضَاءَ بَعْدَ مَا أُبْرِمَ

دعا قضائے مبرم کو ٹال دیتی ہے۔

تقدیر کے مسائل عقول متوسطہ کی دسترس سے باہر ہیں۔ ماوشما کس گنتی میں۔ حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم کو اس میں بحث کرنے سے روک دیا گیا۔ اس میں زیادہ غور و خوض، بحث و تمحیص بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ استدلالی نہیں، صرف کشفی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ مسئلہ جتنا ہی دقیق اور عام عقول کی دسترس سے بالاتر ہے، اتنا ہی لوگ اس میں کرید کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے عام فہم سے قریب کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو کہا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے: ہم چلتے ہیں، پھرتے ہیں، اٹھتے ہیں، بیٹھتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، زندگی کے روزمرہ معمولات میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ ہم اپنے ارادے اور اختیار سے کرتے ہیں، ہم جو چاہتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، جو نہیں چاہتے، نہیں کھاتے پیتے ہیں، ہم جہاں چاہتے ہیں، جاتے ہیں، اور جہاں نہیں چاہتے ہیں نہیں جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف رعشے کی بیماری والا ہے کہ وہ لاکھ چاہے کہ اس کا سر اور اس کا ہاتھ، اس کا پاؤں نہ ہلے، مگر وہ روک نہیں سکتا۔ فالج زدہ، مفلوج عضو کو لاکھ چاہے، حرکت نہیں دے سکتا۔ اس کے برخلاف ایک تندرست انسان جب چاہے، جس عضو کو چاہے حرکت دے سکتا ہے، حرکت سے روک سکتا ہے، تندرست کی حرکات و سکنات، رعشہ اور فالج زدہ کی طرح بے اختیاری نہیں، مگر اس اختیار کے باوجود روزمرہ ایسا ہوتا رہتا ہے کہ ایک انسان کسی چیز کو کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے لاکھ جتن کرتا ہے، سب تدبیریں کر ڈالتا ہے، مگر وہ اس میں

کامیاب نہیں ہوتا۔ اس سے سمجھ میں آیا کہ ہمیں اختیار بھی ہے، قدرت بھی ہے، مگر بالکل یہ نہیں۔ ہمارا اختیار ہماری قدرت کسی اور قدرت والے اختیار والے کے ماتحت ہے، یہی تقدیر ہے۔

۵۔ احسان:

باب افعال کا مصدر ہے۔ اس کا مادہ ”حسن“ ہے، جب اس کا مفعول بغیر حرف جر کے آتا ہے تو اس کے معنی اچھا کرنے کے آتے ہیں، اور جب ’الی‘ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو نفع پہنچانے کے یہاں پہلا معنی مراد ہے، عبادت کے اندر احسان کیا ہے۔ اسے یوں فرمایا:

ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك.

اللہ کی یوں عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس تقدیر پر مطلب یہ ہوگا کہ تم عبادت میں یہ تصور رکھو گویا کہ اللہ عزوجل کو تم دیکھ رہے ہو۔ کیوں کہ تم اسے نہیں دیکھتے اور نہ دیکھ سکتے ہو مگر وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، اسی کو دوسری حدیث میں یوں بیان فرمایا:

اعبد ربك في جميع الاحوال كعبادتك في حال العيان.

ہر حالت میں اپنے رب کی یوں عبادت کرو جیسے حالت مشاہدہ میں کرتے ہو۔

اس تقدیر پر احسان کا صرف ایک درجہ ہوا، وہ یہ کہ اللہ کی عبادت یوں کریں، گویا ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو سکے تو یوں عبادت کرو کہ تم کو وہ دیکھ رہا ہے۔

اب احسان کے دو درجے ہوئے۔ ایک یہ کہ عبادت کے وقت یہ خیال جمار ہے کہ اللہ عزوجل کو ہم دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ نہ ہو سکے تو یہ خیال جمائے کہ وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب بندے کو یہ حضور حاصل ہو کہ اللہ عزوجل ہم کو ہمارے ظاہر و باطن

کو دیکھ رہا ہے تو پھر نہ کوئی اطاعت چھوٹے گی، نہ اس کے آداب و شرائط میں کوئی کمی ہوگی، اور نہ کوئی گناہ پر جرأت ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مالک دروازے پر بیٹھا ہوا نوکروں سے کام لے رہا ہے، نوکر اپنے کام میں لگے ہیں، مالک کو نہیں دیکھتے مگر یہ جانتے ہیں کہ مالک ہم کو دیکھ رہا ہے تو کام میں نہ کمی کریں گے نہ قصداً کام بگاڑیں گے۔ بخلاف اس کے کہ مالک موجود نہ ہو۔

لیکن اگر دربار شاہی میں کوئی شہنشاہ کے روبرو موجود ہو، شہنشاہ کے چہرے پر اس کی نظر ہو تو اس کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کیا وہاں حکم عدولی کی جرأت ہوگی؟ تعمیل حکم میں تاخیر کی مجال ہوگی؟ کیا آداب دربار کی خلاف ورزی ہوگی؟ کیا کوئی اپنے کو لایعنی باتوں میں مشغول رکھے گا؟ خصوصاً جب کہ شہنشاہ ایسا ہو جس پر ظاہر و باطن سب منکشف ہو۔ آنکھوں کی چوری سے لے کر سینے کے اندر تک مطلع ہو، دل کی دھڑکنوں کے ساتھ خطرات بھی اس سے پوشیدہ نہ ہوں، عہد اتو بہت دور ہے کیا دل میں بغاوت، سرکشی، حکم عدولی کا وہم بھی آسکے گا؟

اور سوچو! جب کہ شہنشاہ مالک حقیقی ذوالجلال والجبروت ہو اور اس کے ساتھ حسن و جمال میں بھی لاشریک نہ ہو تو حاضر باش کا کیا حال ہوگا۔ ع
ذوق ایسی می نہ شناسی بخدا تانا پشی

یہ حضو اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ان جوامع کلم میں سے ہے کہ اس کی تشریح سے دفتر کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ یہی تصوف کی اصل ہے جس کی شرح میں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، اور ہزاروں لکھی جائیں گی، اور جو لکھی گئیں یا جو لکھی جائیں گی، وہ ایک قطرہ بھی اس بحرناپید کنار کا نہیں۔

ان سب کی تفصیل یہ ہے کہ ایمان اصل الاصول ہے، اس کی فرع اعمال ہیں، اعمال کی ادائیگی کے اعتبار سے تین درجے ہیں:

اول: حسب تفصیل فقہ، شرائط کے ساتھ ارکان ادا کر لیے جائیں۔ اس سے آدمی فرض سے سبک دوش ہو جاتا ہے۔ یہ عوام کے لیے ہے۔
دوم: عبادت میں کم از کم یہ تصور ہو کہ معبود ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ خواص کا مقام ہے۔

سوم: عبادت میں یہ حضور شہود ہو، گویا عابد، معبود کو دیکھ رہا ہے۔ یہ انخص الخواص کا

مقام ہے۔

عمارہ بن قیقاع کی روایت اور حضرت انس کی حدیث میں ”ان تعبد اللہ“ کے بجائے ان شخصی اللہ ہے۔ اب احسان سے مراد عبادت کا احسان نہیں ہوگا۔ بلکہ اسلام کا احسان ہوگا۔ اب سوال یہ ہوا کہ اسلام کا احسان کیا ہے؟ جواب ارشاد ہوا:

اللہ سے یوں ڈرتے رہو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو یوں ڈرتے رہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

یہاں شخصی اللہ کا مفعول فیہ محذوف ہے، جو عموم کا افادہ کرتا ہے کہ ہر وقت اللہ سے ان دونوں تصور میں سے ایک کے ساتھ ڈرتے رہو۔ خواہ حالت عبادت میں ہو، خواہ کسی حالت میں۔ یہ دوام اپنے دونوں مدارج میں سے کسی ایک درجے میں جسے بھی نصیب ہو جائے اس کے مدارج کا اندازہ کون لگا سکے گا۔ ”والله يختص برحمته من يشاء، والله ذو الفضل العظيم“

کأنک تراہ: میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں بیداری کے ساتھ چشم سر سے دیدار الہی ممکن نہیں، ورنہ ”کأنک تراہ“ نہ فرماتے۔ بلکہ یہ فرماتے: یوں عبادت کرو کہ اسے دیکھو۔ اس پر یہ حدیث دلیل ہے کہ فرمایا:

واعلموا انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا

جان لو! موت سے پہلے اپنے رب کا دیدار ہرگز نہ کرو گے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دیدار الہی کرنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ یہ احادیث اس کے لیے تخصیص ہیں۔ رہ گیا خواب میں، وہ صحابہ کرام، اولیاء کرام کے لیے بھی حاصل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا:

”رأیت ربی فی سبک المدینة“

میں نے اپنے رب کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا۔

اس سے مراد یہی خواب میں دیکھنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مدینے کی گلیوں میں رہتے ہوئے میں نے رب کا جلوہ دیکھا۔

حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سو مرتبہ، اور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متعدد بار خواب میں زیارت ہوئی۔

۶۔ عبادت کے معنی:

قاضی بیضاوی علامہ نسفی وغیرہ مفسرین نے عبادت کے یہ معنی بتائے ہیں:

اقصى غاية الخضوع والتذلل.

کسی کے لیے انتہائی حد تک عاجزی و فروتنی کرنا۔

اقصى غایت تذلل عبادت اور اس سے کم درجہ تعظیم ہے، اقصى غایت کی حد کیا ہے؟ اس کا دارو مدار نیت پر ہے۔ اس کی قدرے توضیح یہ ہے کہ انسان مختلف اشخاص و ہستی کے سامنے تذلل ظاہر کرتا ہے، مثلاً چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے سامنے، بیٹا باپ کے سامنے، شاگرد استاذ کے سامنے، مرید شیخ کے سامنے، امتی نبی کے روبرو، اور ایک عابد معبود کے حضور۔

ہر شخص پر ظاہر ہے کہ تذلل کے یہ سب مدارج یکساں نہیں۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ اقصى غایت تذلل عبادت، اس سے فروتر تعظیم جیسا کہ ہم پہلے بتا آئے کہ اس کا دارو مدار نیت پر ہے۔ کسی ہستی کو واجب الوجود اعتقاد کر کے یا واجب الوجود کے خواص و لوازم میں سے کسی ہستی کے لیے ثابت مان کر یا کائنات عالم کی تدبیر میں کسی کے لیے ایسا دخل ماننا کہ اس کے بغیر نظام نہیں چل سکتا یا نفع و ضرر پہنچانے یا تخلیق و ایجاد میں کسی کو مستقل بالذات ماننا اس معنی کر کہ وہ بے اذن الہی کے جو چاہے کرے یا تحلیل و تحریم کا اختیار مستقل ماننا یا کسی کی ذات و صفات کو ذاتی مان کر تذلل کرنا غایت تعظیم اور عبادت ہے، اور ان مذکورہ تصورات کے بغیر کسی کے لیے تذلل کرنا عبادت نہیں۔

اور صحیح بات تو یہ ہے کہ عبادت اور تعظیم کی حد فاصل ہر عاقل جانتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے الفاظ کا جامہ پہنانا ذرا مشکل ہے۔ سجدہ ایک فعل ہے، دوزانو بیٹھنا ایک فعل

ہے، یہی کبھی عبادت ہے، کبھی تعظیم۔ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ماں باپ اور بھائیوں نے جو سجدہ کیا یہ تعظیم تھا، اور نماز کا سجدہ عبادت۔ جبرئیل امین خدمت اقدس میں باادب تکیذ کی طرح دو زانو بیٹھے یہ تعظیم، اور قعدہ میں عبادت، روضہ اقدس کی حاضری کے وقت دست بستہ کھڑا ہونا تعظیم، اور نماز میں عبادت۔ ہر عام حالات میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑے رہتے ہیں یہ نہ تعظیم ہے نہ عبادت۔ اور کسی مقتدائے دینی کے لیے کھڑے ہو گئے یا اس کے سامنے کھڑے ہیں، تو یہ تعظیم اور مالکیہ کے یہاں مطلقاً نماز میں اور احتیاف و شوافع کے یہاں رکوع کے بعد سجدے سے پہلے کھڑا ہونا عبادت۔

اس لیے ماننا پڑے گا کہ تعظیم و غیرہ عبادت اور غیر عبادت میں سب کو امتیاز آتا ہے۔ البتہ الفاظ کے قالب میں اسے ڈھالنا ذرا معذرت ہے، اور یہ صرف عبادت اور تعظیم ہی کی بات نہیں، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو سب جانتے ہیں مگر اس کی تعریف پوچھو تو کم ہی لوگ بتا پائیں گے۔ مکان و زمان، حرکت سکون کون نہیں جانتا؟ مگر ذرا اس کی تعریف پوچھ کر دیکھو، اور ان کی جو تعریفیں کی جاتی ہیں۔ کتنی آسان ہیں، وہ فلسفے کے محکم اور معلم سے پوچھو۔ آج کل کچھ لوگوں نے عبادت کی تعریف یہ گڑھ لی ہے کسی کو مافوق الفطرت قوت کا مالک، اعتقاد کر کے اس کی قربت و نزدیکی حاصل کرنے کے لئے کوئی کام کرنا۔ یہ تعریف نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں، نہ صحابہ سے منقول ہے، نہ علمائے سلف سے، نہ علمائے خلف سے۔ انعامی اعلان کے باوجود آج تک نہیں بتایا گیا، اور نہ قیامت تک کوئی بتا سکتا ہے۔ اور بدہمت باطل ہے۔ ورنہ لازم کہ ساری امت ہی نہیں، انبیائے کرام، خود اللہ عزوجل، مشرک ہو، وہ یوں کہ نص قرآنی ثابت کہ انبیائے کرام میں فوق الفطرت قوتیں تھیں بلکہ یہ بھی ثابت کہ امتوں میں بھی تھیں۔ حضرت داؤد کے ہاتھ میں لوہے کا نرم ہونا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے وحوش و طیور و جنات کا تابع ہونا، ہوا کا ان کے قابو میں ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا اور عصا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مٹی کی مورت میں جان ڈالنا، اور مادر زاد اندھے اور برص والے کو شفا دینا، مردے جلانا، حضرت آصف بن برخیا کا سیکڑوں میل کی دوری سے بلقیس کا منوں وزنی تخت پلک جھپکنے کے اندر لانے کی قوت، یہ سب مافوق الفطرت

قوتیں ہی تو ہیں، پھر یہ تعریف بالجمول، فوق الفطرة کی تحدید کیا ہے، اس کو کوئی صاحب متعین کر دیں، اور تعریف بالجمول تجہیل محض و باطل۔ اس لئے یہ تعریف من گڑھت ہونے کے ساتھ ساتھ لایعنی بلکہ منجر الی الکفر ہے۔

۷۔ ما المسئول عنها باعلم من المسائل:

قیامت کے بارے میں جس سے سوال کیا گیا وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔ یہاں نفی اسم تفصیل پر داخل ہوئی، جو صرف معنی تفصیل کی نفی کرتی ہے، بالکل مشق منہ کی نفی نہیں کرتی۔ جس کا مفاد یہ ہوا کہ قیامت کے بارے میں، میں تم سے زیادہ نہیں جانتا جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ قیامت کے بارے میں جتنا تم جانتے ہو اتنا میں بھی جانتا ہوں، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قیامت کا علم نہ تجھے ہے، نہ مجھے، بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے علم میں ہم اور تم برابر ہیں۔ اس قدر پر علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ بدرالدین عینی دونوں شارحین کا اتفاق ہے کہ یہ تساوی فی العلم پر دلالت کرتا ہے۔

یعنی میں ہے:

مشعرة بوقوع الاشتراك في العلم، والنفي توجه الى الزيادة فيلزم ان يكون معناه انهما متساويان في العلم به. (ص: ۲۹۳ ج: ۱)

یہ علم میں اشتراک کو بتا رہا ہے، اور نفی زیادت کی طرف متوجہ ہے، اس لئے لازم ہے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ دونوں اس کو جاننے میں برابر ہیں کہ قیامت کب آئے گی۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا۔ قیامت کب آئے گی، یہ جبرئیل بھی جانتے تھے، اور حضور اقدس ﷺ بھی جانتے تھے، اس پر قرینہ قویہ ہی نہیں بلکہ بڑی مضبوط دلیل ابو فردہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں:

فنكس فلم يجبه ثم اعاد فلم يجبه ثلاثا ثم رفع راسه وقال ما المسئول عنها. الحديث (فتح الباری: ۱/۱۱۲. عینی: ۱/۲۸۳)

اس سوال پر حضور نے سر جھکا لیا کوئی جواب نہیں دیا، تین بار یہی ہوا، تو سر اقدس اٹھایا، اور فرمایا: مسئول عنها سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔

اگر حضور اقدس ﷺ کو قیامت کا علم نہ تھا، اور اس جملے کا یہی مطلب ہے کہ تمہاری طرح میں بھی نہیں جانتا تو دیگر سوالات کے جوابوں کی طرح بلا توقف کیوں نہیں فرمادیا۔ اتنے غور کی کیا حاجت تھی کہ انہیں تین بار سوال دہرانا پڑا۔ بات صاف ہے کہ اگر بالکل نہ جانتے ہوتے تو بلا توقف فرمادیا ہوتا، لیکن بات یہ نہیں، جانتے تھے مگر بتانے کی اجازت نہ تھی تو اگر فرماتے کہ میں نہیں بتاؤں گا تو جو اس سوال سے مقصود تھا وہ حاصل نہ ہوتا۔ اور اگر فرماتے کہ میں نہیں جانتا تو جھوٹ ہوتا، اس لئے غور فرما کر ایسا جواب دیا کہ نکتہ شناس سمجھ جائیں اور راز، راز رہے۔

اس سوال کی وجہ علامہ قرطبی نے یہ بتائی ہے:

المقصود من هذا السؤال كف السامعين عن السؤال عن وقت الساعة لانهم كانوا اقلوا اكثر ووالسؤال عنها فلما حصل الجواب بما ذكر حصل الياس من معرفتها. (عینی: ج. ۱ ص ۲۹۱)

اس سے مقصود سامعین کو قیامت کے وقت کے بارے میں سوال سے روکنا تھا کیوں کہ اکثر لوگ اس کے بارے میں سوال کرتے تھے، جب یہ جواب مل گیا تو سامعین کو اس کے جاننے سے مایوسی ہوگئی۔

اور اگر بالفرض یہی مراد لے لیا جائے کہ نہ جاننے میں مساوات مراد ہے، تو اس حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ اس وقت نہیں جانتے تھے، یہ اہل سنت کے عقیدے کے معارض نہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ نزول قرآن کی تکمیل کے ساتھ جمیع ماکان و مایکون حتیٰ کی غیوب ختمہ کا بھی علم آپ کو عطا فرمایا گیا۔ اس لئے تکمیل قرآن کے پہلے اگر کچھ غیوب آپ پر مخفی رہے تو یہ اس عقیدے کے معارض نہیں، اس پر کوئی دلیل نہیں کہ یہ حدیث تکمیل قرآن کے بعد کی ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ علم غیب کے سلسلے میں دو مرتبے ہیں: ایک یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ غیب جانتے تھے یعنی قدر معتد بہ۔ یہ ابتداء ہی سے ہے۔ اس لئے کہ نبی کے معنی ہیں غیب کی خبر دینے والے کے۔ المنجد میں ہے:

النبوة الاخبار عن الغيب او المستقبل بالهام الله . النبي المخبر عن الغيب او المستقبل بالهام الله . (المنجد ۷۸۴)

اس کے ترجمے مصباح اللغات میں ہے، جو ایک فاضل دیوبند ہی کا ہے، اللہ کے الہام سے غیب کی خبریں بتانے والا، آئندہ کی پیش گوئی کرنے والا۔ علاوہ ازیں نبی کے خواص لازمہ میں غیب دانی ہے۔

علامہ عبدالباقی زرقانی علی المواہب میں لکھتے ہیں:

قال الغزالي: النبوة عبارة عما يختص بالبي و يفارق به غيره و هو يختص بانواع من الخواص ، احدها: انه يعرف حقائق الامور المتعلقة بالله و صفاته و ملائكته و الدار الآخرة علما مخالفا لعلم غيره بكثرة المعلومات و زيادة الكشف و التحقيق . و ثانيها: ان له في نفسه صفة بهائم الافعال الخارقة للعادة كما ان لنا صفة تتم بها الحركات المقرونة بإرادتنا و هي القدرة . و ثالثها: ان له صفة بها يبصر الملائكة و يشاهدهم كما ان للبصير صفة بها يفارق الاعمى . رابعها: ان له صفة بها يدرك ما سيكون في الغيب . (۱۹/۲۰/۱)

نبوت وہ وصف ہے جو نبی کے ساتھ خاص ہے جس کی وجہ سے غیر سے ممتاز ہوتا ہے۔ نبی چند قسم کے خواص کے ساتھ مختص ہوتا ہے، اول یہ کہ نبی اللہ عزوجل اور اس کی صفات اور فرشتوں اور دار آخرت سے متعلق امور کی حقیقت جانتا ہے۔ کثرت معلومات کشف و تحقیق کی زیادتی کی وجہ سے نبی کا یہ علم دوسروں کے علم سے ممتاز ہوتا ہے۔ ثانی: نبی میں ایک صفت (قوت) ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ معجزات دکھاتا ہے، جیسے ہمیں یہ قوت ہے کہ ہم اپنے ارادے سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، یہی قدرت ہے۔ ثالث: نبی میں ایک قوت ہوتی ہے جس سے وہ فرشتوں کو دیکھتا ہے، جیسے پینا کے اندر ایک قوت ہے، جس کی وجہ سے وہ اندھے سے علاحدہ ہے۔ رابع: اسے ایک ایسی قوت ہوتی ہے، جس سے یہ جان لیا کرتا ہے کہ غیب میں کیا ہوگا۔

اسی لیے نبی اس وقت تک نبی نہ ہوگا جب تک غیب داں نہ ہو، اسے غیب دانی پر قدرت نہ ہو۔ اس مرتبے میں جمیع ماکان و مایکون کا علم داخل نہیں۔ قدر معتد بہ لازم ہے جیسے ہر مسلمان کو دینی باتوں کا علم ہے، مگر ہر مسلمان عالم نہیں کہلاتا۔ عالم وہ ہے جو دین کے معتد بہ علم سے مشرف ہو، اس درجہ میں دس ہیں بلکہ سو دو سو باتوں کا نہ جانتا عالم ہونے کی منافی نہیں۔ سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے بھی بعض سوالوں کے جواب میں فرمایا: لا ادری، میں نہیں جانتا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کتنے سوالوں کے جواب میں فرمایا: لا ادری۔

اسی طرح جب نبی علم غیب قدر معتد بہ جانتا ہے، بلکہ اسے یہ قوت ہے کہ غیب جان لیا کرے تو دس ہیں یا بالفرض سو دو سو غیب کی باتوں پر اگر اطلاع اس درجے میں نہ ہوئی، تو یہ نبی کے ”غیب داں“ ہونے کے منافی نہیں، جیسے سیدنا امام اعظم اور امام مالک کا چند مسائل کا نہ جانتا ان کے امام اعظم اور امام مجتہد ہونے کے منافی نہیں۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے، جمیع ماکان و مایکون اور علوم خمسہ بشمول علم قیامت جاننے کا۔ یہ مرتبہ حضور اقدس ﷺ کو نزول قرآن کی تکمیل کے ساتھ حاصل ہوا۔ تکمیل قرآن کے بعد کوئی ایسا واقعہ نہیں جو اس دعویٰ کے منافی ہو۔

جب حدیث جبرئیل کے بارے میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ نزول قرآن کی تمامیت کے بعد کی ہے تو یہ حدیث اہل سنت کے عقیدے کے مزاحم نہیں۔

رہ گیا اس کا ثبوت کہ حضور اقدس ﷺ کو قیام قیامت کا علم تھا، اس کے لئے الدولۃ الملکیہ، الفیوض الملکیہ، الکلمۃ العلیا کا مطالعہ کریں۔ سر دست صرف علامہ ابراہیم بیجوری قدس سرہ کے شرح قصیدہ بردہ کی ایک عبارت پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ولم ینخرج صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من الدنیا الا بعد ان اعلمہ اللہ

تعالیٰ بہذہ الامور الخمسہ. (۷۴)

اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا سے تشریف نہیں لے گئے، مگر اس کے بعد کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان پانچوں باتوں کا علم عطا فرما دیا۔

(علامات قیامت)

۸۔ علامت قیامت کثیر ہیں مگر اس حدیث میں صرف تین بیان فرمائیں۔
اول: لوٹدی اپنے آقا کو جنے گی۔

اس حدیث میں رَبَّتْهَا کا لفظ آیا ہے۔ یہ رب کی تانیث ہے، رب کے معنی پالنے والے ہیں۔ اضافت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر پالنے والے پر آتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے فرمایا:

إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ. (یوسف: آیت ۲۳)

یہ تو میری پرورش کرنے والا ہے اس نے مجھ کو اچھی طرح رکھا۔

عرف میں اس کے معنی آقا اور مالک کے بھی آتے ہیں۔ بیچ سلم میں رب المال لفظ عام ہے۔ اس حدیث میں آقا ہی کے معنی میں ہے۔ بلا اضافت رب کا اطلاق اللہ عزوجل کے علاوہ دوسرے پر جائز نہیں، بلکہ کفر ہے۔ غیر خدا پر اضافت کے ساتھ اس کا اطلاق یہ عربی کے ساتھ خاص ہے۔ ہمارے عرف میں اضافت کے ساتھ بھی غیر خدا پر اس کا اطلاق جائز نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ روسا و معززین بلکہ بادشاہان وقت بھی لوٹدیوں کو بیبیوں کی طرح رکھیں گے، ان سے اولاد ہوگی، یہ اولاد اپنی ان ماؤں کے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے، جو آقا لوٹدی کے ساتھ کرتا ہے، بلکہ بادشاہ وقت کی لوٹدی کے لطن سے جو اولاد ہوگی ان میں بادشاہ ہوں گے، اور یہ مائیں ان کا رعایا۔

یا مراد یہ ہے کہ لوٹدیوں کی بہت زیادہ کثرت ہوگی۔ خدانا ترس لوگ ام ولد کو بھی بیچ ڈالیں گے، اور وہ پھر دست بدست بکتی ہوئی اپنی اولاد کی ملکیت ہوگی۔
یہ دونوں علامتیں ظاہر ہو چکیں، شاہان بنی عباس میں سوائے امین کے سب لوٹدی زادے تھے۔

یا یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ لوگ اپنی حقیقی ماں کے ساتھ لونڈی جیسا برتاؤ کریں گے۔ ماں کو لونڈیوں کی طرح رکھیں گے۔ ان کی حق تلفی، نافرمانی کریں گے، ایذا پہنچائیں گے، یعنی اولاد اپنی ماں کے ساتھ آقا کی طرح برتاؤ کرے گی، یہ تاویل مذکورہ متن پر بالکل چسپاں ہے کہ فرمایا:

عورت اپنے آقا کو جنے گی۔

یہ اس طرح کہ عورت کا لفظ عام ہے۔ آزاد اور لونڈی دونوں کو، بلکہ عربی میں امرأۃ لفظ قریب قریب آزاد عورت کے ساتھ خاص ہے۔

یہاں حدیث دو لفظوں کے ساتھ مروی ہے۔ رَبَّهَا اور رَبَّتْهَا، رَبَّتْهَا کے معنی مالکہ کے ہیں، اس کا بھی وہی حاصل کچھ مبالغہ کے ساتھ، لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے ماں کی زیادہ اطاعت شعار ہوتی ہیں۔ اب حدیث کا یہ مفہوم ہوا کہ لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں اپنی ماؤں کے ساتھ مالکہ جیسا برتاؤ کریں گی۔

دوم: ننگے بدن ننگے پاؤں رہنے والے، گونگے، بہرے، سردار اور حکمراں ہوں گے۔

سوم: بھیک منگنے والے اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے محل میں فخر کریں گے۔

آج جو دنیا کا حال ہے۔ اس کو دیکھو! چودہ سو برس کی یہ غیب کی خبر کس طرح حرف

بحرف ثابت ہو رہی ہے۔

علوم خمسہ کی بحث

۹۔ ارشاد فرمایا: قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں ہے، جنہیں اللہ عزوجل کے سوا

کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ سورہ نعتمان کی اس آیت میں ہے۔

بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔ اور وہ بارش برساتا ہے، اور مادہ کے

پیٹ میں کیا ہے، جانتا ہے، کل کیا ہوگا، کوئی نہیں جانتا، اور کوئی اپنے انکل سے نہیں جانتا کہ

کہاں مرے گا، بے شک اللہ جاننے والا بتانے والا ہے۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے یہ علوم خمسہ اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بتائے یا نہیں۔ احادیث میں بکثرت ایسے واقعات ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان باتوں کی خبر دی۔

حضرت امام حسن کی ولادت سے پہلے، حضرت عباس کی اہلیہ ام الفضل سے فرمایا۔ فاطمہ کے ایک بچہ ہوگا، اس کی پرورش تم کروگی۔

جنگ بدر کے ایک دن قبل فرمایا: یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے، یہ فلاں کے مرنے کی جگہ ہے، ویسا ہی ہوا۔

جنگ احزاب کے خاتمہ پر فرمایا: اب ہم ان چڑھائی کریں گے، وہ ہم پر حملہ نہیں کر سکتے۔

جنگ خیبر کے موقع پر فرمایا: کل جھنڈا ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ و رسول اس سے محبت کرتے ہیں اللہ اس کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائے گا۔ دوسرے دن جھنڈا حضرت علی کو دیا، اور فتح حاصل ہوئی۔

فتح مکہ سے پہلے حضرت علی اور حضرت زبیر کو بھیجا کہ 'خانہ' تک چلے جاؤ وہاں ایک عورت ملے گی اس کے پاس خط ہے، اسے مع خط پکڑ کر لاؤ۔

ایک حدیث میں ہے کہ فرمایا: جب سب لوگ مرجائیں گے، بارش ہوگی۔ جس سے سب کے جسم اپنی حالت پر ہو جائیں گے۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی وفات اور مدفن کی خبر دی، فرمایا:

عسیٰ ان لاتلقانی بعد عامی هذا لعلک ان تمر بمسجدی وقبری۔

اس سال کے بعد مجھ سے تمہاری ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اب تم میری مسجد اور میری قبر سے گزر دو گے۔

تو جب ان علوم خمسہ میں سے اتنے امور کو حضور جانتے تھے، تو معلوم ہوا کہ حدیث کے اس ارشاد اور آیہ کریمہ میں حصر صرف علم ذاتی واجب قدیم غیر مخلوق ممتنع الزوال کے اعتبار سے ہے یعنی ان چیزوں کا علم ذاتی ازلی واجب قدیم صرف اللہ عزوجل کو ہے، ان چیزوں کا

علم ذاتی ازلی واجب قدیم اللہ عزوجل کے سوا کسی کو نہیں۔
 رہ گیا علم عطائی حادث ممکن، یہ نہ اللہ عزوجل کی صفت اور نہ شرعاً عقلاً جائز کہ ان
 امور کا علم بلکہ مطلق علم بلکہ باری عزاسمہ کی کوئی صفت، عطائی حادث ممکن ہو، اس پر اجماع
 امت کہ جو شخص باری تعالیٰ کی کسی بھی صفت کو عطائی یا حادث یا ممکن مانے وہ کافر، تو پھر یہ کہنا
 کہ علم عطائی حادث ممکن بھی باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، اپنے ایمان سے ہاتھ دھونا ہے۔

اس کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ ”فی خمس لا یعلمہن
 الا اللہ“ اور آیہ کریمہ ”إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ“ میں علم سے مراد علم ذاتی واجب قدیم
 ہے، یا علم عطائی حادث ممکن یا مطلق علم۔ اب اگر کہیں کہ علم عطائی حادث مراد ہے تو لازم کہ
 باری تعالیٰ کا علم، عطائی حادث ممکن ہو، اور یہ کفر بلکہ مجموعہ کفریات، اور اگر کہیں کہ مطلق علم
 مراد ہے، خواہ ذاتی واجب قدیم، خواہ عطائی حادث ممکن۔ تو بھی محدود مذکور اپنی جگہ، کہ پھر
 بھی لازم آئے گا کہ باری تعالیٰ کا کچھ علم عطائی حادث ممکن ہے، اور اللہ عزوجل کی کسی بھی
 صفت کو عطائی حادث ممکن ماننا بالاتفاق کفر ہے۔

اس لیے شق اول متعین کہ مراد یہ ہے کہ ان چیزوں کا علم ذاتی قدیم واجب باری
 تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، ان چیزوں کا علم ذاتی واجب قدیم اللہ عزوجل کے سوا کسی کو نہیں۔
 ہم اہل سنت، انبیائے کرام یا ان کے توسط سے اولیائے کرام کے لیے ان علوم خمسہ
 کا یادگیر غیب کا علم مانتے ہیں تو بطلان الہی مانتے ہیں، ان کے علم کو علم عطائی حادث ممکن
 مانتے ہیں، ہماری اس تقریر کی تائید میں چند علمائے معتمدین کے ارشادات سنئے۔

احمد الممعات میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں:

مراد آنست کہ بے تعلیم الہی بحساب عقل کس میں ہار انداند، از امور غیب اند کہ جز
 خدا، کسے آں رانداند، مگر آنکہ وے تعالیٰ از نزد خود کسے رابوحی والہام بداناند
 مراد یہ ہے کہ ان امور غیبیہ کو اللہ عزوجل کے بتائے بغیر عقل کے حساب سے کوئی
 نہیں جانتا، سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ وحی یا الہام کے ذریعہ بتادے۔

عارف باللہ ملا احمد جیون، استاذ، سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر قدس سرہما

نے تفسیرات احمدیہ میں فرمایا:

ولک ان تقول ان علم هذه الخمسة وان كان لا يعلمه الا الله . لكن يجوز ان يعلمها من يشاء من محبيه و اوليائه بقريظة قوله تعالى ان الله علیم خبير . على ان يكون الخبير بمعنى المخبر . (۱۰۵)

تم کو چاہیے کہ یہ کہو ان پانچوں کا علم صرف اللہ کو ہے، لیکن جائز ہے کہ اللہ عزوجل اپنے محبین اولیا میں سے جسے چاہے بتادے اس پر قرینہ اللہ عزوجل کا یہ ارشاد ہے، بے شک اللہ جاننے والا بتانے والا ہے۔ اس طرح کہ خبیر معنی میں مخبر کے ہے۔
تفسیر صاوی میں ہے:

ای من حیث ذاتها، واما باعلام الله العبد فلا مانع منه كالانبياء وبعض الاولياء قال تعالى: وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ . وقال تعالى: عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ . قال العلماء: الحق انه لم يخرج نبينا من الدنيا حتى اطلعه الله تعالى: (۲۸۶۰)

یہاں مراد علم ذاتی ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو عطا فرمائے، اس سے کچھ مانع نہیں جیسے انبیاء، اولیاء اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ کے علم میں سے لوگ اتنا ہی پاتے ہیں جتنا وہ چاہتا ہے۔ اور فرمایا: عالم الغیب اپنے پسندیدہ رسولوں کے سوا کسی کو اپنے غیب پر مسلط نہیں فرماتا، علماء نے فرمایا حق یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دنیا سے تشریف نہیں لے گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مطلع فرمادیا (ان پانچوں پر بھی)

بحث کے اختتام پر بخاری کے شارحین جلیلین اجلین، علامہ عینی و علامہ عسقلانی کے ارشاد کو جو انہوں نے اسی حدیث جبرئیل کے تحت ارقام فرمائے ہیں، ہدیہ ناظرین کرتے ہوئے، رحمت ہوتا ہوں۔

فمن ادعی علم شیئ منها غیر مسند الی رسول الله صلی الله تعالیٰ علیہ وسلم کان کاذبا فی دعواه . (عینی: ۱۲۳۷-فتح الباری: ۱/۱۱۴)
جو شخص حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیے بغیر ان پانچ چیزوں

سے کسی ایک کا دعویٰ کرے (کہ میں جانتا ہوں) وہ جھوٹا ہے۔

یعنی اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے ان پانچوں میں سے سب کا یا کسی ایک کا مثلاً قیامت کا علم، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بلا واسطہ حاصل ہے، وہ جھوٹا ہے، اس کا صاف صاف مطلب یہ نکلا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ مجھے ان پانچوں کا علم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے واسطے سے ان کے بتانے سے حاصل ہوا، وہ سچا ہے۔ اس سے صاف ظاہر کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان پانچ چیزوں کا جن میں قیامت کا وقت بھی داخل ہے، حاصل ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل کی ہر صفت ذاتی واجب قدیم ہے، پھر اس آیت میں پانچ کی تخصیص کیوں ہے، اس کا ایک جواب تو ملا احمد جیون قدس سرہ نے دیا ہے۔
(الف): فائدہ ان هذه الخمسة معظم الغیوبات و مفاتیحها فانه ان وقف مثلاً علی ما فی غد وقف علی موت زید وتولد عمرو وفتح بکر ومقہورۃ خالد و قدوم بشر وغير ذلك مما فی الغد وهكذا القیاس.

(تفسیرات احمدیہ: ۱۰۵)

اس کا فائدہ یہ ہے کہ یہ معظم غیوب اور ان کی کنجیاں ہیں اس لیے کہ مثلاً اگر کوئی یہ جان گیا کہ کل کیا ہوگا (تو وہ کل رونما ہونے والی ساری باتوں کو) مثلاً زید کی موت، عمرو کی پیدائش، بکر کی فتح، خالد کی مغلوبیت، بشر کی آمد وغیرہ کو جان جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی اہمیت کی وجہ سے ان پانچوں کو خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا۔

(ب): دوسری وجہ ان پانچ چیزوں میں علم قیامت بھی ہے، اوپر گزر چکا، علم قیامت کے بارے میں بکثرت سوالات ہوتے تھے، اور خود جبرئیل امین نے قیامت کے بارے میں سوال کیا اس لیے اس کی تخصیص فرمائی۔

(ج): عرب کے کاہن، نجومی، علم مانی لغد وغیرہ جاننے کے مدعی تھے، ان کی تکذیب کے لیے بالخصوص ان کو ذکر فرمایا۔

☆ بعض منکرین علم رسول نے ذاتی اور عطائی کی تقسیم کو تدقیقات فلسفیانہ کہہ کر مسترد کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اس پر گزارش ہے کہ اگر اس فرق کو تسلیم نہ کیا جائے تو قرآن مجید، احادیث کریمہ میں اتنا زبردست تعارض پڑے گا کہ اٹھائے نہ اٹھے گا۔

مثلاً ارشاد ہے:

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ (نمل: ۶۵)
اور فرمایا: فرمادو کہ زمین و آسمان کے رہنے والوں میں کوئی غیب نہیں جانتا ہے
سوائے اللہ کے۔

مَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ. (سورہ آل عمران: آیت ۱۷۹)

اللہ کی یہ شان نہیں (اے عام لوگو!) کہ تمہیں علم غیب دے دے۔ ہاں! اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے اس کے لیے چن لیتا ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رُّسُولٍ.

(سورہ جن: آیت ۲۶)

عالم الغیب اپنے علم غیب پر اپنے پسندیدہ رسولوں کے سوا کسی کو مسلط نہیں فرماتا۔
بویسے! اس تعارض کا کیا جواب ہے۔ علاوہ ازیں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا:

وَبِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ (سورہ توبہ: آیت ۱۲۸)

مسلمانوں پر بہت مہربان، رحم فرمانے والے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بارے میں فرمایا:

إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْكُمْ (سورہ یوسف: آیت ۵۵)

میں حفاظت کرنے والا، علم والا ہوں۔

انسان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (سورہ دھر: آیت ۲)

اور خود قرآن مجید میں اللہ عزوجل نے اپنے آپ کو رؤف، رحیم، حفیظ، علیم، سمیع، بصیر فرمایا، اس تعارض کا کیا جواب ہوگا۔

اس لیے اس فرق کو ماننا ناگزیر ہے کہ اللہ عزوجل کی ہر صفت ذاتی، واجب، قدیم، غیر متناہی غیر مخلوق، اور انبیا و اولیا اور تمام مخلوقات کی ہر صفت عطائی حادث ممکن متناہی مخلوق۔ اور یہی فرق علم غیب میں بھی ہے۔ آیات نفی میں مراد علم ذاتی، قدیم، واجب غیر متناہی غیر مخلوق۔ اور آیات اثبات میں علم عطائی ممکن حادث متناہی مخلوق۔

اس بحث کو اگر بتامہادیکھنا ہو تو ”الدولة المكية، الفيوض الملكية، الاعتراف، ادخال السنان، الكلمة العليا“ کا مطالعہ کریں۔ اس حدیث پر کلام کچھ تفصیلی ہو گیا۔ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

☆☆☆

حضرت عائشہ کی پاکدامنی اور حدیثِ افک

اس بحث سے پہلے حضور شارح بخاری علیہ الرحمۃ والرضوان نے بخاری شریف کی حدیث افک کا من و عن ترجمہ ذکر فرمایا ہے، پھر اسی کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے مخالفین کی ریشہ دہانیوں کی ایسی بیخ کنی کی ہے، جس سے سارے مخالفین دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اب مضمون ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کے بارے میں قرعہ ڈالتے، جن کے نام قرعہ نکلتا انہیں ہمراہ لے جاتے۔ ایک غزوہ کے موقع پر قرعہ ڈالا تو میرا نام نکلا میں حضور کے ساتھ گئی۔ یہ واقعہ آیت حجاب کے نازل ہونے کے بعد کا ہے، میں ہودج ہی میں رہتی اور مجھے سوار کرایا جاتا اور سواری سے اتارا جاتا۔ ہم چلے، جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس غزوہ سے فارغ ہو کر لوٹ رہے تھے۔ جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو ایک رات کوچ کرنے کے لیے اعلان فرمایا، کوچ کے اعلان کے بعد میں اٹھی اور قضائے حاجت کے لیے لشکر کے باہر چلی گئی، رفع حاجت کر کے جب میں واپس ہوئی اور کجاوہ کے قریب پہنچی تو اپنے سینے کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ میرا ہار ٹوٹ کر گر گیا ہے، جو جزع اظفار کا تھا، اس لیے میں لوٹی اور ہار تلاش کرنے لگی۔ اس کی تلاش میں دیر ہو گئی۔ اس درمیان وہ لوگ آئے جو میرا ہودج اٹھانے اور باندھنے پر مامور تھے، تو ان لوگوں نے میرا ہودج اٹھا کر اس اونٹ پر باندھ دیا جس پر میں سوار ہوئی تھی، ان کا گمان یہ تھا کہ میں ہودج میں ہوں۔ اس وقت عورتیں دہلی ہلکی تھیں، بھاری بدن نہ تھیں۔ ان پر گوشت نہیں چڑھا تھا کیوں کہ کھانا تھوڑی مقدار میں کھاتی تھیں۔ اس لیے ہودج اٹھانے والوں کو ہودج کے وزن کی کمی کا احساس نہ ہوا، اور انہوں نے ہودج اٹھالیا، اور میں اس وقت نو عمر بچی تھی۔ ان لوگوں نے اونٹ اٹھایا اور چل

دیئے لشکر کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنا ہار پایا، اور میں ان کی قیام گاہ پر آئی تو وہاں کسی کو نہیں پایا میں بالقصد وہیں آگئی جہاں ٹھہری تھی۔ میں نے سوچا کہ جب لوگ مجھے ہودج میں نہیں پائیں گے تو یہیں لوٹ کر تلاش کے لیے آئیں گے۔ میں بیٹھی تھی کہ مجھ پر نیند غالب آگئی اور میں سو گئی، اور صفوان بن معطل سلمی ذکوانی لشکر کے پیچھے تھے، صبح کے وقت میرے قیام کی جگہ پہنچے تو ایک سونے والے انسان کو دیکھا وہ میرے قریب آئے انہوں نے آیت حجاب نازل ہونے سے پہلے مجھے دیکھا تھا، میں ان کے ”اِنَّا لِلّٰہِ“ پڑھنے سے جاگ گئی۔ انہوں نے اپنا اونٹ بیٹھا کر اس کے اگلے پاؤں کو دبائے رکھا، یہاں تک کہ میں سوار ہو گئی۔ اب وہ پیدل چلے اور میری سواری کی مہار پکڑ کر آگے آگے چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم لشکر میں اس وقت پہنچے جب کہ وہ لوگ عین ظہر کے وقت منزل کر چکے تھے۔ اس کے بعد جسے ہلاک ہونا تھا وہ ہلاک ہوا، اور افترا پردازی کرنے والوں کا امیر کارواں عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ ہم مدینہ آئے تو میں ایک مہینہ تک علیل رہی، اور بہتان طرازوں کی باتیں لوگوں میں پھیلتی رہیں۔ دورانِ علالت اس بات سے مجھے کچھ شبہ ہوتا کہ ان دنوں میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانب سے وہ مہربانی نہیں دیکھتی تھی جو اور علالت کے دنوں میں دیکھا کرتی تھی۔ بس اتنا ہوتا کہ حضور تشریف لاتے اور سلام کرتے۔ پھر دریافت فرماتے، کیسی ہو؟ اور مجھے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں ہوئی۔ بیماری کی وجہ سے میں کمزور ہو گئی۔ میں اور ام مسطح قضائے حاجت کے لیے میدان میں جانے کے لیے نکلی، ہم صرف رات ہی رات کو نکلتی تھیں، گھروں کے قریب بیت الخلاء بنائے جانے سے پہلے۔ ہمارا طریقہ پہلے عرب والوں کا طریقہ تھا کہ میدان میں جاتے تھے۔ میں اور ام مسطح بنت ابورہم نکلی اور چل رہے تھے، ام مسطح اپنی چادر میں الجھ کر گر پڑی۔ اس نے کہا: مسطح ہلاک ہو جائے! میں نے اس سے کہا: تم نے بری بات کہی ہے۔ بدر میں شریک ہونے والے مجاہد کو برا کہتی ہے۔ تو اس نے کہا: اے حضور! کیا آپ نے وہ نہیں سنا جو وہ لوگ کہہ رہے ہیں؟ اب اس نے افترا پردازوں کی بات بتائی، تو بیماری پر میری بیماری اور بڑھ گئی۔ جب لوٹ کر گھر آئی اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: تم کیسی ہو؟ میں نے عرض کیا:

مجھے اجازت دیں کہ اپنے والدین کے گھر جاؤں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے والدین سے اس خبر کی تحقیق کروں مجھے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمادی، اس کے بعد میں اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ میں نے اپنی والدہ سے دریافت کیا: لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے بتایا اے بیٹی! اس سے اثر نہ لو بخدا! جب کوئی عورت خوبصورت ہو اور شوہر اس سے محبت کرتا ہو اور اس کی سونکھیں ہوں تو اس کے بارے میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ میں نے کہا: سبحان اللہ، لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں، اس رات کو صبح تک نہ میرا آنسو تھمتا تھا اور نہ نیند آتی تھی۔ اس کی صبح کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب اور اسامہ بن زید کو بلایا جب کہ وحی آنے میں تاخیر ہوگئی۔ ان لوگوں کو اس لیے بلایا تھا کہ اپنی اہل سے جدائی کے بارے میں مشورہ فرمائیں۔ اسامہ چوں کہ ازواج مطہرات کے ساتھ حضور کی محبت کو جانتے تھے، اس لیے اس کے مطابق اشارہ کیا، اور عرض کیا: یہ آپ کی اہل ہیں یا رسول اللہ خدا کی قسم! ان کے بارے میں اچھائی کے سوا ہم اور کچھ نہیں جانتے۔ اور حضرت علی بن ابوطالب نے یہ عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ آپ کو ضیق میں ہرگز نہیں ڈالے گا۔ اور عورتیں ان کے سوا بہت ہیں، اور حضور کنیز سے دریافت فرمائیں وہ سچی بات بتادے گی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بریرہ کو بلایا، اور دریافت فرمایا، اے بریرہ! کیا تو نے ان میں کوئی ایسی بات دیکھی ہے جو تجھے شبہ میں ڈالے؟ بریرہ نے عرض کی قسم ہے اس ذات کی جس نے حضور کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں نے ان میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی ہے، جو قابل اعتراض ہو، سوائے اس کے کہ وہ نو عمر ہیں۔ آٹا گود کر سوجاتی ہیں اور بکری کھا جاتی ہے۔ اس کے بعد اس دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے اور عبد اللہ بن ابی سلول کے مقابلے مدد کے خواستگار ہوئے اور فرمایا: اس شخص کے مقابلے میں میری کون مدد کرے گا، میری رفیقہ حیات کے بارے میں جس کی اذیت ناک باتیں مجھ تک پہنچی ہیں۔ خدا کی قسم! میں اپنی اہل کے بارے میں اچھائی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اور لوگوں نے ایسے شخص کا نام لیا ہے جس کے بارے میں بھی اچھائی کے سوا اور کچھ نہیں جانتا، اور میرے گھر میں جب بھی جاتا ہے میرے ساتھ جاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت

سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں ان کے مقابلے میں حضور کی مدد کروں گا، اگر وہ آدمی اوس سے ہے تو ہم اس کی گردن اڑادیں گے اور اگر ہمارے بھائیوں خزرج میں سے ہے تو ہمیں حکم دیجئے ہم آپ کے مطابق عمل کریں۔ یہ سن کر سعد بن عبادہ کھڑے ہو گئے اور وہ خزرج کے سردار تھے، اس کے سپہ و و نیک انسان تھے، اس وقت پاس داری نے انہیں مشتعل کر دیا، انہوں نے کہا تو نے غلط کہا۔ بخدا! نہ تو اسے قتل کر سکتا ہے اور نہ اس کی قدرت رکھتا ہے اب اسید بن حضیر کھڑے ہو گئے اور کہا: تو نے غلط کہا، بخدا! ہم اسے قتل کر دیں گے، تو منافق ہے اور منافقین کی پاسداری میں لڑتا ہے۔ اب اوس و خزرج کے دونوں قبیلے مشتعل ہو گئے، اور لڑنے پر تل گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما رہے۔ آپ نیچے تشریف لائے اور حاضرین کو ٹھنڈا کیا، یہاں تک کہ وہ لوگ خاموش ہو گئے، اور حضور بھی خاموش ہو گئے۔ ام المومنین نے فرمایا: اور میں دن بھر روتی نہ آسو تھمتا تھا اور نہ خیندا آتی تھی۔ میں اپنے والدین کے یہاں رات بھر اور دن بھر روتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گریہ میرے جگر کو پھاڑ دے گی، میں اپنے والدین کے یہاں بیٹھی رو رہی تھی کہ انصار کی ایک خاتون نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، میں نے اجازت دے دی، وہ آ کر میرے پاس بیٹھ گئیں اور میرے ساتھ رونے لگیں، ہم اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے اور بیٹھ گئے، جس دن سے یہ افواہ پھیلی تھی، آج تک کبھی میرے پاس نہ بیٹھتے تھے اور ایک مہینے تک میرے بارے میں وحی کا نزول رکا رہا۔ حضور نے بیٹھنے کے بعد شہادتین پڑھا پھر فرمایا: اے عائشہ! تیرے بارے میں میرے پاس ایسی ایسی بات پہنچی ہے، اگر تو بری ہے تو بہت جلد اللہ تیری براءت بیان فرمائے گا، اور اگر بالفرض تو گناہ سے آلودہ ہے تو اللہ سے استغفار کر اور اس کی طرف رجوع کر، کیوں کہ بندہ جب گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی بات پوری فرما چکے تو میرا آنسو ٹھم گیا، یہاں تک کہ ایک قطرہ بھی محسوس نہیں ہوا۔ میں نے اپنے والد ماجد سے عرض کیا کہ میری طرف سے آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جواب دیں، انہوں نے فرمایا: بخدا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کی خدمت میں کیا عرض کروں۔ پھر میں نے اپنی والدہ سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جواب دیں، انہوں نے بھی وہی کہا بخدا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کیا عرض کروں، اب میں نے عرض کیا اور میں نو عمر بچی تھی ابھی بہت زیادہ قرآن بھی نہیں پڑھا تھا، میں نے عرض کیا میرے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ آپ حضرات نے وہ سب سن لیا ہے جو لوگ کہتے پھر رہے ہیں۔ اور وہ آپ حضرات کے دل میں بیٹھ چکی ہے اور آپ حضرات نے اسے صحیح سمجھ لیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بری ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے ضرور بلا شبہ بری ہوں، تو آپ حضرات مجھے سچا نہیں جانیں گے۔ اور اگر میں اس بات کا اعتراف کر لوں حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ حضرات مجھے سچا مان لیں گے۔ بخدا! میں اپنی اور آپ حضرات کی مثل یوسف کے والد کے علاوہ اور کوئی نہیں پاتی جب کہ انہوں نے فرمایا تھا: پس اچھا صبر ہی خوب ہے۔ ان باتوں پر جو تم بیان کرتے ہو اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے بچھونے پر کروٹ لی، اور میں امید کرتی تھی کہ اللہ میری براءت بیان فرمائے گا مگر بخدا! میں یہ گمان نہیں کرتی تھیں کہ میرے بارے میں وحی نازل ہوگی۔ اور میں اپنے آپ کو اس رتبے کا نہیں جانتی تھی کہ میرے بارے میں قرآن کلام فرمائے گا۔ ہاں! مجھے یہ امید تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب دکھایا جائے گا جس میں اللہ میری براءت بیان فرمائے گا۔ بخدا! حضور اپنی جگہ سے ہٹے بھی نہیں تھے اور نہ گھر والوں میں سے کوئی باہر گیا تھا کہ حضور پر وحی نازل ہونے لگی اور حضور پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو نزول وحی کے وقت طاری ہوتی تھی کہ سردی کے دنوں میں بھی پسینے کے قطرے موتی کی طرح ٹپکتے تھے۔ جب وحی کی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرو ہوئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے، سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ مجھ سے فرمایا: اے عائشہ! اللہ کا شکر کرو بے شک اللہ نے تیری پاکدامنی بیان فرمادی۔ اس پر میری والدہ نے مجھ سے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو۔ میں نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہ ہوں گی اور سوائے اللہ کے

اور کسی کا شکر نہیں ادا کروں گی۔ اس وقت اللہ عزوجل نے یہ دس آیتیں نازل فرمائیں۔ اور یہ بڑا بہتان لانے والے تمہیں میں سے ایک گروہ ہے (اور بقیہ آیتیں) جب اللہ نے میری براءت میں یہ نازل فرمایا تو ابو بکر صدیق نے کہا میں مسطح کو کبھی کچھ نہ دوں گا کیوں کہ اس نے عائشہ کو وہ کہا ہے کہ اور وہ مسطح بن اثاثہ کو دیا کرتے تھے۔ رشتہ داری کی بنا پر اللہ عزوجل نے یہ نازل فرمایا، تم میں جو لوگ مالدار اور فراخ رزق ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ رشتہ داروں اور مسکینوں اور مسافروں اور مہاجرین کو کچھ نہ دیں گے۔ (پوری آیت غفور رحیم تک) اب ابو بکر نے کہا ہاں! بخدا! میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ مجھے بخش دے، اور مسطح کو وہ دینا جاری کر دیا جو پہلے عطا فرماتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے زینب بنت جحش سے میرے معاملے میں دریافت فرمایا تھا، اور پوچھا تھا اے زینب! تم کیا جانتی ہو تم نے کیا دیکھا ہے، تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنے کان اور آنکھ کو محفوظ رکھتی ہوں۔

اب اس طویل متن حدیث کی تشریحات ملاحظہ کریں:

واقعہ! فک میں یہ بہتان باندھنے والے چار مرد تھے۔ رأس المنافقین عبد اللہ بن ابی ابن سلول، حضرت حسان بن ثابت، حضرت مسطح بن اثاثہ اور عبد اللہ ابو احمد۔ ایک عورت حمنہ بنت جحش ام المومنین حضرت زینب بنت جحش کی بہن۔

اس فتنے کا بانی رأس المنافقین تھا۔ اسی نے اس کی ابتدا کی اور یہی اسے کرید کرید کر ابھارتا رہتا تھا، اور قول مختار یہی ہے کہ آیت کریمہ: "الذی تولى كبره" سے مراد وہی شقی اذلی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت حسان ہیں۔

یہ واقعہ غزوہ بنی مصطلق میں واقع ہوا جسے غزوہ مرسیع بھی کہتے ہیں یہ بر بنائے قول راجح شعبان ۵ھ میں ہوا تھا۔ اس واقعہ کی بنیادی کڑی وہ ہار ہے جو سیدنا ام المومنین کے گلوے مبارک سے گر کر کھو گیا تھا، یہ ہار جزیع نامی ایک قیمتی پتھر کا بنا ہوا تھا۔ جزیع عقیق کی ایک قسم ہے، زیتوں میں پکانے سے اس کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ اس کا پہننے سے لاغم و اندوہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اگر بچے کو پہنا دیا جائے تو اس کی رال بہت بہتی ہے۔ دروزہ میں مبتلا عورت کے بال پر پھیر دیا جائے تو بچے کی پیدائش میں آسانی ہوگی۔

یمن کے علاقے میں ظفار ایک جگہ کا نام ہے، جہاں یہ عقیق بہ کثرت پیدا ہوتا ہے اور چین سے بھی آتا ہے اس لیے اس کو جزع ظفار بھی کہتے ہیں۔ اکثر روایتوں میں ظفار کے بجائے اظفار بھی آیا ہے۔ اظفار ایک قسم کی خوشبودار لکڑی کو بھی کہتے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس لکڑی کے منکے سے ہار بناتے ہوں، اس ہار کی قیمت بارہ درہم تھی یعنی آج کل چاندی کی جو قیمت ہے اس کے اعتبار سے لگ بھگ ڈھائی سو روپے تھی۔ یہ ہاران کی والدہ نے اس وقت عطا فرمایا تھا جب انہیں رخصت کیا تھا۔

جب ام المؤمنین ہار کی تلاش میں قافلے سے پیچھے رہ گئیں تو اس جگہ تشریف لے آئیں جہاں پہلے قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ پھر حضرت صفوان کی رہنمائی میں قافلہ کے ساتھ آئیں۔ یہ حضرت ام المؤمنین کی اس نوعمری میں اعلیٰ ذہانت کی دلیل ہے کہ وہیں اپنی جائے قیام پر تشریف فرما رہیں، ورنہ اگر گھبرا کر چل دیتیں تو اس کا خطرہ تھا کہ بھٹک جاتیں تو ملنا دشوار ہو جاتا۔

حضرت صفوان بن معطل سلمی ذکوانی، قبیلہ بنی سلیم کے فرد تھے، خلاف قیاس اس کی طرف انتساب میں سلمی کہا جاتا ہے، ان کے آباؤ اجداد میں ذکوان نام کے ایک شخص تھے جن کی نسبت میں ان کو ذکوانی کہا گیا۔ یہ اس خدمت پر مامور تھے کہ اشکر کی روانگی کے بعد منزل کا جائزہ لے لیا کریں کہ اگر کسی کی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اسے مالک کو پہنچا دیں۔ سب سے پہلا غزوہ جس میں یہ شریک ہوئے مرسیع ہی تھا اس کے بعد خندق وغیرہ تمام مشاہد میں شریک ہوئے۔ بہت بہادر و مخیر صحابی تھے۔ اور شاعر بھی تھے۔ آرمینیا کی جنگ میں ان کا پیر ٹوٹ گیا مگر پھر بھی لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ یہ جنگ ۱۹ھ میں ہوئی تھی۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ چوں کہ اقلک میں ملوث تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک بار پھر حضرت حسان پر تلوار چلائی مگر وہ بچ گئے۔ حضرت حسان نے دربار رسالت میں شکایت کی تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت حسان سے فرمایا کہ اپنا حق مجھے بخش دو۔ انہوں نے نذر کر دیا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے عوض حضرت صفوان سے انہیں ایک کھجور کا باغ دلوا دیا۔ حضرت صفوان اس کے قبل مشرف باسلام ہو چکے تھے، آگے ام

المومنین کا ارشاد آ رہا ہے کہ انہوں نے نزولِ حجاب سے پہلے مجھے دیکھا تھا اور بر بنائے قول مختار آیت حجاب کے نزول کا سنہ بھی یہی ۵ھ ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ آیت حجاب اس واقعہ سے چند مہینہ پہلے نازل ہوئی تھی۔

حضرت صفوان کو جب اس افواہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: بخدا! میں نے اب تک کسی عورت سے صحبت نہیں کی، نہ حلال طور پر نہ حرام طور پر۔ ابن اسحاق نے یہ بھی روایت کیا کہ وہ حضور تھے یعنی عورتوں کے لائق نہ تھے۔ خود ام المومنین نے ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ سبحان اللہ میں نے کسی عورت کا ستر نہیں کھولا ہے۔ حضرت صفوان نے جب ام المومنین کو دیکھا تو انہیں سخت حیرت ہوئی ہوگی کہ کوئی عظیم سانحہ ہو گیا ہے۔ اس لیے بے ساختہ ان کی زبان پر کلمہ استرجاع جاری ہو گیا ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے انہوں نے آواز دے کر جگانے کے بجائے بلند آواز سے اسے پڑھا، یہ غایت ادب و احترام کی بنا پر تھا۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ ام المومنین فرماتی ہیں کہ میں نے انہیں دیکھتے ہی چادر سے منہ چھپا لیا۔ واللہ! انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے سوائے استرجاع کے اور کچھ ان کی زبان سے سنا۔ حضرت صفوان نے اونٹ بٹھا کر اس کے اگلے پاؤں کو اس لیے دبا دیا کہ ام المومنین از خود بغیر کسی سہارے کے اونٹ پر سوار ہو جائیں، یہ ان کی ذہانت اور ان کا ادب تھا۔

صحاح کی تمام روایتوں میں یہی ہے کہ حضرت صفوان پیدل اونٹ کی مہار تھامے آگے آئے تھے، ابن حبان کی ایک روایت میں ہے کہ اونٹ پر ام المومنین کے ساتھ بیٹھے تھے یہ صحیح نہیں۔

ام المومنین فرماتی ہیں کہ ہم دونوں اشکر میں اس وقت پہنچے جب ٹھیک دوپہر کے وقت اشکر نے پڑاؤ کرایا تھا۔ ابن اسحاق کی روایت میں یہ ہے کہ ام المومنین فرماتی ہیں ابھی قافلہ نمبر ۱ ہی تھا ابھی یہ بی ٹم شدگی کا علم بھی کسی کو نہیں ہوا تھا کہ ہم لوگ پہنچ گئے۔ رأس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے سب سے پہلے بہتان کے کلمات نکالے اور پھر تھوڑی دیر میں پورے لشکر میں پھیل گئے۔

مسطح بن اثاثہ کی ماں حضرت صدیق اکبر کی خالہ تھیں جن کا نام رانظہ تھا۔ مسطح اور ان کی ماں سابقین اولین مہاجرین میں سے تھیں۔ اثاثہ مسطح کے بچپنے ہی میں فوت ہو گئے۔ ماں اور بیٹے دونوں کی حضرت صدیق اکبر کفالت فرماتے تھے۔ چوں کہ مسطح بھی بہتان طرازوں میں شامل تھے اس لیے ان کی والدہ نے ان کے بددعا کے یہ الفاظ نکالے کہ مسطح ہلاک ہو جائے۔

جب سیدنا مولائے کائنات علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس سلسلہ میں سرکار نے مشورہ طلب فرمایا تو آپ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز تنگی میں نہ ڈالے گا اور عورتیں ان کی سوا بہت ہیں، حضور کنیز سے دریافت فرمائیں وہ سچی بات بتا دے گی۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ عرض اس بنیاد پر تھی کہ معاملے کی جو صورت اس وقت تھی اس کے پیش نظر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قلق و اضطراب اور پریشانی کے ازالے کی سب سے آسان صورت یہی تھی جو انہوں نے عرض کی۔ ظاہر ہے کہ بفرغ محال اگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ام المومنین سے جدائی اختیار فرمالتے تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ یہ حضرت شیر خدا کی ایک رائے تھی اگرچہ اس کا سنگین پہلو دوسرا بہت خطرناک تھا کہ پھرام المومنین کی پاک دامنی عصمت مآبی مشتبہ ہو جاتی، یہی نہیں بلکہ اس کے خلاف لوگوں کو یقین ہو جاتا۔ یہ رحمت عالم کی شان کریمی کو گوارہ نہ ہوا کہ جسے اپنے حرم میں جگہ دے چکے ہیں، اسے بلا کسی جرم کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طعن و تشنیع کا نشانہ بننے کے لیے چھوڑ دیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ معاذ اللہ معاذ اللہ! ام المومنین کی عصمت پر کسی قسم کا شبہ رکھتے تھے۔ اگر انہیں اس میں ذرا بھی شبہ ہوتا تو بلا جھجک ظاہر فرمادیتے۔ اس وقت نہ تقیہ کی ضرورت تھی، نہ حضرت شیر خدا سے اس کی توقع۔ بلکہ یہ عرض کہ کنیز یعنی بریرہ سے دریافت فرمائیں وہ حضور کو سچی بات بتا دے گی، اس کی دلیل ہے کہ اس وقت بریرہ نے جو کچھ عرض کیا وہ خود حضرت شیر خدا کی بھی رائے تھی۔ اس مشاورت کے بعد سرکار منبر اقدس پر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ افترا

پردازی کر کے مجھے ایذا پہنچائی ہے انہیں اگر میں سزا دوں تو کون مجھے حق بجانب سمجھ کر معذور جانے گا یا اس خصوص میں کون میری مدد کرے گا۔ اس وقت حضرت سعد بن معاذ کھڑے ہو گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! میں ان کے مقابلے میں حضور کی مدد کروں گا، اگر وہ آدمی اس سے ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر خزرج سے ہے تو ہمیں حکم دیجیے ہم آپ کے حکم کے مطابق عمل کریں گے۔

اس پر امام قاضی عیاض وغیرہ نے یہ اشکال پیش کیا کہ اس وقت حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ باحیات نہیں تھے کیوں کہ یہ متفق علیہ ہے کہ ان کا وصال غزوة خندق کے بعد بنی قریظہ کے استیصال کے بعد ہو گیا تھا۔ غزوة خندق ۳ھ میں ہوا ہے جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ غزوة مرسیع شعبان ۵ھ میں ہوا ہے، اور خندق شوال ۵ھ میں۔

بہر حال! جب سعد بن معاذ نے یہ فرمایا تو حضرت سعد بن عبادہ کو طرارہ آ گیا۔ کیوں کہ آپ خزرج کے سردار تھے، آپ نے مشتعل ہو کر کہا بخدا! تو نہ اسے قتل کر سکتا ہے اور نہ اس کی قدرت رکھتا ہے۔ حالاں کہ وہ اس سے پہلے منافقین کی حمایت نہیں کرتے تھے، مگر اس وقت قبیلے کی حمایت میں انہیں غصہ آ گیا تھا اور اس غصے کی وجہ غلط فہمی تھی۔ چوں کہ واقعہ اُفک کا بانی مہابی اور لیڈر ابن ابی سلول رأس المنافقین بھی بنی خزرج کا تھا انہوں نے سمجھا کہ حضرت سعد اسی بہانے خزرج سے پرانی عداوت نکالنا چاہتے ہیں، اس کی دلیل ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے کہا کہ تم نے یہ بات صرف اس بنا پر کہی ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ بنی خزرج سے ہے اور ابن ابی حاطب کی روایت میں ہے کہ اے معاذ! تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مدد نہیں کرنا چاہتا اور تمہارے درمیان جاہلیت میں کہنے تھے وہ اب تک تمہارے سینوں سے نہیں نکلے ہیں۔

اس پر حضرت اسید بن حضیر کھڑے ہو گئے اور کہا: تم یہ کام منافق کا کر رہے ہو کیوں کہ منافق کی حمایت میں غصہ ہو رہا ہے۔ حضرت سعد بن معاذ اور حضرت اسید بن حضیر دونوں حضرات اس کی شاخ بنی عبد الاشہل سے تھے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی

بات پر جلال اور غضب میں ان کے منہ سے یہ کلمات نکل گئے۔ اس وقت اس فتنے سے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انتہائی ملول اور الجھن میں تھے، اس وقت ضرورت تھی کہ خاطر اقدس سے گرد ملال دور کی جاتی، اور اطاعت و ہمدردی زیادہ سے زیادہ کی جاتی مگر حضرت سعد بن عبادہ نے غلط فہمی کی بنا پر وہ کہہ دیا، اس پر انہیں جلال آگیا، شورش اور فتنہ کے موقع پر اس قسم کی باتیں تعجب انگیز نہیں، خصوصاً اس وقت کہ ابھی یہ لوگ صرف چار سال ہوئے حاتمہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ اس اختلاف کی وجہ سے اوس اور خزرج دونوں قبیلے مشتعل ہو گئے تو حضور منبر اقدس سے نیچے تشریف لائے اور حاضرین کو خاموش رہنے کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ حضرت سعد بن عبادہ اور دیگر حضرات خاموش ہو گئے اور حضور بھی خاموش ہو گئے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مومن مخلص اور سچے محبت رسول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس جوش اور ثوران میں جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں سمجھایا بجھایا تو وہ ٹھنڈے ہو گئے اور ان کا ایمان صادق اور ان کی بے لوث حب رسول ان کے جوش اور ثوران پر غالب آگئی۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اس حادثہ سے حضرت سیدتنا ام المومنین بہت دل گرفتہ تھیں، کسی پہلو قرار نہ تھا۔ مسجد نبوی کی اس گفتگو کے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آپ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: عائشہ! تیرے بارے میں میرے پاس ایسی ایسی بات پہنچی ہے اگر تو بری ہے تو بہت جلد اللہ تعالیٰ تیری براءت بیان فرمائے گا الخ۔ یہ سننے کے بعد اخیر میں ام المومنین نے عرض کیا: میرے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ آپ حضرات نے وہ سب سن لیا ہے جو لوگ کہتے پھر رہے ہیں اور وہ آپ حضرات کے دل میں بیٹھ چکی ہے اور آپ حضرات نے اسے سچ سمجھ لیا ہے اور اب میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بری ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے ضرور بلا شبہ بری ہوں تو آپ حضرات مجھے سچا نہیں جانیں گے اور اگر میں اس بات کا اعتراف کر لوں حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ حضرات مجھے سچا مان لیں گے۔ بخدا! میں اپنی مثال اور آپ حضرات کی مثل یوسف کے والد کے علاوہ اور کچھ نہیں پائی جب کہ انہوں نے فرمایا تھا: پس اچھا صبر ہی خوب ہے، ان باتوں پر بہتر بیان

کرتے ہو اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں نے اپنے بچھونے پر کروٹ بدل لی، اور میں امید کرتی تھی کہ اللہ میری براءت بیان فرمائے گا۔

غالباً ام المومنین چار سال خدمت اقدس میں گزار چکی تھیں انہیں یقین تھا کہ حضور خوب جانتے ہیں یہ افترا بہتان اور کذب بکت ہے مگر جب حضور نے وہ فرمایا تو ان کی اتنا کوٹھیس لگی اور شان محبوبی کی بنا پر بطور ناز و ادا وہ عرض کیا، خطاب اگر چہ حضور سے تھا مگر مراد عوام تھے جن کی عادت کی ام المومنین نے کما حقہ ترجمانی فرمائی ہے۔ اس وقت وہ عرض کر دیا مگر جب غور فرمایا کہ میں نے کیا کہہ دیا تو بطور معذرت ارشاد فرمایا، میں اس وقت نوعمر بچی تھی، اور قرآن بہت زیادہ نہیں پڑھا تھا۔ اس لیے وہ کلمات منہ سے نکل گئے۔ ام المومنین کی الجھن اور کرب کا اس سے اندازہ لگتا ہے کہ اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام نامی ذہن مبارک میں نہ آیا تو ابا یوسف عرض کیا۔ یعنی اس صورت حال میں میں بھی صبر جمیل کروں گی اور اللہ عزوجل سے استعانت کروں گی، مجھے امید ہے کہ جیسے حضرت یعقوب کو ان کا یوسف گم شدہ مل گیا میری بھی براءت اللہ عزوجل بیان فرمادے گا اور جو ام المومنین کی امید تھی وہ بدرجہ اتم پوری ہوئی۔

پھر حضرت ام المومنین نے سرکار کی جانب سے جو رخ پھیرا تھا یہ بظاہر اعراض ہے مگر اس ظاہری اعراض میں کتنی یگانگت، کتنی کشش، کتنی لذت ہے، وہ ارباب محبت ہی جانتے ہیں۔ اور یہ اس کی دلیل ہے کہ ام المومنین کو پورا وثوق تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو میری پاک دامنی اور براءت پر کامل یقین ہے ورنہ موقع ایسا تھا کہ خوشامد کی جاتی اور انتہائی لجاجت آمیز گفتگو کی جاتی، اور ایسی حرکت ہوتی جو ان کی مظہر ہو، مگر سچے محبت و محبوب کا رابطہ خوشامد لجاجت سے بالا ہے وہ ایک محبوب خوب جانتا ہے کہ میرے محبت کو میری کیا ادا پسند ہے۔

یہی نہیں اسود کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں نے چھڑا لیا۔ اس پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے انہیں ڈانٹا۔ یہ سب وہی محبوبانہ ادائیں ہیں۔ ام المومنین کے قلب مبارک پر اس کا بہت اثر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم نے سنتے ہی اس کی تردید کیوں نہیں فرمائی، جب کہ وہ خوب جانتے تھے کہ میں اس سے بری ہوں۔ اس ماحول میں جب اللہ عزوجل نے ان کی براءت نازل فرمائی، تو یہ محبوبانہ شکوہ اپنے کمال پر پہنچ گیا، جس کا یہ ثمرہ ہوا کہ عرض کیا میں صرف اللہ کی حمد کروں گی وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسی وقت اللہ تعالیٰ نے سیدتنا ام المومنین کی براءت میں سورہ نور کی یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ (الی) وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

بے شک جو لوگ بھاری بہتان لائے وہ تمہاری ہی ایک جماعت ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم لوگ نہیں جانتے۔

سورہ نور کی تفسیر میں ”العشر الآيات“ ہے دس آیتیں مگر یہ دس نہیں نو ہیں، اس کے بعد کی آیت ملائی جائیں تو دس ہوں گی۔

لیکن عطا خراسانی کی روایت میں ہے: ان الذين جاءوا بالافك سے واللہ غفور رحيم تک نازل ہوئیں۔ یہ بارہ آیتیں ہوئیں۔ طبری میں حکم بن عتبہ کی مرویات میں ہے کہ اللہ عزوجل نے پندرہ آیتیں نازل فرمائیں: الخبيثات للخبيثين تک مگر یہ پندرہ نہیں سولہ آیتیں ہیں۔ تفسیر ابن ابی حاتم اور حاکم کی اکیلیں میں سعید بن جبیر سے ہے کہ مسلسل اٹھارہ آیتیں نازل فرمائیں۔

اس عاجز کی رائے یہ ہے کہ صحیحین کی روایت راجح ہے کہ پہلے دس آیتیں نازل ہوئیں، اس پر واقعات کی ترتیب دلیل ہے۔ آیت کریمہ: وَلَا يَأْتِلِ أَوْلُوا الْفُضْلِ مِنْكُمْ وَالشُّعْبَةَ كَامُضْمُونَ بتا رہا ہے کہ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قسم کے بعد نازل ہوئیں، اور یہ بھی طے ہے کہ آیات براءت کے نزول کے بعد انہوں نے وہ قسم کھائی تھی۔ زنجبیری نے کہا مختصر اور جامع عبارت کے ساتھ اتنی سخت وعید کسی معصیت میں وارد نہیں وہ بھی مختلف اسلوب اور متعدد طریقوں کے ساتھ کہ ان میں ہر ایک اپنی جگہ کافی اور وافی ہے، حتیٰ کہ بت پرستوں کے بارے میں بھی اتنی سخت وعیدیں اور اتنا تند و تیز لہجہ استعمال نہیں ہوا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ سارے دین کے دار و مدار حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اس فتنے کے بانی اور سربراہ عبد اللہ بن ابی کاغشا یہ تھا کہ اگر اس میں کامیاب ہو گئے تو پھر لوگوں کو یہ باور کرانا آسان ہوگا کہ جو شخص اپنی سب سے زیادہ محبوب بیوی کے اندر پاک دامنی کا جذبہ نہیں پیدا کر سکا، اور جس کی شب و روز کی صحبت اسے ایسی گندگی سے محفوظ نہیں رکھ سکی وہ اللہ کا رسول کیسے ہو سکتا؟

پھر اس بہتان پر یقین کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یقیناً حضرت ام المومنین کو طلاق دے دیتے جس کا اثر حضرت صدیق اکبر پر پڑتا۔ وہ کم ظرف یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس کے نتیجے میں حضرت صدیق اکبر، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے علاحدہ ہو جائیں گے، اور مہاجرین کا ایک طبقہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے الگ ہو جائے گا، یوں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے ایک بڑے معاون سے محروم ہو جائیں گے، اور یہ ہم سے مل جائیں گے۔ یوں اس نے اپنا ڈبل فائدہ سوچا ہوگا۔ اس لیے اللہ عزوجل نے سخت سے سخت تیز سے تیز اسلوب میں اس کا رد بلیغ فرمایا تاکہ آئندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا سداً باب ہو جائے۔

کتاب المغازی اور کتاب التفسیر میں اس کے بعد یہ زائد ہے:

و طفقت اختها حمنة تحارب لها فهلكت فيمن هلك قال ابن شهاب
فهذا الذي بلغني من حديث هولاء الرهط ثم قال عروة قالت عائشة والله ان
الرجل الذي قيل له ما قيل ليقول سبحان الله فوالذي نفسي بيده ما كشفت
من كنف اني قط قالت ثم قتل بعد ذلك في سبيل الله .

اور ام المومنین حضرت زینب کی بہن حمنا ان کے لیے لڑتی رہتی اور ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو کر ہلاک ہو گئی، ابن شہاب نے کہا کہ اس گروہ کی جو حدیث مجھے پہنچی ہے وہ یہ ہے، اس کے بعد عروہ نے روایت کیا کہ ام المومنین حضرت عائشہ نے کہا بخدا! اس شخص نے (صفوان) جس کے بارے میں یہ کہا گیا۔ یہ کہتا رہا سبحان اللہ! (یہ کہا جا رہا ہے) اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! میں نے کبھی کسی عورت کا ستر نہیں کھولا ہے۔

ام المومنین نے فرمایا: اس کے بعد وہ راہِ خدا میں شہید ہوا۔

ہشام بن عروہ کی حدیث کے اخیر میں ہے:

”وكان الذي تكلم به مسطح و حسان بن ثابت و المنافق عبد الله بن

ابی وهو الذي يستوشيه والذي تولى كبره هو و حمنة“

اسے مسطح، حسان بن ثابت اور عبد اللہ بن ابی منافق نے پھیلایا۔ عبد اللہ بن ابی بنی

وہ ہے جس نے اس میں سب سے زیادہ حصہ لیا، اور حمنہ نے۔

حمنہ بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المومنین حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی

حقیقی بہن تھیں۔ ان دونوں کی والدہ امیمہ بنت عبد المطلب ہیں۔ یہ بیعت کرنے والی

خواتین میں تھیں۔ جنگِ احد میں شریک تھیں، پانی پلاتیں، زخمیوں کو اٹھلاتیں، علاج کرتیں۔

پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ ان کی شہادت کے بعد

طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جہادِ عقد میں آئیں جن سے محمد سجاد اور عمر تولد ہوئے۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو خیبر کی پیداوار سے تین وسق دیا تھا۔ بہن کی

حمایت میں ان سے یہ لغزش ہو گئی اور طبیعت میں جوش تھا، اس لیے حد سے آگے بڑھ گئیں۔

ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ آیاتِ براءت کے نزول کے بعد حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور جن لوگوں نے یہ افواہ پھیلائی تھی، ان میں سے حضرت حسان

بن ثابت اور حضرت مسطح بن اثاثہ اور حضرت حمنہ بنت جحش پر حدِ قذف جاری فرمائی۔ ان

میں عبد اللہ بن ابی کا ذکر نہیں۔ جب کہ وہی اس کا بانی مبنی تھا، غالباً یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ

منافق تھا۔ اس کے ساتھ ایک جتھا تھا۔ نیز قبائلی عصبیت بالکل ختم نہیں ہوئی تھی، اس کا

اندیشہ رہا ہو کہ اندرونِ شہر کوئی خلفشار پیدا ہو جائے اور مخالفین کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع

مل جائے کہ لو اب جن لوگوں نے انہیں پناہ دیں انہیں سے لڑنے لگے۔ ویسے امام حاکم کی

اکلیل میں ابو اویس کی روایت میں جو حسن بن زید اور عبد اللہ بن ابوبکر بن حزم وغیرہ سے ہے

کہ اس پر بھی حد قائم کی گئی۔

یہ واقعہ اگرچہ انتہائی دل خراش ہے اور اس کے اثر سے ام المومنین حضرت عائشہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو انتہائی ذہنی اعصابی اذیت اٹھانی پڑی۔ بلکہ خود حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی انتہائی الجھن میں گرفتار کر دیا، مگر اس کی برکتیں بے شمار ہیں۔ سند الحفاظ علامہ ابن حجر نے سورہ نور کی تفسیر کی تو اس حدیث کے سو سے زائد فوائد بیان فرمائے ہیں۔ علامہ بدرالدین محمود عینی نے اس میں مزید اضافے فرمائے اس خادم کے ذہن میں ان دونوں حضرات کے فوائد کے علاوہ مزید فوائد ہیں۔ خصوصیت سے اس واقعہ کے نتیجے میں زنا اور تہمت زنا کی سزاؤں کا نزول وہ برکت ہے کہ قیامت تک کے لیے ان گنت عورتوں کی عصمت محفوظ ہوگئی، اور شتر بے مہار عوام میں ذرا ذرا سے شبہات پر الزام و اتہام کی عادت ہے۔ اس پر سخت قدغن لگ گیا، مجھے چوں کہ اختصار مقصود ہے، اس لیے تفصیل سے درگزر کرتا ہوں۔

ایک فریب کی پردہ دری:-

منافقین نے تو اسلام پر ضرب کاری لگانے کی نیت سے یہ بہتان باندھا تھا، جس کا بالکل قلع قمع قرآن مجید نے کر دیا۔

مگر آج کل وہابی اسے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم وسیع و اوسع کی تنقیص کے لیے دستاویز بنائے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم غیب جانتے تھے تو پریشان کیوں تھے، ان معاندین سے خطاب بے کار لیکن انصاف پسند ناظرین کی خدمت میں چند باتیں معروض ہیں۔ حدیث کے متن پر ایک نظر پھر ڈال لیں۔

(۱) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب اس سلسلے میں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش، حضرت اسامہ، حضرت بریرہ وغنی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا تو سب نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی پاکدامنی کو بیان کیا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس پر سکوت فرمایا جو بمنزلہ تقریر ہے۔ یعنی اس قول کی تصدیق ہے اور تصدیق اسی وقت ہوگی جب کہ اس کے سچ ہونے پر یقین ہو، اور یہ باتیں قول کی تصدیق ہے۔ اس لیے بظاہر یہ ایک تصدیق حقیقت میں تین تصدیق ہے۔

(۲) پھر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا منبر پر تشریف لے جا کر علانیہ فرمانا: من

يعذرني من رجل بلغني اذاه في اهلي۔ اس شخص کے مقابلے میں میری کون مدد کرے گا، جس کی اذیت ناک باتیں مجھ تک پہنچی ہیں۔

یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس بات کا یقین تھا کہ ام المومنین پاک دامن ہیں، اور یہ بہتان عظیم ہے۔ کیوں کہ اگر اس میں شک ہوتا تو بہتان طرازوں کے مقابلے میں صحابہ کرام سے نہ فرماتے کہ اس بارے میں میری کون مدد کرے گا؟۔

(۳) پھر فرمایا ”والله ما علمت على اهلي الا خيرا“ خدا کی قسم! مجھے اپنی اہلیہ کے بارے میں اچھائی کے سوا اور کچھ علم نہیں۔

برسر منبر قسم کھا کر صفائی کے باوجود یہ کہنا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بارے میں شک میں تھے۔ اس ارشاد کو جھٹلانا ہے۔

(۴) پھر حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں فرمایا: ”وقد ذكروا رجلا ما علمت عليه الا خيرا“ اور ایسے شخص کا ان لوگوں نے اس سلسلے میں نام لیا ہے جس کے بارے میں خیر کے سوا مجھے اور کچھ علم نہیں۔

یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کا یقین کامل تھا کہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ ہے اور افترا ہے۔

وجہ اضطراب:

رہ گیا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اس واقعہ سے اضطراب یہ بہ تقاضائے بشریت تھا کسی بھی شریف انسان کی اہلیہ پر اور وہ بھی سب سے زیادہ عزیز اہلیہ پر کوئی بہتان باندھے اور علانیہ اس کا پروپیگنڈہ کرے تو یہ فطری بات ہے کہ وہ پریشان اور بے چین ہوگا۔ اگرچہ اس کا یقین ہو کہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ خالص افترا ہے۔

رہ گیا کہ حضرت بریرہ وغیرہ سے دریافت فرمایا۔ یہ لاعلمی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس

لیے تھا کہ دوسروں کو مطمئن کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے کہ مجھ کو عنہ کے خصوصاً قریب رہنے والے جب اس کے بارے میں صفائی دیں گے تو اسے ہر دیانت دار اور انصاف پسند قبول کر لے گا۔

رہ گیا خود ام المومنین سے جو فرمایا: اے عائشہ! تمہارے بارے میں مجھ تک ایسی ایسی باتیں پہنچی ہیں الخ..... یہ بھی اس اعلان کے بعد کہ مجھے اپنی اہلیہ کے بارے میں خیر کے سوا اور کسی بات کا علم نہیں۔ اس کی دلیل نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس سلسلے میں کوئی شک تھا، بلکہ یہ اس بنا پر تھا کہ کوئی کہہ سکتا تھا کہ خود منبر پر آ کر صفائی دے رہے ہیں۔ مخالفین کے مقابلے پر مدد کے لیے بلا رہے ہیں، اور جس پر الزام لگا ہے، اس سے پوچھا تک نہیں، یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ جس پر بھی کوئی الزام لگایا جائے، اس سے سوال کیا جائے، یہ ضابطے کی خانہ پری تھی تاکہ ایک نظیر قائم ہو جائے۔

اس واقعے میں حضرت صدیق اکبر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے اعلیٰ

فضائل کے متعدد پہلو ہیں۔

(۱) یہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قلب پاک میں ان دونوں کی عظیم وقعت کی بین دلیل ہے۔ ایک سیدھی سادی بات ہے کہ کسی شخص پر یہ واجب نہیں کہ کسی بھی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھے، اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معاملہ تو ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اس فتنے کا آسان حل یہ تھا کہ علاحدگی اختیار فرما لیتے، مگر یہ حضرت صدیق اکبر اور خود ام المومنین کے لیے کتنا بڑا سانحہ ہوتا وہ ظاہر ہے کہ ان دونوں پر کیا گزرتی بتانے کی بات نہیں۔ مگر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان دونوں کی دل داری بلکہ دل نوازی کے لیے اس آسان حل پر عمل نہیں فرمایا، بلکہ ابتداءً اس فتنے کو فرو کرنے کے لیے صحابہ کرام کو جمع فرمایا اور ان سے مدد کی درخواست کی، اور پھر ایک مہینے تک وحی ربانی کا انتظار فرمایا۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان دو ذوں کا دل شکستہ ہونا پسند نہیں تھا۔

(۲) حضرت صدیق اکبر کے ساتھ مہاجرین کی کثیر تعداد تھی، اور انصار کرام ان کا بے حد احترام کرتے تھے، وہ چاہتے تو جو لوگ اس واقعے میں ملوث تھے، طاقت کے ذریعہ کا ان کا منہ بند کر سکتے تھے، مگر وہ ایک دم خاموش رہے، صرف ایک بار فرمایا تو یہ فرمایا: بخدا! جاہلیت میں ہمارے بارے میں ایسی بات کبھی کسی نے نہیں کہی۔ پھر اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام سے عزت دی۔ یہ کیسے کہا جا رہا ہے۔

مگر ظاہر ہے کہ وہ اگر کوئی سخت اقدام کرتے تو مسلمانوں میں لڑائی کا اندیشہ قویہ تھا جس سے اسلام کی اشاعت میں خلل پڑتا۔ اس لیے زہر کا گھونٹ پیتے رہے اور خاموش رہے۔ اسلام کی بہبود کی خاطر اتنے عظیم حادثے کے وقت راضی برضائے الہی رہنا صدیق اکبر ہی کی شان تھی۔ یہ ان کی اسلام کے ساتھ خیر خواہی، تدبیر، دور اندیشی، تحمل، استقامت اور توکل علی اللہ اور رضا بالقضا کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہونے کی برہان قاطع ہے۔

(۳) حضرت مسطح بن اثاثہ نے اس میں کھل کر بھر پور حصہ لیا تھا، حتیٰ کہ خود ام المومنین سے مروی بعض طرق میں ہے کہ ”الذی تولى کبرہ“ جس نے اس میں زیادہ حصہ لیا، میں یہ بھی داخل تھے۔ اس لیے انہوں نے قسم کھالی کہ اب مسطح کو کچھ نہیں دوں گا۔ مگر جب آیت کریمہ نازل ہوئی۔

”وَلَا يَسْأَلُ اَوْلُوا الْفَضْلَ مِنْكُمْ وَالشَّعْبَةُ اَنْ يُؤْتُوْا اَوْلِيَ الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ“

اور جو لوگ مال دار فراخ رزق ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ رشتہ داروں کو کچھ نہیں دیں گے۔ تو فوراً سارا غیظ و جلال ختم ہو گیا، اور حکم ربانی کے حضور سر تسلیم خم کر دیا۔ اپنی لخت جگر نور نظر، سرور قلب و جگر کے خلاف وہ بھی کون جو محبوبہ محبوب رب العالمین ہو ایسی گندگی اور وہ بھی بے بنیاد اچھالنے والے پر بحکم خداوندی دوبارہ داد و دہش کرنا اس کی دلیل ہے کہ وہ ہر وقت ہر آن ہر لحظہ رضائے الہی کے طالب تھے، اور وہ بلاشبہ اس آیت کریمہ کے سب سے اعلیٰ مصداق تھے۔

”وَسَيَجْنِبُهَا الْاَلْفَى الَّذِى يُؤْتِى مَالَهُ يَتَزَكَّى“

اور وہ جہنم سے بہت دور رکھا جائے گا جو سب سے بڑا پرہیزگار ہے اور مال اس لیے خرچ کرتا ہے تاکہ پاکیزہ رہے۔

(۴) حضرت ام المومنین کی براءت میں دس آیات نازل ہوئیں۔ بارگاہِ خداوندی میں ان کا کتنا اعزاز تھا، وہ اس سے ظاہر ہے۔ اور پھر ان آیات کے سیاق میں قبر و جلال کی کوندتی ہوئی بجلیاں اس کی دلیل ہیں کہ جبار و قہار مولیٰ عزوجل ام المومنین کے مخالفین سے اعلانِ جنگ فرما رہا ہے۔ کیا یہ اس کی دلیل نہیں کہ ام المومنین بارگاہِ قدس کے محبوبوں کی اولین صف میں ہیں۔

اس حدیث میں ام المومنین کی ذہانت و فطانت، اصابتِ رائے، فصاحت و بلاغت، زورِ بیان اور واقعات کے اسباب و نمل کا اظہار جس حسنِ خوبی سے ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ اسے دقیق نظر اور اہل معرفت ہی محسوس کر سکتے ہیں، جن میں بعض کی طرف میں نے اشارے کر دیئے ہیں۔



باب دوم

تواریخ و سیر

تاریخ ولادت نبوی

سوال:-

۱:- ایک کتاب جمعیتہ العلماء ہند نے نکالی ہے جس کا نام ”دینی تعلیم“ ہے، درجہ دوم کے لیے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضور کی پیدائش کی صحیح تاریخ ۹ ربیع الاول ہے، سوموار کا دن ہے۔ ۱۲ ربیع الاول غلط ہے، اس کی تشریح کی جائے دوسری کتابوں میں ۲۰ اپریل ۱۷۵۷ء ہے، یہ صحیح ہے یا غلط اس کی تشریح کریں۔

۲:- اسی کتاب میں یہ مضمون درج ہے کہ کعبہ شریف کے پاس ایک دفعہ حضور کو گھیر لیا، سب طرف سے لوگ ہمارے حضرت پر ٹوٹ پڑے، حارث بن ابی ہالہ (حضرت خدیجہ کے لڑکے) گھر میں تھے، ان کو خبر ہوئی دوڑے آئے اور ہمارے حضرت کو بچانا چاہا لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑیں اور وہ شہید ہو گئے، یہ عبارت کہاں تک درست ہے۔

الجواب:-

۱:- شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں یہی لکھا ہے کہ ولادت پاک ۹ ربیع الاول کو ہوئی، اور یہ اس کی اپنی تحقیق نہیں بلکہ مصر کا ایک ہیئت داں ملا محمود فلکی گزرا ہے، اس کا حساب ہے۔ نئے مصنفین اسی کی تقلید جاہد کر رہے ہیں۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا ایک مضمون ”تحفہ حنفیہ“ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۸ھ میں چھپ چکا ہے، اسے بعینہ نقل کر دیتا ہوں۔

فرماتے ہیں:

دو، آٹھ، دس، بارہ، سترہ، اٹھارہ، بائیس، سات قول ہیں (یعنی تاریخ ولادت میں اتنی روایتیں ہیں) مگر اشہر و اکثر و ماخوذ و معتبر دوازدہم ربیع الاول شریف ہے۔ مکہ معظمہ میں ہمیشہ اسی تاریخ میں مکان مولد اقدس کی زیارت کرتے ہیں، کذافی المواہب والمدارج۔ اور خاص اسی مکان جنت نشان میں اسی تاریخ میں مجلس میلاد مقدس ہوتی ہے۔ کذافی

المدارج - علامہ قہستانی وفاضل زرقانی فرماتے ہیں:

المشهور انه صلى الله تعالى عليه وسلم ولد يوم الاثنين ثانی عشر ربيع الاول وهو قول محمد بن اسحاق امام المغازی وغيره وعليه العمل. مشہور یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دو شنبہ کے دن بارہ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔ یہی امام مغازی ابن اسحاق وغیرہ کا قول ہے، اور اسی پر عمل ہے۔

شرح مواہب میں امام ابن کثیر سے ہے:

المشهور عند الجمهور .

اسی میں ہے:

هو الذي عليه العمل

شرح البہزیہ میں ہے:

هو المشهور وعليه العمل

اسی طرح مدارج وغیرہ میں تصریح کی۔ (قال اعلى حضرت قدس سرہ المزین)

وان كان اكثر المحدثين والمورخين على ثمان خلون وعليه اجمع

اهل الزيجات واختاره ابن حزم والحمیدی وروی عن ابن عباس وجبیر بن

مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہم وبالاول صدر مغلطانی واعتمده النہبی فی

تنہیب التہذیب تبعاً للزمزی فی التہذیب وحکی المشہور بقیل صحیح

الدمیاطی عشر اخلت القول وحاسبنا فوجدنا غرة المحرم الوسطية عام ولادته

صلى الله تعالى عليه وسلم يوم الخميس فكانت غرة شهر الولادة الكريمة

الوسطية يوم الاحد والهلالية يوم الاثنين فكان يوم الاثنين الثامن من الشهر

ولذا اجمع عليه اهل الزيج وبمجرد ملاحظة الغرة الوسطية يظهر استحالة

سائر الاقوال ما خلا الطرفين والعلم بالحق عند مقلب الملونين.

اگرچہ اکثر محدثین اور مورخین آٹھ تاریخ مانتے ہیں اور اسی پر اہل سنت کا اجماع ہے

اور اسے ابن حزم اور حمیدی نے اختیار کیا۔ ابن عباس اور جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم سے مروی

ہے۔ پہلا قول صدر مغلطائی کا ہے۔ اور اسی پر ذہبی نے تذبذب میں صاحب تہذیب مزی کی اتباع میں اعتماد کیا، اور قول مشہور کو قیل سے نقل کیا۔ دمیاطی نے دس تاریخ کی تصحیح کی۔ "اقول" میں نے حساب لگایا تو سن ولادت کے محرم کے غرہ وسطیہ کو پنجشنبہ کے دن پایا۔ تو ماہ ولادت مبارکہ کا غرہ وسطیہ یک شنبہ کو ہوا اور ہلالیہ دو شنبہ کو۔ پس دو شنبہ کو آٹھ ربیع الاول ہوئی۔ اسی وجہ سے اس پر اہل ہیئت نے اجماع کیا۔ محض غرہ وسطیہ کے دیکھنے سے تمام اقوال کا محال ہونا ظاہر ہو جائے گا، علاوہ قول اول و اخیر کے (یعنی دو اور بائیس کے) اور حقیقی علم شب و روز بدلنے والے کے ہے۔

اور شک نہیں کہ تلقی امت بالقبول کے لیے شان عظیم ہے۔ یوم عید میلاد والا بھی کہ عید اکبر ہے، قول و عمل و جمہور ہی کے مطابق بہتر ہے۔ "فلاحق للعمل ما علیہ العمل ملخصاً"

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ ولادت کے بارے میں اگرچہ اقوال سات ہیں مگر قول مشہور و معمول بہ قول جمہور ہے یعنی بارہ ربیع الاول ہے مگر تلقی امت بالقبول کی وجہ سے عمل کے لیے ۱۲ ربیع الاول کا دن بہتر ہے۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی اس تحقیق سے ظاہر ہو گیا کہ ولادت باسعادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول کسی طرح درست نہیں روایتا تو ظاہر ہے کہ ۹ ربیع الاول کا کوئی قول نہیں۔ درایۃ یوں کہ تمام ماہرین فلکیات اصحاب زجاج اس پر متفق ہیں کہ عام ولادت ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو دو شنبہ تھا، اس حساب سے دو شنبہ پھر آٹھ ربیع الاول کو پڑے گا، لہذا آٹھ ربیع الاول کی ولادت پاک ہوئی، نو کونہ دو شنبہ پڑتا ہے، نہ نو کو ولادت ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ یوم ولادت دو شنبہ کا دن قریب قریب متفق علیہ ہے پھر یہ کہ یہ معاملہ تاریخی ہے اور تاریخ میں روایت کو درایت پر یقیناً ترجیح ہے۔ کون واقعہ ہوا اسے عقل سے سوچ کر نہیں معلوم کر سکتے، کسی سے سن کے معلوم کر سکتے ہیں۔ ہاں! یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جب روایتیں متعارض ہوں تو کسی ایک روایت کو قیاسات سے ترجیح دے سکتے ہیں، یہاں جب کہ روایتیں کثیر ہیں تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی روایت کو علم ہیئت کے اصول سے ترجیح دیں لیکن

ان روایت کے برخلاف ایک الگ احتمال پیدا کرنا خصوصاً وہ احتمال جو اس فن کے ماہرین کے متفقہ فیصلے کے خلاف ہو، اس بات کی دلیل ہے کہ حساب لگانے والے سے کہیں چوک ہوگئی ہے۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی اس فن میں مہارت اتنی تھی کہ وہ اپنے عصر میں یکتا تھے ان کا بھی حساب سابق اصحاب زنج کے مطابق آتا ہے، اس لیے ۹ ربیع الاول والے قول کی ترجیح کسی طرح لائق قبول نہیں۔

۲:- سیرۃ النبی میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ اصحاب یہاں موجود نہیں کہ آپ کو پورے طور سے مطمئن کروایا جائے۔ مواہب اللدنیہ اس کی شرح زرقانی مدارج میں دیکھا گیا نہ یہ واقعہ ملا نہ حضرت خدیجہ کے کسی صاحبزادے کا نام حارث ملا۔ ہاں! اتنا ضرور ملا کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دو صاحبزادے ابو ہالہ سے تھے، ایک کا نام بند تھا، اور ایک کا ہالہ۔ یہ دونوں صحابی ہیں۔ ہند رضی اللہ عنہ سے روایت بھی ہے، علیہ مبارک انہیں سے مروی ہے۔ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ حضرت ہالہ کا اتنا ذکر ہے کہ وہ سرکار کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوئے کہ سرکار دوپہر میں سو رہے تھے انہیں دیکھ کر سینہ سے چمٹا لیا اور خوشی میں فرمایا: ہالہ! ہالہ! ہالہ! ہو سکتا ہے کہ انہیں کو حارث بھی کہتے ہوں، اور یہی اس واقعہ میں شہید ہوئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کوئی اور صاحب ہوں، یہ حضرات ان پر مطلع نہ ہوئے یا مطلع ہوئے کہیں ذکر کیا ہو ہمیں نہ ملا۔ بہر حال! اس واقعہ میں آپ کو استبعاد کیا ہے کہ آپ نے سوال کیا؟

☆☆☆

عید میلاد النبی ﷺ

محفل میلاد شریف جس ہیئت کے ساتھ اس زمانہ میں رائج و معمول ہے۔ وہ بلاشبہ جائز اور مستحسن اور باعث خیر و برکت ہے، اور پوری دنیا نے اسلام میں برسہا برس سے رائج و معمول ہے۔ اجلہ علمائے کرام، محدثین و فقہائے عظام نے اس کے جواز و استحسان کی تصریحیں کی ہیں، اور بلاشبہ قرآن و حدیث سے اس کا جواز و استحسان ثابت ہے۔

احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں: اول وہ جن کے اوقات اور ہیئت کی مقدار معین ہے۔ ان کے لیے احادیث میں پوری تفصیل موجود ہے کہ فلاں وقت کی جائیں، اس ہیئت سے ادا کی جائیں، اتنی مقدار میں ادا کی جائیں۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ شریعت نے جس وقت اور جس ہیئت سے ادا کرنے کا حکم دیا ہے اسی طرح ادا کی جائیں۔ ان میں کمی، بیشی رد و بدل جائز نہیں۔ مثلاً نماز کے لیے متعین ہے کہ دو رکعت سے کم نہ پڑھی جائے، ہر رکعت میں ایک قیام ایک رکوع دو سجدے ہوں۔ پہلے قیام ہو پھر رکوع ہو پھر سجدے ہوں۔ ہر دو رکعت پر قعدہ ہو۔ روزے کے لیے تعین ہے کہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک ہی ہو، رات میں نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے وہ جن کا حکم مطلق ہے۔ ان کے لیے نہ وقت مقرر ہے، نہ ہیئت، نہ مقدار۔ جیسے تلاوت قرآن مجید، ذکر خدا و ذکر رسول، درود شریف، ان کا حکم یہ ہے کہ کرنے والا جس وقت چاہے کرے۔ جس طرح چاہے کرے، جس مقدار میں چاہے کرے۔

اصول الشاشی وغیرہ تمام اصول فقہ کی کتابوں میں تصریح ہے کہ "حکم المطلق ان الآتی بای فرد کان آتیا للمأمور بہ" یعنی مطلق حکم یہ ہے کہ جس فرد کو بھی کوئی ادا کرے گا، مامور بہ کو ادا کرے گا، مثلاً ایک شخص روزانہ نماز فجر کے بعد قبلہ رخ چہار زانو بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے۔ قرآن و حدیث میں کہیں ذکر نہیں کہ نماز فجر کے بعد تلاوت

کرو۔ اس کے باوجود اس وقت اس طرح تلاوت کرنا عبادت ہے، اور کارِ ثواب ہے۔ بات وہی ہے کہ چوں کہ تلاوت کا حکم مطلق ہے، ہم جس طرح جس وقت بھی تلاوت کریں گے، وہ خدا کی عبادت ہی ہوگی۔ جب تک کہ کسی خاص وقت کی ممانعت نہ ہو۔ میلاد شریف اور اس میں قیام و سلام اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ.

اپنے رب کی نعمت کا خوب خوب چہ چا کرو۔

اور فرمایا گیا:

قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا.

فرمادو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوشی مناؤ۔

ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ اللہ عزوجل کا سب سے بڑا فضل اور اس کی سب سے بڑی نعمت اور رحمت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ جب اللہ عزوجل نے اپنی ہر نعمت کا زیادہ سے زیادہ چہ چا کرنے اور ہر فضل و رحمت پر خوشی منانے کا حکم دیا ہے تو جو اللہ عزوجل کی سب سے بڑی رحمت و نعمت اور فضل ہیں، ان کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے اور ان پر زیادہ سے زیادہ خوشی منانے کا حکم ان آیتوں سے ثابت ہو گیا۔ یہاں بھی اللہ عزوجل نے زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے اور خوشی منانے کا مطلق حکم دیا ہے۔ اس کی کوئی تعین و تخصیص نہیں فرمائی۔ لہذا زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے اور خوشی منانے کا جو بھی جائز طریقہ ہو سب اس میں داخل ہیں۔ جب تک کہ کسی خاص طریقہ سے شریعت میں ممانعت نہ آئی ہو۔ میلاد شریف کی محفل اور میلاد النبی کا جلوس یہ سب اسی کی فرع ہیں کہ یہ ضرور بالضرور زیادہ سے زیادہ ذکر کرنے اور خوشی منانے کا ایک طریقہ ہے، جس سے شریعت میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ اس کا ثبوت ہے۔

جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو صحابہ کرام نے بہت عظیم الشان جلوس نکالا تھا۔ اسی طرح غزوہ تبوک سے واپسی پر بے مثال

جلوس نکالا تھا۔ ہجرت والے جلوس میں جوش مسرت میں یا رسول اللہ، یا رسول اللہ کا نعرہ بھی لگائے تھے۔

مسلم شریف جلد ثانی صفحہ ۴۱۹ پر ہے:

ینادون یا محمد یا رسول اللہ یا محمد یا رسول اللہ

اس سے ثابت ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے جلوس نکالنا اور اس میں یا رسول اللہ یا رسول اللہ کا نعرہ لگانا صحابہ کرام کی سنت ہے۔ اسے بدعت کہنا، شرک کہنا صحابہ کرام کو بدعتی یا مشرک بنانا ہے۔ بلکہ خود حضور اقدس سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس لئے کہ اس جلوس میں حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ حضور کے سامنے ہی یا رسول اللہ کا نعرہ لگا، حضور نے اس کو سنا اور صحابہ کرام کو منع نہیں فرمایا، تو حضور بھی بقول مخالفین اسی زمرے میں داخل ہو گئے۔

حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

صوموا لاثین لانی فیہ ولدت

دوشنبہ کو روزہ رکھو اس لیے کہ میں اسی دن پیدا ہوا۔

اس سے ثابت ہوا کہ یوم ولادت کی یاد باقی رکھنے کے لیے روزہ رکھنا مسنون ہے۔ اور اسی کے حکم میں ہر کار خیر ہے۔ میلاد شریف کی محفل بلاشبہ اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی محفل ہے۔ اور بلاشبہ کار خیر ہے۔ حضور اقدس رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی بشارت ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے جب اس کو دی، تو اس خوشی میں اس کو آزاد کر دیا۔ ابولہب کے مرنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو خواب دیکھا، پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے بتایا کہ جہنم میں ہوں مگر ہر دوشنبہ کو عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اور ان دو انگلیوں سے پانی چوستا ہوں اور یہ اس کا انعام ہے کہ جب ثویبہ نے ولادت اقدس کی بشارت دی تھی تو میں نے اسے آزاد کر دیا تھا، اور اس کو دودھ پلانے کا حکم دیا تھا۔ اس پر علامہ ابوالخیر شمس الدین ابن جزری فرماتے ہیں:

فاذا كان هذا الكافر الذي نزل القرآن بدمه جوزى في النار بفرحه

لیلة مولده به فما حال المسلم الموحد من امته عليه السلام يسر بمولوده
ويبذل ما اتصل اليه قدرته في محبته صلى الله تعالى عليه وسلم لعمرى الما
يكون جزاءه من الله الكريم ان يدخله جنات النعيم ولا زال اهل الاسلام
يحتفلون بشهر مولده عليه الصلوة والسلام ويعملون الولائم ويتصدقون في
لياليه بانواع الصدقات ويظهرون السرور، ويزيدون في المبرات ويعتنون
بقراءة مولده الكريم ويظهر عليهم من بركاته كل فضل عميم ومما جرب من
خواصه انه امان في ذلك العام وبشرى عاجلة نبيل البهية والمرام، فرحم الله
امرا اتخذ لياالي شهر مولده المبارك اعيادا ليكون اشد علة على من في قلبه
مرض وعينه داء .

جب کہ اس کافر کو جس کی مذمت میں قرآن نازل ہوا، ولادت کی خوشی پر یہ انعام
ملا تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مسلمان امتی اگر ولادت اقدس پر خوشی منائے
اور حضور کی محبت میں مقدرت بھر خرچ کرے اس کا کیا حال ہوگا۔ بقسم اس کا انعام رب کریم
کی طرف سے جنات نعیم ہے۔

مسلمان مدت دراز سے شہر بیچ الاول کا اہتمام کرتے ہیں۔ کھانا کھلاتے ہیں۔ ہر
قسم کی خیرات کرتے ہیں، خوشی ظاہر کرتے ہیں۔ واقعہ ولادت پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
اس کی برکت سے ان پر ہر طرح کا فضل عظیم ظاہر ہوتا ہے۔ میلاد شریف کے خواص میں سے
مغرب ہے کہ یہ اس سال کے لیے امان ہے، اور مقصد حاصل کرنے کے لیے بشارت عاجلہ
ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو بیچ الاول شریف کی مبارک راتوں
کو عید منائے تاکہ جس کے دل میں بیماری ہو اسے جلد چھوڑے۔

علامہ خطیب احمد قسطلانی شارح بخاری نے اور علامہ عبدالباقی زرقانی نے اس کو
مواہب لدنیہ اور اس کی شرح میں نقل فرمایا اور اس کو باقی رکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ
حضرات اس سے متعلق ہیں۔

سند الخطا میں علامہ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری نے اس کے استحسان پر اس

حدیث شریف سے استدلال فرمایا کہ حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہودیوں کو دیکھا کہ وہ یوم عاشورہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ دریافت فرمایا اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ اس دن اللہ نے فرعون کو غرق فرمایا تھا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس پر روزہ رکھا تھا، ہم بھی رکھتے ہیں۔ حضور نے فرمایا: تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کی اتباع کے ہم حقدار ہیں۔ حضور نے بھی اس دن روزہ رکھا، اس پر فرماتے ہیں:

ويستفاد منه فعل الشكر على ما من به في يوم معين وای نعمة اعظم
من بروز نبي الرحمة، والشكر يحصل بانواع العبادة كالسجود، والقيام،
والصدقة، والتلاوة.

اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ جس دن اللہ نے کوئی احسان فرمایا ہو، اس دن اللہ کے شکر میں کچھ کرنا چاہیے۔ اور نبی رحمت کی آمد آمد سے بڑھ کر کون سی رحمت ہے؟ اور شکر کا طریقہ مختلف عبادتیں کرنا ہے، جیسے سجدہ، روزہ اور تلاوت، علامہ عبدالباقی زرقانی شرح مواہب میں اسے نقل کر کے فرماتے ہیں:

وسبقه الى ذلك الحافظ ابن رجب.

علامہ ابن حجر سے پہلے حافظ ابن رجب استدلال کر چکے ہیں۔

خاتم الحفاظ علامہ اجل جلالۃ المملۃ والدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواز پر اس حدیث سے استدلال فرمایا کہ حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عقیدہ فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں:

لا تعاد العقیفة مرة ثانية فيحمل على انه فعله شكرا فكذلك
يستحب لنا اظهار الشكر بمولده بالاجتماع واطعام الطعام ونحو ذلك من
وجوه القربان.

عقیدہ دوبارہ نہیں ہوتا۔ اس کو اس پر حمل کیا جائے گا کہ اس کو حضور نے بطور شکر کیا تو ایسے ہی ہمارے لیے مستحب ہے کہ ولادت اقدس پر شکر کے اظہار کے لیے اکٹھا ہوں،

اور کھانا کھلائیں اور اس کے مثل دوسرے نیک کام کریں۔ (زرقاتی علی المواہب)
 نیز شیخ الدلائل شیخ احمد عبدالحق مہاجر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اکیلیل شرح مدارک
 التنزیل میں ان سب باتوں کو نقل فرمایا۔ علاوہ ازیں انہوں نے نقل کیا کہ علامہ شمس الدین محمد
 سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

واصل عمل المولد الشريف لم ينقل عن احد من السلف الصالح في
 القرون الثلاثة الفاصلة وانما حدث بعدها بالمقاصد الحسنة والنية التي
 للاخلاص شاملة ثم لزال اهل الاسلام في سائر الاقطار والمدن العظام
 يحتفلون في شهر مولده صلى الله عليه وسلم وشرف وكرم بعمل الولايم
 البديعة والمطاعم المشتملة على الامور البهيجة الرقيقة ويتصدقون في ليايله
 بانواع الصدقات ويظهرون المسرات ويزيدون في المبرات بل يحتون بقراءة
 مولده الكريم ويظهر عليهم من بر كاته كل فضل عظيم عميم بحيث كان مما
 جرب كما قال الامام شمس الدين الجزري المقرئ المقرب ومن خواصه انه
 امان تام في ذلك العام وبشرى تاجيل بنيل ما يبتغى وپرام .

(اکیلیل : جلد ۱ - ص ۳۹۸)

اس عبارت کا بھی حاصل وہی ہے جو اوپر والی عبارت کا ہے۔ پھر نقل فرمایا:

قال واكثرهم بذالك عناية اهل مصر والشام.

یعنی میلاد شریف کا سب سے زیادہ احترام مصر اور شام والے کرتے ہیں۔

پھر فرمایا:

واما ملوك الاندلس والغرب فلهم فيه ليلة تسير بها الركبان يجتمع
 فيها ائمة علماء الاعلام فتعلوها بين اهل الكفر كلمة الايمان واظن اهل الروم
 لا يتخلفون عن ذلك وبلاد الهند تزيد على غيرها بكثير.

شاہان اندلس اور مغرب، ربیع الاول کی ایک رات میں اتنا اہتمام کرتے ہیں کہ
 لوگ سواریوں پر چل کر آتے ہیں وہاں کے ائمہ اعلام علمائے کرام اکٹھا ہوتے ہیں۔ اس سے

کافروں کے درمیان کلمہ ایمان بلند ہوتا ہے۔ میرا گناہ ہے کہ اہل روم بھی اس سے پیچھے نہیں رہتے۔ اور بلا ہند سب سے بڑھ کر اس میں حصہ لیتا ہے۔

فرماتے ہیں:

واما بعجم فمن حيث دخل هذا الشهر والزمان المكرم لاهلها مجالس فخام من انواع الطعام للقراء الكرام والعلماء العظام وللفقراء النخاص والعام وقراءة الختمات والتلاوات المتلويات والانشادات المعتمدات واجناس المبررات والخيرات وانواع السرور واصناف الحبور ومن تعظيم مشائخهم وعلمائهم هذا المولد العظيم والمجلس المكرم انه لا ياباه احد في حضوره رجاء ادراك نوره وسروره.

جب یہ عظمت والا مہینہ (ربیع الاول) داخل ہوتا ہے تو عجم والے بڑی بڑی محفلیں منعقد کرتے ہیں، جس میں قراء علماء، فقرا کے لیے قسم قسم کے کھانے تیار کرتے ہیں۔ مسلسل قرآن مجید کی تلاوتیں ہوتی ہیں۔ اور معتمد اشعار پڑھے جاتے ہیں۔ قسم قسم کی خیرات ہوتی ہے۔ طرح طرح کی خوشی ظاہر کرتے ہیں۔ چونکہ علمائے کرام اور مشائخ عظام اس میلاد پاک اور محفل مقدس کا ادب بجالاتے ہیں، اس لیے ہر شخص اس محفل پاک کے نور و سرور کے حصول کی امید پر بلا انکار اس میں شریک ہوتا ہے۔

پھر نقل فرمایا:

قال السنخاوی واما اهل مكة فيتوجهون الى محل مولده رجاء بلوغ كل منهم بذلك بمقصدہ ويزيد اهتمامهم به على يوم العيد حتى قل ان يخلف عنه احد من صالح وطالح لاسيما الشريف صاحب الحجاز واهل المدينة به وعلى فعله اقبال وكان للملك المظفر صاحب اربل رحمه الله بذلك فيها اتم العناية واهتمامها مع شانه جاوز الغاية التي عليه به العلامة ابو شامه احد شيوخ السنوي وقال مثل هذا الحسن يندب عليه ويشكر فاعله ويشني عليه. زاد ابن الجزري ولم يكن في ذلك الا ارغام الشيطان وسرور

الایمان . (اکلید جلد: ۴، توبہ: صفحہ: ۲۹۹)

علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ مکہ والے شب ولادت میں (جائے ولادت اقدس) کی زیارت کرنے جاتے ہیں۔ اس امید پر کہ اس سے ان کا مقصد پورا ہوگا۔ اور اس کا اہتمام عید کے دن سے زیادہ کرتے ہیں۔ نیک و بد سبھی جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی رہ جاتا ہو۔ خصوصاً حاکم حجاز شریف مکہ اور مدینہ والے بھی اس دن جشن کرتے ہیں۔ شہنشاہ اربل مظفر رحمۃ اللہ علیہ اس کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے، جتنا وہ کر سکتے تھے۔ اس پر علام ابو شامہ نووی کے استاذ نے ان کی تعریف کی۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ یہ اچھی اور مستحب چیز ہے۔ اس کے کرنے والے کی تعریف کرنی چاہئے۔ ابن جزری نے اتنا اور بڑھایا کہ اس میں شیطان کی ناک خاک آلود کرتا ہے، اور اہل ایمان کا سرور ہے۔

رہ گیا مخالفین کا یہ اعتراض کہ چونکہ میلاد شریف قرونِ ثلاثہ میں نہیں تھی۔ اس لیے بدعت اور گمراہی ہے۔ یہ ان کی جہالت بلکہ گمراہی ہے۔ اس لیے کہ اگر ان کی یہ بات مان لی جائے تو پھر ان کا کاروبار سارا کا سارا بدعت و گمراہی ٹھہر گیا۔ ان کے مدرسوں میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، قاعدہ بغدادی سے لے کر یہ ایک بھی ان کے قرون میں نہیں تھیں حتیٰ کہ بخاری شریف بھی۔ بخاری شریف تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی۔

ان کے اس قول کا رد خود حدیث صحیح میں موجود ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها من بعده
من غیر ان ینقص من اجورهم شیئ ومن سن فی الاسلام سنة سئنة کان علیہ
وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینقص من اوزارهم شیئ (رواہ
مسلم جلد: ۲- صفحہ ۲۳)

جس نے اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کیا، اسے اس کا ثواب ملے گا۔ اور جتنے لوگ
اس پر اس کے بعد عمل کریں گے اس کے برابر اسے ثواب ملے گا۔ اور عمل کرنے والوں کے
ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جو اسلام میں کوئی برا طریقہ ایجاد کرے گا، اس پر اس کا وبال

ہوگا، اور اس کے بعد جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے، سب کا وبال اس پر ہوگا۔ اور عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نو ایجاد چیز اچھی ہو تو موجب ثواب بھی ہو سکتی ہے، اور بری باعث گناہ بھی۔ اچھائی اور برائی کا معیار یہ ہے کہ جو نو ایجاد چیز کسی سنت کے مزاحم ہو وہ مذموم و ضلالت ہے۔ اور جو نو ایجاد چیز کسی سنت کے مزاحم نہ ہو وہ مذموم نہیں، بلکہ اگر اس میں دینی فوائد ہوں تو محمود و مستحسن اور باعث ثواب ہے۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ہے:

قال الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ ما احدث مما یخالف الكتاب او السنة او الاثر او الاجماع فهو ضلالة وما احدث من الخیر مما لا یخالف شیئا من ذلك فلیس بمذموم.

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جو چیز کتاب یا سنت یا اثر یا اجماع کے مخالف ہو وہ گمراہی ہے اور جو اچھی بات ایسی ایجاد کی جائے جو ان میں سے کسی کے مخالف نہ ہو وہ مذموم نہیں۔

اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ ”من احدث فی امرنا هذا ما لیس منہ فهو رد“ جس نے دین اسلام میں ایسی بات ایجاد کی جو اسلام سے نہیں وہ قابل قبول نہیں، اس کے تحت اسی مرقاۃ میں ہے:

المعنی من احدث فی الاسلام رایا لم یکن له من الكتاب والسنة سند ظاہر او خفی ملفوظ او مستنبط فهو مردود علیہ وفی قوله ما لیس منہ اشارۃ الی ان احداث ما لا ینازع للكتاب والسنة کما سنقرره بعد لیس بمذموم.

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ اسلام میں ایسی بات ایجاد کی جس کے لیے کتاب و سنت سے کوئی سند نہ ہو نہ ظاہر ہو نہ خفی، نہ ملفوظ نہ مستنبط وہ مردود ہے۔ اور حضور کے ارشاد ”ما لیس منہ“ میں اشارہ ہے کہ ایسی بات ایجاد کرنا جو کتاب و سنت کے مخالف نہ ہو وہ مذموم نہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ محفل میلاد شریف اچھی ہے یا بری، ذکر خدا و رسول کو کون برا کہہ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ دیکھ چکے کہ اجلہ علمائے کرام جو بالاتفاق مقتدائے امت ہیں انہوں نے اس کے جواز اور استحسان کی تصریحیں کی ہیں، اور احادیث کریمہ سے اس کی سندیں بیان فرمائی ہیں۔ چند اور ارشادات سنئے:

مقتدائے وقت فقیہ محدث علامہ عثمان بن حسن دنبالی اپنے رسالہ ”اثبات قیام“ میں فرماتے ہیں:

اجاب بذالك الامام المحقق الولي ابو ذرعة العراقي حين سئل عن فعل المولد مستحب او مكروه فاجاب بقوله الوليمة والطعام مستحب كل وقت فكيف اذا انضم الي ذلك السرور بظهور نور النبوة في هذا الشهر الشرف ولا يلزم من كونه بدعة مكروها فكم من بدعة مستحبة بل واجبة.

امام محقق ابو ذرعة سے سوال کیا گیا کہ میلاد شریف کرنا مستحب ہے یا مکروہ؟ جواب دیا کہ دعوت اور کھانا ہر وقت مستحب ہے تو کیسے ناجائز ہو جائے گا اس کے ساتھ یہ خوشی مل جائے کہ اس مبارک مہینے میں نور نبوت کا ظہور ہوا ہے، اور بدعت ہونے سے مکروہ ہونا لازم نہیں آتا۔ بہت سی بدعت مستحب ہیں بلکہ واجب ہیں۔

زر قانی علی المواہب میں ہے:

والها حسنة قال السيوطي و هو مقتضى كلام ابن الحاج في مدخله فانه الماذم ما احتوى عليه من المحرمات مع تصريحه قبل بانه ينبغي تخصيص هذا الشهر بزيادة فعل البر وكثرة الصدقات والخيرات وغير ذلك من وجوه القربات وهذا هو عمل المولد المستحسن والحافظ ابو الخطاب ابن دحية الف في ذلك التوير في مولد البشير النذير واختاره ابو الطيب السبتي نزہل قوص والاول اظهر لما اشتمل عليه من الخير الكثير. یہ بدعت حسنة ہے۔ علامہ سیوطی نے فرمایا: مدخل میں ابن الحاج کے کلام کا یہی مقصد تھا

ہے۔ انہوں نے برائی ان باتوں کی کی ہے جو اس محفل میں ناجائز ہوتی ہیں (مثلاً مزامیر باجہ وغیرہ) وہ پہلے خود یہ تصریح کر چکے ہیں کہ اس مہینہ (ربیع الاول) کو صدقات و خیرات کی کثرت کے لئے اور دیگر اچھے کاموں کی زیادتی کے لئے خاص کرنا چاہئے۔ یہی مستحسن میلاد شریف ہے۔ اور حافظ ابو الخطاب ابن دجیہ نے اس بارے میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ”التتویر فی مولد البشیر النذیر“ ہے۔ اسی کی ابو الطیب سبلی نے اختیار فرمایا، اس کا بدعت حسنہ ہونا ہی زیادہ ظاہر ہے۔ اس لئے کہ یہ بے شمار خیر پر مشتمل ہے۔

حضرت علامہ عبدالباقی زرقانی سب مباحث کا خلاصہ یہ لکھتے ہیں:

والحاصل ان عملہ بدعة لکنہ اشتمل علی محاسن و ضدها و من
تعری المحاسن واجتنب ضدها کانت بدعة حسنة و من لا فلا .
(زرقانی: جلد ۱- صفحہ ۱۴۰)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں اس محفل میں کچھ ناروا باتیں شامل ہو گئی ہیں۔ مثلاً مزامیر وغیرہ تو اگر محفل میں کوئی ناروا بات ہے تو ممنوع اور اگر ہرگز ناجائز بات سے محفل خالی ہے تو بدعت حسنہ ہے۔

ثوبیہ کا واقعہ نقل کر کے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ایں جا سند است مراہل موالید را کہ سروری کنند و بذل اموال نمایند
یعنی میلاد کی محفل کرنے والوں کے لیے یہ سند ہے کہ خوشی کرتے ہیں اور اپنے مال
خرچ کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مروجہ محفل میلاد شریف بلا کسی شک و تردد کے جائز و مستحسن
و باعث ثواب ہے۔ اس کی اصل قرآن مجید کی متعدد آیتوں اور احادیث کریمہ سے ثابت ہے
اور اجلہ علمائے کرام جو تمام امت کے نزدیک معتمد ہیں اس کے جواز و استحسان کے قائل
ہیں۔ مثلاً سند الحفظ ابن حجر عسقلانی شارح بخاری، خاتم الحفظ علامہ جلال الدین سیوطی،
علامہ احمد خطیب قسطلانی شارح بخاری۔ شیخ القراء علامہ جزری۔ علامہ محمد بن عبدالباقی
زرقانی۔ علامہ طبری۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

مانعین کے معتمد ماضی قریب کے شیخ العرب والعجم شیخ الدلائل علامہ احمد عبدالحق مہاجر الہ آبادی حتیٰ کہ مانعین کے پیران پیر حاجی امداد اللہ صاحب نے اپنی مشہور کتاب ”فیصلہ مفت مسئلہ“ میں تصریح کی کہ فقیر کا مشرب یہ ہے کہ ذریعہ برکات سمجھ کر ہر سال مولود کرتا ہے اور قیام میں لطف و لذت پاتا ہے۔ اوکمال قال۔

یہ محفل اس ہیئت کذا یہ کے ساتھ اگر چہ قرون ثلاثہ میں نہ تھی مگر اس کی وجہ سے حرام و گناہ نہیں ہو سکتی۔ حدیث گزر چکی کہ اگر نو ایجاد چیز اچھی ہے تو ایجاد کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا اور عمل کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔ اور سب کے برابر ایجاد کرنے والے کو ملے گا۔ اس لیے کہ اس حدیث کے مطابق جن نے میلاد شریف اس ہیئت کے ساتھ ایجاد کیا وہ بھی ثواب کا مستحق ہے۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک جن جن لوگوں نے یہ محفل کی یا قیامت تک کریں گے سب ثواب کے مستحق ہیں، اور سب کے برابر ایجاد کرنے والے کو ثواب ملے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم (ماہنامہ اشرفیہ: اگست ۱۹۸۴ء صفحہ: ۱۰ تا ۱۶)

☆☆☆

سیرت نبوی کی بنیادی کتابیں

سیرت پر اگر چہ سیکڑوں تصنیفات موجود ہیں۔ مگر ان سب کا سلسلہ ان چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے۔ سیرت ابن اسحاق، سیرت امام واقدی، طبقات ابن سعد، تاریخ طبری۔ ان کے علاوہ بقیہ جتنی کتابیں ہیں وہ تمام کی تمام انہیں کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ البتہ بعض کتابوں میں کتب احادیث سے بھی مواد فراہم کیا گیا ہے، وہ مستثنیٰ ہیں، یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے فن سیرت کو غیر مستند و غیر معتبر ثابت کرنا چاہا ہے، انہوں نے اپنی تنقید کی پوری قوت انہیں کتابوں پر صرف کر دی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم بھی ان چار کتابوں کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کی رائے نقل کر کے فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیں۔

محمد بن اسحاق:

یہ تابعی ہیں، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کی ہے۔ امام زہری کے تلمیذ خاص ہیں۔ امام زہری تابعی اور جلیل القدر محدث امام بخاری جیسے محدث کے مشائخ میں سے ہیں۔ ابن اسحاق کی جلالت شان کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ امام زہری جیسے بگائے روزگار امام کے ایسے خاص تلمیذ ہیں کہ امام زہری کے دروازے پر دربان رہتا تھا۔ کوئی شخص بلا اجازت ہار یا ب نہیں ہو سکتا تھا مگر ابن اسحاق کو اجازت عام تھی، جب چاہیں حاضر ہو جائیں۔

ان پر بعض محدثین نے بہت سخت جرحیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ ہشام بن عروہ، پھر امام مالک، پھر وہب، پھر یحییٰ قطان نے کذاب کہا:

اخرجہ ابن عدی عن ابی بشر الدولابی و محمد بن جعفر بن یزید عن ابی قلابہ الرقاشی ثنی ابو داؤد و سلیمان بن داؤد قالا قال یحیی القطان ان محمد بن اسحق کذاب قلت ما یدریک؟ قال قال وہب لقلت لوہب ما

یدریک؟ قال قال لی مالک بن انس فقلت لمالک وما یدریک؟ قال هشام بن عسرة قلت لهشام بن عسرة وما یدریک؟ قال حدث عن امرائی فاطمة بنت المنذر وادخلت علی وهی تسع وماراها رجل حتی لقیته الله .

ابن عدی نے ابو بشر دولابی محمد بن جعفر بن یزید سے روایت کی وہ ابو قلابہ رقاشی سے روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ابو داؤد اور سلیمان بن داؤد نے بیان کیا کہ یحییٰ قطان نے کہا محمد بن اسحاق کذاب ہیں۔ میں نے پوچھا آپ نے کیسے جانا؟ انہوں نے بتایا کہ مجھے وہب نے اور ان کو امام الک نے اور ان کو هشام بن عسرة نے بتایا کہ وہ میری زوجہ فاطمہ بنت منذر سے روایت کرتے ہیں۔ حالاں کہ وہ نو سال کی عمر میں میرے یہاں آئی ہے، اور زندگی بھر کسی غیر مرد نے اسے نہیں دیکھا۔

مگر عند التحقیق ابن اسحاق کا ثقہ ہونا ہی ثابت ہے۔ سیر و مغازی کے علاوہ احکام میں بھی ان کی روایت لائق احتجاج ہے۔ ان پر جو جرحیں کی گئی ہیں، ان کا ائمہ حدیث نے جواب دیا ہے۔ ابھی جو جرح مذکور ہوئی، میزان میں اس کا جواب یہ دیا اس جرح کا مدار یہی ہے تاکہ فاطمہ بنت منذر کو کسی غیر مرد نے نہیں دیکھا ان سے روایت کیسے کرتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ ابن اسحاق نے فاطمہ سے مسجد میں حدیث سنی ہو، یا بچپن میں سنی ہو، اس کا بھی احتمال ہے کہ فاطمہ نے پردہ کے پیچھے سے یہ حدیث ابن اسحاق سے بیان کی ہو۔

امام ابن ہمام فتح القدر میں فرماتے ہیں:

توثیق ابن اسحاق هو الحق الا بلج ومانقل عن کلام مالک فیہ لا یثبت ولو صح لم یقبله اهل العلم کیف وقال شعبۃ فیہ هو امیر المؤمنین فی الحدیث وروی عنہ مثل الثوری وابن ادریس وحماد بن زید وزید بن ربیع وابن علیة وعبد الحارث وابن المبارک واحتمله احمد وابن معین وعامة اهل الحدیث غفر الله تعالیٰ لهم وقد قال البخاری فی توثیقه فی کتاب جزء القراءۃ خلف الامام له ذکرہ ابن حبان فی الطبقات وان مالک رجع عن الکلام فی ابن اسحاق واصطلح معه وبعث الیہ ہدیة.

ابن اسحاق کا ثقہ ہونا ہی حق ظاہر ہے۔ امام مالک کا جو کلام ان کے بارے میں منقول ہے وہ ثابت نہیں اور اگر وہ صحیح بھی ہو تو اسے اہل علم نے قبول نہیں کیا۔ کیسے قبول کریں حالاں کہ شعبہ نے ان کی شان میں فرمایا ہے کہ وہ امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں، اور ابن اسحاق سے ثوری اور ابن ادریس اور حماد بن زید اور زید بن ربیع اور ابن علیہ اور عبد الحارث اور ابن مبارک جیسے (اکابر) نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابن معین نے ان سے روایت لی ہے۔ (اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے)

اور امام بخاری نے اپنی کتاب جزء القراءت خلف الامام میں ان کی توثیق کی، اور ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے، اور امام مالک نے ابن اسحاق پر جو جرح کی تھی، اس سے رجوع فرمایا اور ان سے صلح کر لی اور ان کے پاس ہدیہ بھیجا۔

ان پر جو جرحیں کی گئیں ہیں امام بخاری جزء القراءت میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

رأيت علي بن عبد الله يحتج بحديث ابن اسحاق وقال علي عن ابن عيينة ما رأيت احدا يتهم محمد بن اسحاق .

میں علی بن عبد اللہ کو ابن اسحاق کی حدیث سے احتجاج کرتے دیکھا ہے اور علی نے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے کسی کو نہیں جانا۔ جس نے محمد ابن اسحاق کو متہم کیا ہو۔

ان اقوال ائمہ سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ محمد بن اسحاق ہر حیثیت سے مستند اور ثقہ ہیں۔ عام اہل حدیث نے ان سے روایت کی ہے بلکہ حسب ارشاد شعبہ وہ حدیث میں امیر المؤمنین کے درجہ پر فائز ہیں۔ اور امام مالک نے جو ان پر جرح کی ہے، اسے اہل علم نے قبول نہیں کیا بلکہ خود امام مالک نے اس سے رجوع کر لیا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بسا اوقات ائمہ حدیث کسی راوی پر جرح کرتے ہیں، مگر وہ جرح واقع کے مطابق نہیں ہوتی۔

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق، یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے۔ اور ان کو ثقہ جانتے تھے۔ ابن حبان نے اسی جرح کو ذرا واضح کر کے یوں بیان کیا ہے کہ محدثین کو ابن اسحاق کی کتاب پر جو اعتراض تھا یہ تو تھا کہ انہوں نے خیبر کے واقعات ان یہودیوں

سے نقل کیے ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے اور یہ واقعات ان لوگوں نے یہودیوں ہی سے سنے ہوں گے اس لیے ان پر کامل اعتماد نہیں کیا جاسکتا لیکن جب کہ ابن حبان نے خود تصریح کر دی ہے کہ ابن اسحاق نے خیر کے واقعات یہودیوں سے نہیں لیے تھے بلکہ انہوں نے واقعات ان مسلمانوں سے لیے تھے جو پہلے کبھی یہودی تھے، اور اسی بنا پر وہم کیا جاسکتا ہے کہ شاید ان لوگوں نے یہودیوں سے واقعات سنے ہوں۔ لیکن جس طرح کسی کو یہ توہم ہو اسی طرح ہم کو اس پر یقین ہے کہ ابن اسحاق نے جو خیر کے واقعات اپنے مغازی میں تحریر کیے ہیں۔ ان کے راوی یہودی نہیں، بلکہ مسلمان ہیں۔ کیوں کہ ابن اسحاق کی یہ روایتیں مرسل ہیں۔ اگر متصل ہوتیں تو راویوں سے خود معلوم ہو جاتا کہ یہ یہودی تھے کہ نصرانی یا مسلمان، اور یہ امر اپنی جگہ ثابت ہے کہ ثقہ اور مستند محدث جب کسی روایت کی سند حذف کرتا ہے تو اسی بنا پر حذف کرتا ہے کہ اسے راویوں کی تعدیل و توثیق پر پورا اعتماد ہے اور یہی وجہ ہے کہ حدیث مرسل دربارہ احکام بھی عند تحقیق حجت ہے۔

مقدمۃ اشعة اللمعات میں ہے:

وزداد ابو حنیفہ و مالک رحمۃ اللہ علیہما مقبول است مطلقاً و ایساں گویند کہ ارسال بجہت کمال وثوق و اعتماد است زیرا کہ کلام در ثقہ است و اگر نزد دوے صحیح نمی بود ارسال نمی نمود۔ ترجمہ: امام ابو حنیفہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک مرسل مقبول ہے مطلقاً، اور یہ لوگ فرماتے ہیں کہ ارسال کمال وثوق اور اعتماد کی بنا پر ہے۔ اس لیے کہ کلام ثقہ کے ارسال میں ہے، اگر اس کے نزدیک صحیح نہ ہوتی تو ارسال نہیں کرتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ ابن اسحاق فن سیرت کے نہایت ثقہ اور عادل امام ہیں بلکہ عند تحقیق حدیث میں بھی مقبول و مستند ہیں۔ ان کی کتاب المغازی سیر میں متفقہ طور پر مستند اور لائق اعتبار کتاب ہے، ان کی وفات ۱۵۱ھ میں ہوئی۔

امام واقدی:

ان کا نام محمد بن عمر الواقدی الاسلمی ہے۔ ان پر بعض علما نے سخت سے سخت جرحیں کیں جیسا کہ میزان و تہذیب وغیرہ میں موجود ہے۔

اور آج کل تو تقریباً اس کو اجماعی مسئلہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جوش تعصب میں لوگ یک طرفہ جرح نقل کر کے خوب خوب ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ لیکن ٹھنڈے دل سے تعصب نکال کر امام واقدی کے حالات جرح کے سلسلہ میں لوگوں کے دعویٰ اور دلیل میں مطابقت اور استقصا کے ساتھ ان کے بارے میں جو کہا گیا ہے، اس پر غور کرتے ہیں، تو واقعہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اگر کچھ لوگ ان کو متروک وضاع کذاب کہہ رہے ہیں، تو دوسرے ائمہ ان کو ثقہ عادل مستند بتا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ائمہ نے مخصوص طور پر اپنی کتابوں میں ان کے ثقہ اور عادل ہونے کے عنوانات قائم کیے ہیں۔ ان کے متعلق تمام موافق اقوال نقل کر کے ایک ایک مخالف اقوال کا جواب دیا ہے۔ اور تمام موافق اقوال کو دلائل سے مؤید کر کے ان کا ثقہ مثبت عادل مستند ہونا ثابت کیا ہے۔

امام ابن ہمام صاحب فتح القدر جن کی جلالت شان، بحر علمی تحقیق و تدقیق تمام دنیائے اسلام میں مسلم ہے۔ فتح القدر فصل آسار میں فرماتے ہیں:

قال فی الامام جمع شیخنا ابو الفتح الحافظ فی اول کتابہ المغازی والسیر من ضعفه ومن وثقه ورجح توثیقه و ذکر الاجوبة عما قبل.
امام واقدی کے بارے میں ہمارے شیخ ابوالفتح حافظ نے اپنی کتاب مغازی وسیر کے شروع میں مخالف و موافق تمام اقوال جمع کر کے ان کے ثقہ ہونے کو راجح ثابت فرمایا، اور ان پر جتنی جرحیں کی گئی، سب کا جواب دیا۔

علامہ بدرالدین محمود عینی عمدة القاری شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

وقال ایضا الواقدی شدید الضعف اذا انفرد فكيف اذا خالف قلت
ذكر الحافظ المزني ولم يتعرض الى شيء من ذلك ومن العجب ان الواقدی
احمد شائخ الامام الشافعی ويحط عليه هذا الحط وهو ان كان ضعفه بعضهم
فقد وثقه آخرون فقال ابراهيم الحربي الواقدی امين الناس على اهل الاسلام
وعن مصعب بن زهير ثقة مأمون وكذا وثقه ابو عبيدة والنسابة عليه ابن
المبارک وآخرون (صفحة: ٤٥٩، جلد: ١٨)

یہ بھی کہا کہ واقدی جب منفرد ہوں تو بھی سخت ضعیف ہیں تو اگر مخالف ہوں تو کیا حال ہوگا، یہ حافظ مزنی نے ذکر کیا۔ اور اس پر کچھ نہیں کہا۔ تعجب یہ ہے کہ واقدی امام شافعی کے مشائخ میں سے ہیں، اور یہ ان کو اتنا گرا رہے ہیں۔ امام واقدی کو اگرچہ بعض لوگوں نے ضعیف بتایا ہے مگر دوسرے لوگوں نے ان کو ثقہ کہا ہے، ابراہیم حربی نے کہا: واقدی اہل اسلام کے امین ہیں۔ مصعب بن زبیر سے مروی ہے کہ انہوں نے بھی واقدی کو ثقہ مامون کہا۔ یوں ہی ابو عبیدہ نے توثیق کی، اور عبد اللہ بن مبارک اور دوسرے لوگوں نے ان کی تعریف کی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مشائخ میں سے ہونا ہی امام واقدی کی جلالت شان کے لیے کافی تھا۔ اس سونے پر سہاگہ یہ کہ عبد اللہ بن مبارک جو امام بخاری کے مشائخ میں سے ہیں، اور ان کے ہم پلہ دوسرے اماموں نے ان کی تعریف کی ہے۔ مصعب بن زبیر اور ابو عبیدہ جیسے مسلم الثبوت بزرگوں نے ان کو ثقہ مامون کہا ہے حتیٰ کہ ابراہیم حربی نے یہ شاندار خطاب دیا:

امین الناس علی اہل الاسلام

کیا ان روشن تصریحات کے بعد بھی صاحب سیرۃ النبی وغیرہ کی ایک طرف متعصبانہ جرح کی کوئی علمی حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ کہاں وہ شد و مد کہ اگر واقدی سچا تو دنیا میں کوئی جھوٹا نہیں اور کہاں ائمہ حدیث کی یہ زور دار توثیق و تعدیل لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب علم دنیا سے اٹھ گیا اور اب تنقیدی جائزہ لینے والا کوئی موجود ہی نہیں۔ جس پر ہم چھری چلا دیں گے، اسے دنیا مذبح مان لے گی۔ لیکن اب واقدی کے ساتھ بغض رکھنے والے سوچیں کہ دنیا ان ائمہ کے یہ ارشادات پڑھے گی تو انہیں کیا کہے گی۔

امام واقدی کے متعلق یہ بحث اور اختلاف اس صورت میں ہے کہ ان کی مرویات دربارہٴ احکام مقبول ہیں کہ نہیں اور آپ نے دیکھا کہ راجح مختار یہی ہے کہ وہ باب احکام میں بھی ثقہ مامون مقبول مستند ہیں۔ رہ گئے سیر و مغازی، فضائل و معجزات کے ابواب، اس سلسلہ میں امام واقدی کا مقبول و مستند ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے، اس میں کسی ایک کا

اختلاف نہیں، جس کی دلیل تمام کتب و سیر مغازی میں ان کی مرویات کا اخذ و قبول ہے، اور اہل علم جانتے ہیں کہ تلقی امت کا کیا درجہ ہے۔ اسی لیے میزان میں فرمایا:

كان الی حفظہ المنتہی فی الاخبار والسير والمغازی والحوادث

وایام الناس وغیر ذالک .

اخبار، سیر، مغازی، حوادث اور ایام وغیرہ میں امام واقدی ہی کے حفظ تک منتہی ہے۔ اس لیے سیر و مغازی کے سلسلہ میں ان کی مرویات کے مقبول و غیر مقبول ہونے کی بحث ایجاد بندہ سے زائد اور امت میں انتشار و افتراق کی کوشش کے سوا اور کوئی علمی خدمت نہیں کہی جاسکتی۔

امام واقدی کے وضاع و کذاب ہونے کے ثبوت میں آج سب سے بڑی دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے:

اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گونا گوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑا سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات قلم بند نہیں کر سکتا۔ (سیرت النبی - صفحہ: ۴۴)

اس مبارک متن کی شرح یہ ہے کہ مثلاً حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فلاں جنگ میں فلاں پہلوان سے مقابلہ کیا۔ جو اتنا موٹا ٹگڑا تھا، اس کے پاس فلاں فلاں اسلحے تھے، فلاں فلاں لباس پہنے ہوئے تھا، اس نے آکر پہلے یہ کہا: حضرت خالد نے اس کا یہ جواب دیا۔ پھر اس نے نیزہ کا وار کیا۔ حضرت خالد نے رد کر دیا، یا پینتر بدل کر وار خالی کر دیا اور آگے بڑھ کر اس کا نیزہ چھین لیا، اب اس پہلوان نے تلوار چلائی۔ حضرت خالد نے اسے سپر پر لیا، پھر سیف اللہ نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، یا وہ تلوار اس کے سر پر پڑی خود کٹا سر دو ٹکڑے ہو گیا۔ تلوار سر سے گزر کر کمر تک چیرتی ہوئی نکل گئی۔ (یہ صرف تمثیلاً ہے کوئی واقعہ نہیں)

علامہ کا فرمانا ہے کہ یہ تمام تفصیلات یاد کر لینا آج سے اہل حفظ و ضبط کی قوت سے باہر ہے، لہذا یہ جھوٹ اور من گڑھت ہے، لیکن قبلہ اس زمانے کے اہل حفظ و ضبط پر اس

زمان برکت نشان کے حفاظ کو قیاس کرنا ہی وہ غلطی ہے، جس کے بعد کتب حدیث کا پورا ذخیرہ فرضی داستان کی صف میں آجاتا ہے، اسی بنیادی غلطی کو دور کرنے کے لیے ہم ناظرین کو ذرا تفصیلی مطالعہ کی تکلیف دے رہے ہیں۔

امام واقدی اگر کسی جزئی واقعہ کی جملہ تفصیل بیان کریں تو وہ ان کے کذاب و وضاع ہونے کی شہادت ہے، لیکن بخاری اور مسلم میں بھی اس قسم کی تفصیلات موجود ہیں تو پھر آپ کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے۔ اٹھائے صحیحین اور ملاحظہ کیجئے سید الشہداء سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا واقعہ جس تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ کیا واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کسی طرح کم ہے؟ اسی طرح خود آپ کی اصح کتب بعد کتاب اللہ میں ایک دو نہیں دسیوں جزئیات کی وہ حیرت انگیز تفصیلیں مذکور ہیں، جو واقدی نے بھی نہیں بیان کیں مثلاً غزوہ بدر میں حضرت زبیر بن عوام اور ابو ذات کرش کا مقابلہ اور اس کی پوری تفصیل کیا امام واقدی کی بیان کردہ تفصیلات سے کم ہیں؟ ابو ذات کرش کسی طرح لوہے میں غرق آیا۔ حضرت زبیر نے کیسے اس کی آنکھ میں برچھی ماری، اور یہ برچھی پھر کیسے نکلی، اور اس کی نوک ٹیڑھی ہوئی پھر کس کے پاس رہی پھر کس نے کس قیمت پر خریدی۔ کیا واقدی کے یہاں کسی مجاہد کی تلوار یا برچھی کے بارے میں اتنی لمبی معلومات ہیں۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر امام بخاری جزئی جزئی باتوں کی تفصیلات بیان کریں تو وہ حفظ و ضبط کے جبل شامخ ہوں، اور اسی کو آپ بیان کریں تو آپ کی کتاب اصح کتب ہو، اور امام واقدی بیان کریں تو جھوٹے کذاب وضاع ہوں ان کی کتاب میں ہو تو وہ اکذب کتب ہو۔ ”سبحنک هذا بہتان عظیم“

بات دراصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں جنگ کا شجاعانہ طریقہ یہ تھا کہ فوج سے ایک ایک آدمی نکل کر مقابلہ کرتے اور ابتداءً فوج کے منتخب تجربہ کار افراد باہر نکلا کرتے۔ ایسی صورت میں پوری فوج کو لڑنے والوں کی جملہ حرکات و سکنات بغور دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملتا تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فوج کو وہ ساری تفصیل معلوم ہو جاتی، جو ان دونوں نبرد آزما کو پیش آئی۔ اور اگر عام دھاوا ہو جاتا جسے اس وقت جنگ مغلوبہ کہا جاتا تھا تو بھی جو لوگ

جنگ کے طریقہ کار سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مقابلہ ہمیشہ ماہر بہادر کیا کرتے تھے ان کے آس پاس کچھ لوگ ان کی امداد اور حفاظت کے لیے موجود رہتے۔ یہ لوگ اپنے اپنے نبرد آزما کی ہر حرکت و نقل پر پورے تھیقظ کے ساتھ نگاہ رکھتے تھے۔ اس بنا پر جنگ مغلوبہ کی صورت میں بھی کچھ لوگوں کا ہر قسم کی تفصیلی معلومات محفوظ کر لینا بعید از قیاس نہیں عام طور پر اس قسم کی تفصیلات باعث دلچسپی ہوتی ہیں، لوگ سننے سنانے کے شائق ہوتے ہیں، اس لیے وہ سینہ بسینہ منتقل ہو کر سفینہ میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔

یہی چیز امام واقدی کے یہاں موجود ہے۔ پھر اس پر طعن کرنا انصاف و دیانت کا خون کرنا ہی نہیں بلکہ جمیع کتب احادیث کے دفتر کو برباد کرنے کا دروازہ کھولنا ہے، بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس زمانے کے حفاظ کو آج کے مشاہدین و مورخین پر قیاس کیا گیا۔ آپ ذرا سوچیے! حضرت امام بخاری کے متعلق محدثین نے تصریح کی ہے کہ ان کو چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ انہوں نے خود فرمایا ہے کہ میں نے اپنی جامع صحیح کو تین لاکھ صحیح احادیث سے منتخب کیا ہے۔ یہ تین لاکھ احادیث تو بہت ہیں، صرف صحیح بخاری میں جتنی احادیث ہیں ان کو جمع سند آج کا کوئی متحفظ یاد کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ مگر امام بخاری کے حفظ و ضبط کو سنیے۔ انہوں نے چھ لاکھ احادیث کو بھی یاد کیا، اور ان کے متعلق اس قسم کی گونا گوں تفصیلیں بھی یاد رکھیں۔ فلاں ستین کی فلاں سند ہے، اس کے زواۃ میں تلمیذ و شیخ کی یہ ترتیب ہے۔ شیخ کی وفات فلاں وقت ہوئی، تلمیذ فلاں وقت سماع و تحمل کے لائق ہوا۔ تلمیذ و شیخ میں ملاقات ہوئی فلاں سند میں فلاں راوی ثقہ ہے، فلاں مطعون ہے۔ اس پر طعن یہ ہے۔ مثلاً وہ متروک ہے، منکر ہے فلاں مخطط ہے، فلاں مجہول ہے۔ فلاں مدلس ہے، فلاں فاسق ہے، فلاں مبتدع ہے، فلاں کذاب ہے، فلاں وضاع ہے، اس راوی پر فلاں محدث نے یہ طعن کیا، فلاں نے یہ جواب دیا، فلاں نے اس کے بارے میں مجھ سے یہ کہا، مگر صحیح یہ ہے کہ وہ ویسا نہیں، یہ حدیث اس سند سے صحیح ہے اس سند سے حسن ہے، اس سند سے ضعیف ہے، صحیح کے درجے سے تنزل کی وجہ سے یہ ہے، ضعیف اس وجہ سے ہے، یہ حدیث میں نے شیخ کے سامنے پڑھی، وہ حدیث شیخ نے پڑھ کر مجھے سنائی تھی، یہ مجمع میں سنی یا سنائی وغیرہ وغیرہ۔

احادیث کے متعلق یہ ساری تفصیلات اتنی ضروری اور اہم ہیں کہ اگر یہ تفصیلیں نہ یاد کی جائیں تو پھر حدیث صحیح و حسن ضعیف میں بلکہ حدیث و غیر حدیث میں امتیاز مشکل ہو جائے۔ اسی وجہ سے اس عہد کے تمام محدثین اور فقہا احادیث کے متن ساتھ ساتھ اس قسم کی جملہ تفصیلات کامل طور سے محفوظ رکھتے تھے، اور آج اس دور ترقی میں بڑا سے بڑا دماغ رکھنے والا مدّ مغ متحفّظ واقعات کے بارے میں اس قسم کی آدھی تفصیل بھی یاد نہیں رکھ سکتا۔ ایسی صورت میں اپنی قوت یادداشت پر قیاس کر کے محدثین و فقہا پر طعن کرنے والے کو آپ بھی یہی جواب دیں گے۔

کارپا کاں راقیاس از خود مکیر

اس لیے امام واقدی پر آپ کے طعن کے جواب میں ہم بھی یہی عرض کر کے رخصت ہوتے ہیں، کہ اگر واقدی پر آپ کی جرح صحیح مان لی جائے تو اگر آپ ہی ہے سیکھ کر کوئی یہ کہے:

حقیقت یہ ہے کہ محدثین اور فقہا کی تصانیف خود اس بات کی شہادت ہیں، ایک ایک جزئی روایت کے متعلق اس قسم کی گونا گوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ یاد رکھتے ہیں، کہ آج بڑے سے بڑا دماغ رکھنے والا متحفّظ بھی نہیں یاد رکھ سکتا۔

تو بولے! دین و مذہب کا کوئی ٹھکانہ رہا؟ بخاری و مسلم کو جانے دیجئے، جناب کی اصح کتب کا کیا حال ہوگا؟ یہی مجھے رونا ہے کہ آپ نے نشہ تحقیق و تصحیح میں وہ وہ لکھ مارا ہے جس کی رو میں تمام دینیات بہ سکتے ہیں۔

ہم اس بحث کو اس تصفیہ پر ختم کرتے ہیں کہ امام واقدی کا ثقہ عادل مستند ہونا ہی صحیح و مرجح ہے۔ ان کی مرویات دربارہ احکام بھی مقبول ہیں اور سیر و مغازی کے وہ بالاتفاق امام مستند ہیں، یہی میزان میں فرمایا:

وکان الی حفظہ المنتہی فی الاخبار والسير والمغازی والحوادث و

ایام الناس وغیر ذلک۔

امام واقدی کے ہی حفظ تک اخبار، سیر، مغازی، حوادث، واقعات وغیرہ میں منتہی ہے

ان کی وفات ۲۰ھ میں ہوئی۔

ابن سعد:-

ان کا نام بھی محمد ہے۔ کاتب واقدی سے مشہور ہیں۔ امام واقدی کے تلمیذ خاص ہیں۔ نہایت ثقہ مستند مقبول الحدیث صاحب سیرت امام ہیں۔ اس کے باوجود کہ لوگوں نے ان کے استاذ پر سخت سے سخت جرحیں کی ہیں، مگر ان کو سب نے متفقہ طور پر ثقہ اور عادل کہا ہے ان کی کتاب کا نام ”طبقات ابن سعد“ ہے۔ یہ بارہ جلدوں کی مبسوط کتاب ہے۔ ان میں دو جلدیں سیرت نبوی ہیں، بقیہ دس جلدیں صحابہ و تابعین کے حالات میں ہیں یہ کتاب نایاب ہو چکی تھی، جرمن نے بڑے اہتمام سے چھاپ کر شائع کیا ہے۔

جدید مہربانوں کو جب کوئی گنجائش نہ ملی تو لامحالہ انہیں ثقہ کہنا پڑا۔ لیکن اس طرح سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ مستند ہو جاتا تھا، اس لیے ان پر یہ بے تکی جرح کر دی۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں۔ اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رِوَاة میں سے بعض ثقہ ہیں، اور بعض غیر ثقہ۔

یعنی حسب تحقیق آل جناب واقدی جھوٹے کذاب و وضاع اور ان کی مرویات کذب و جعل اور حدیث میں فرمایا ہے:

من حدث عن تحدیث یری انه کذب فهو احد اکاذبین.

جو ایسی حدیث بیان کرے، جسے جانتا ہو کہ جھوٹی ہے تو وہ خود بھی جھوٹا ہے۔

لہذا ابن سعد خود بھی جھوٹے، کذاب ہوئے، اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں اپنے استاذ واقدی کا جھوٹا کذاب ہونا معلوم نہ تھا، انہوں نے لاعلمی میں روایت کر دیا تو دوسری حدیث سنئے، فرماتے ہیں:

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع.

کسی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ ہر سنی ہوئی بات بیان کر دے۔

اس طرح بھی ابن سعد کا دامن جھوٹ کے داغ سے بری نہیں ہو سکتا۔ پھر مجھے تو

حیرت ہے ہی، ہر ناظر کو حیرت ہوگی کہ ابن سعد کے بارے میں خطیب بغدادی کا یہ قول کس منہ سے نقل کیا گیا:

كان من اهل العلم و الفضل و الفهم و العدالة صنف كتابا كبيرا في طبقات الصحابة و التابعين الى وقته فاجاد فيه واحسن:

ابن سعد اہل علم و فضل و فہم صاحب عدالت ہیں، صحابہ اور اپنے وقت تک کے تابعین کے طبقات میں ایک بہت بڑی کتاب تصنیف کی جو بہت عمدہ اور اچھی کتاب ہے۔ اپنی کتاب میں وہ بھی نصف سے زائد وضاع کذاب کی روایت داخل کرنا اس پر بغیر نقد و جرح کئے بیان کرنا۔ صاحب علم و فضل و فہم عدالت کا کام نہیں، لیکن جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں کہ امام واقدی ثقہ عادل مامون مقبول ہیں اس لئے ان کی وجہ سے ان کے تلمیذ جلیل پر بھی حرف نہیں آسکتا اور نہ ان کی تصنیف پر۔ ان کی وفات ۲۳۰ھ میں ہوئی ہے۔ امام واقدی اور ان کے تلمیذ ابن سعد پر اتنی زور دار جرح صرف اس وجہ سے ہے کہ علامہ کی دانست میں یورپ کے مستشرقین کو اعتراض کرنے کے مواد انہیں کے کتابوں سے ملے ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں۔ مثلاً مغازی واقدی سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ دوسری جگہ ہے۔

مثلاً اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ یورپین معترضین کے اعتراض کے جوابات یہ نہیں تھے کہ یہ ائمہ جھوٹے کذاب وضاع ناقابل استناد ہیں۔ بلکہ ان کے تعصب خیانت کی پر وہ دری ہے۔ لیکن کیا کیا جائے شمس العلماء ہونا اور بات ہے اور دین میں تفقہ و تیقظ اور چیز ہے۔

محت الدین بن جریر طبری:

یہ بھی مسلم الثبوت عادل ثقہ مستند محدث اور مفسر ہیں ان کی تفسیر احسن التفسیر سمجھی جاتی ہے، ان کی کتاب تاریخ کبیر نہایت مفصل اور جامع مستند کتاب ہے۔ ان کی یہ کتاب

بھی نایاب تھی یورپ نے چھاپ کر شائع کیا۔ ان پر سلیمانی نے یہ طعن کیا کہ یہ روانفص کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، اس کا جواب علامہ ذہبی نے ان زور دار الفاظ میں دیا:

هذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار ائمة الاسلام

والمعتدين .

یہ جھوٹی بدگمانی ہے۔ حقیقت میں ابن جریر اسلام کے ایک بڑے امام اور معتمد ہیں۔ ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ان کے بعض شیوخ مثلاً سلمہ ابرش ضعیف ہیں۔ لیکن سلمہ ابرش کو ابن معین جیسے ماہر نقاد امام نے ثقہ کہا ہے۔ خصوصاً سیر مغازی میں سلمہ کی سیر کو احسن السیر کہا گیا ہے، اور تقریباً یہی حال امام طبری کے دوسرے مشائخ کا ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ طبری امام معتمد ثقہ ہیں، ان کی کتاب تاریخ کبیر بہت مقبولہ و مستند کتاب ہے۔ بعد کے تمام مورخین کا یہی ماخذ ہے۔ ان کی وفات ۱۳۰ھ میں ہوئی۔

یہ چاروں کتابیں سیر و مغازی کی بنیاد ہیں۔ اس لئے فن سیرت کو بے اعتبار کرنے کے لئے ان پر سخت سے سخت طعن کئے گئے ہیں۔ لیکن سطور بالا پڑھنے والوں پر یہ بات اچھی طرح روشن ہوگئی کی محض طعن و جرح سے یہ فن مجروح نہیں، ہو سکتا اور نہ یک طرفہ جرح سے کسی امام کو ناقابل استناد کہا جاسکتا ہے۔ ان ائمہ پر اگر کچھ ناقدین نے طعن کئے تو دوسرے اکابر نے اس کا جواب دیا۔ ان کو ثقہ معتمد کہا، اور جب مصنفین مستند ہیں تو ان کی تصنیفات کا مستند ہونا بہ یہی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام نے ان ائمہ کی کتابوں کو قبول کیا، انہیں کتابوں سے روایتیں اخذ کر کے دوسری کثیر تصانیف تیار کیں۔ ماہر دینیات جانتا ہے کہ تلقی امت خود کسی تصنیف کے معتمد و مستند ہونے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ماتم کی بات یہ ہے کہ اب یہ شگوفہ کھلایا جا رہا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ شریف واقعہ نہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں۔ اس کے علاوہ ابن اسحاق کی اصل کتاب ہندوستان میں موجود نہیں۔ ابن ہشام نے

ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا، وہی آج موجود ہے، لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطے سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں۔ ابن مدینی (امام بخاری کے استاذ) کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے میں نے اس کو ترک کر دیا۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ وہ استناد کے قابل نہیں۔

نسائی کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں۔ ابن اسعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اسی لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رواۃ میں بعض ثقہ ہیں، اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمہ ابرش ابن سلمہ ضعیف الروایہ ہیں۔
(سیرۃ النبی صفحہ: ۴۵، مصنفہ شبلی اعظم گڑھی)

کتب سیرت کے متعلق وہ بھی بنیادی کتابوں کے بارے میں اس تبصرہ سے ہر شخص یہی سمجھے گا کہ جب ائمہ فن اور ان کی تصنیفات کی یہ ناگفتہ بہ حالت ہے کہ جھوٹ کذب متروک، غیر مستند، مرویات سے بھری ہوئی ہے، تو پھر اس مبارک فن کی وقعت شاہنامہ فردوسی سے زائد اور کیا ہوگی۔ لیکن پھر حیرت اور سخت حیرت ہے کہ جس شخص کی یہ تحقیق ہو، وہی اس عظیم فن پر تمام دنیا سے ان الفاظ میں کس طرح مباحث کرتا ہے:

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا ہے کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکے، اور نہ آئندہ توقع کی جاتی ہے۔ (سیرۃ النبی صفحہ: ۸)

علامہ تو موجود نہیں کہ ان سے کچھ گزارش کریں لیکن ہر ذی انصاف سے اتنی بات کہنی ہے کہ زیاد بکائی کے واسطے سے جو ضعف بقول آپ کے پیدا ہو گیا ہے، وہ سیرت ابن ہشام میں پیدا ہوگا۔ رہ گئی ابن اسحاق کی کتاب تو وہ زیاد بکائی کے واسطے سے پاک ہے، پھر خواہ مخواہ کھینچ مان کر اسے ضعیف بتانا دیانت کا خون کرنا ہے۔ رہ گئی سیرت ابن ہشام تو:

اولا: ابن اسحاق کی اصل کتاب ہندوستان میں بھی موجود ہے، اور ہندوستان کے باہر بھی موجود ہے اگرچہ بہت کم اس سے مقابلہ کر کے ابن ہشام کی کتاب میں زیاد بکائی کے واسطے سے جو ضعف بقول آپ کے پیدا ہو گیا ہے، اسے دور کیا جاسکتا ہے۔

ثانیا: زیاد بکائی کا رتبہ آپ کو بھی تسلیم ہے۔ ان کا یہ مسلمہ رتبہ کس سلسلہ میں ہے۔ ان کا یہ رتبہ آپ ظاہر کر دیتے تو آپ کی حق پرستی پر کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ زیاد بکائی سیر و مغازی میں بالاتفاق ثقہ و مستند ہیں، ابن مدینی ابو حاتم نسائی کا ان پر طعن وہی درجہ رکھتا ہے، جو ابن اسحاق وغیرہ پر طعن کا ہے۔

ثالثا: اس طعن کا حاصل صرف یہ ہے کہ وہ ضعیف الروایہ ہیں، اور فضائل و سیر میں روایات ضعاف بالا جماع مقبول ہیں، جس کی تفصیلی بحث ابھی آتی ہے۔ رہ گئی طبقات ابن سعد، جب کہ امام واقدی کا ثقہ و مستند ہونا ثابت ہو چکا تو اس کتاب کا نصف سے زائد حصہ کا مستند و مقبول ہونا ثابت ہو گیا، رہ گئیں نصف سے کم روایتیں ان میں بعض کا ثقہ ہونا آپ کو بھی مسلم۔ اس بعض سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اکثر یا اقل۔ اگر اکثر مراد ہیں تو آپ ہی کی تحقیق کے مطابق طبقات کا رابع سے بھی کم غیر مامون رہا، اور آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ کسی کتاب میں کچھ حصہ اگر رطب و یابس ہے تو وہ کتاب غیر مستند نہیں کہی جاتی، ورنہ امان اٹھ جائے، کوئی نوائے قرآن مجید کے مستند نہ رہے گی۔

طبری کی تاریخ کبیر کے بعض رواۃ مثلاً سلمہ ابرش و ابن سلمہ وغیرہ پر جو طعن ہیں وہ اولاً: مرجوح ہیں۔

ثانیا: ان کا مفاد یہی ہے کہ وہ ضعیف ہیں، اور سیر و مغازی میں ضعاف بالا تفاق مقبول ہیں۔ جیسا کہ آپ نے خود ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ سیر و مغازی میں ان کی توثیق کرتے تھے، اور ان کی سیرت کو بہترین سیرت کہتے ہیں۔

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ اس زور و شور کی تنقید کے بعد جو نتیجہ نکلا وہ صرف اتنا۔ اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں۔ البتہ ان میں تحقیق و تنقید کے معیار پر جواتر جائے وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

اس نتیجہ کو دیکھ کر ہمیں شبہہ ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ انہیں مقدمات کا ہے، جو ابھی مذکور ہوئے یا کسی اور کا۔ پھر یہ کہ:

اولاً: کس نے یہ دعویٰ کیا کہ کتب سیرت کتب حدیث کے ہم پلہ ہیں۔ پھر اس کی تغلیط کے لئے آپ نے اتنی زحمت کیوں اٹھائی؟۔

ثانیاً: آپ کا دعویٰ یہ تھا یہ کتابیں مستند نہیں، اور ثابت ہوا کہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں، کسی فن کی کتابیں اگر کتب حدیث کے ہم پلہ نہ ہوں تو ان کا غیر مستند ہونا کیسے لازم؟ سیرت کا درجہ استناد مخصوص ہے، اور احادیث کا مخصوص۔ اگر ایک فن اپنے اعلیٰ فن سے فروتر ہو تو اس کو بے اعتبار کہنا کیسے صحیح ہے؟ اس طرح تو ایک بے باک یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کتب احادیث غیر مستند ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ قرآن کے ہم پلہ نہیں۔ اور جب علم حدیث کا یہ حال ہے تو علم فقہ و تفسیر سب صاف۔ یہ تحقیق ہے یا علوم دینیہ کے تباہ و برباد کرنے کی یورپین مشین؟۔

ثالثاً: یہ بات تو حق ہے کہ فن سیرت، فن حدیث کے بلند درجہ کے مساوی نہیں مگر آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ آپ کی تنقید کی روح جتنی تیز کتب سیرت کی طرف ہے، اتنی ہی کتب حدیث کی طرف بھی ہے۔ آپ نے ہی احادیث کی مسلم الثبوت کثیر کتابوں کے بارے میں لکھا:

ان کتابوں کی قسم میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، جن پر اعتماد کرنا جائز نہیں۔

مستدرک کے بارے میں تحریر فرمایا:

اس میں بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثیں موجود ہیں۔

آپ نے ہی اصفہانی، حشیم بن سلیمان، ابو نعیم، ابو بکر خطیب، ابو الفضل، ابو موسیٰ مدنی، ابن عساکر، عبدالغنی وغیرہ کی کتابوں کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی:

ان میں بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل حدیثیں ہیں آپ نے ہی وہ حدیث جس میں ولادت ایوان کسری کے کنگورے گرنے کا ذکر ہے، بیہقی، ابو نعیم، خراسانی،

ابن عساکر اور ابن جریر کی روایت کے باوجود یہ کہہ کر کے رد کر دیا کہ وہ بخاری و مسلم صحاح ستہ میں نہیں۔

آپ ہی نے صحاح ستہ کی کثیر احادیث کو صرف اس بنا پر ناقابل قبول بتایا کہ وہ آپ کے خیال میں دلائل عقلیہ و قرآنی کے مطابق نہ تھیں۔ جب آپ کی تحقیق کے بموجب تمام کتب احادیث کتب سیر کی طرح احادیث موضوعہ مکذوبہ مہملہ مردودہ پر مشتمل ہیں تو آپ کس منطق سے کتب احادیث کے کتب سیر پر تفوق کی جانب ان الفاظ میں اشارہ کر رہے ہیں:

اس بنا پر سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کے ہم پلہ نہیں۔

ایہ تو آپ کو اور آپ نہیں رہے تو آپ کے مقلدین کو نہایت اطمینان کے ساتھ اعلان کر دینا چاہئے کہ:

احادیث کا ذخیرہ ہماری تحقیق کے ہم پلہ نہیں۔ البتہ جو تحقیق و تنقید کے معیار پر اتر جائے، وہ حجت اور استناد کے قابل ہے، اور اگر کوئی محدثین کے ثقہ اور عادل ضابطہ محتاط ہونے کو پیش کرے تو صاف صاف اپنی یہ تحقیق پیش کر دیں۔

لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا ان کی تصانیت کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا۔ ان لوگوں نے خود حضور سے نہیں سنا ہے جو کچھ بیان کرتے ہیں، اور راویوں کے ذریعہ بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں۔

فن سیرت کی گردن پر یہ چھری صرف اس بنا پر چلائی گئی کہ علامہ کا گمان یہ تھا:

مسلمانوں نے اس فن سیرت کو جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔ اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے، جو خود شریک واقعہ تھا، اور اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ تھے، کیسے تھے، کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے کہ غیر ثقہ، سطح الذہن تھے یا دقیقہ بین، عالم تھے یا جاہل۔ (سیرۃ النبی: صفحہ ۳۵)

فن سیرت کا اتنا بڑا معیار سمجھنا ہی بنیادی غلطی ہے۔ یہ عقاد و احکام کے لئے معیار

ہے، مگر سیر و مغازی، فضائل و مناقب کے لئے ہر گمبہنس۔ ائمہ سیر اور محدثین سب اس پر متفق ہیں کہ سیر مغازی میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایتیں مقبول ہوں گی۔ ظاہر ہے بائیان فن کے قائم کردہ معیار کے علاوہ جدید معیار قائم کر کے فن سیرت کو پرکھا جائے گا، تو سوائے بہکنے اور ٹھوکر یں کھانے کے اور کیا حاصل ہوگا۔ جس طرح آیات قرآنیہ کے معیار پر احادیث کو پرکھنے سے احادیث غیر مستند نظر آئیں گی، اسی طرح احادیث کے بلند معیار پر سیر و مغازی پرکھنے سے یہ کھوٹی دکھائی دیں گی۔ مگر یہ حقیقت میں سیرت کا کھوٹ نہیں بلکہ نقاد کی ذہنیت کا۔ اب آئیے علمائے سیر و ائمہ محدثین کے ارشادات سنئے:

۱۔ امام زین الدین عراقی، سیرت منظوم، میں فرماتے ہیں:

و ليعلم الطالب ان السير يجمع ماصح وما قد انكر
طالب کو معلوم ہو کہ فن سیرت صحیح اور منکر سب کو جمع کرتا ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں،

ابن اسحاق رجل تكتب عنه هذه الاحاديث يعني المغازی و نحوها
و اذا جاء الحلال و الحرام اردنا قوما هكذا و قبض الاصابع الاربع.

(فتح المغیث)

ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ ان سے مغازی وغیرہ کی حدیثیں مقبول ہیں۔ اور جب حلال و حرام کی باری آتی ہے تو ہم ایسے لوگوں کو چاہتے ہیں اور اپنی انگلیاں دبا کر بند کر لیں۔

۳۔ امام بیہقی نے کتاب المدخل میں ابن مہدی کا یہ قول نقل کر کے ثابت رکھا:

اذا روينا في الحلال والحرام والاحكام شددنا في الاسانيد وانتقدنا
في الرجال واذا روينا في الفضائل والثواب والعقاب سهلنا في الاسانيد و
تسامحنا في الرجال. (فتح المغیث)

جب ہم حلال و حرام میں روایت کرتے ہیں تو سند میں شدت کرتے ہیں۔ اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں، اور جب فضائل، ثواب و عقاب میں روایت کرتے ہیں تو سند میں

زری کرتے ہیں اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں:

یہ تینوں عبارتیں سیرۃ النبی میں بھی ہیں۔

۴۔ علامہ حلبی "سیرۃ الانسان والعیون" میں فرماتے ہیں:

لا یخفی ان السیر یجمع الصحیح السقیم والضعیف والبلاغ والمرسل والمنقطع والمعضل دون الموضوع وقد قال الامام احمد وغیره من الائمة اذاروینا فی الحلال والحرام شددنا واذاروینا فی الفضائل ونحوها تسامحنا .

پوشیدہ نہ رہے کہ فن سیرت و موضوع کے علاوہ صحیح، سقیم، ضعیف، بلاغ، مرسل، منقطع، معضل سب کو جمع کرتا ہے۔ امام احمد وغیرہ ائمہ نے فرمایا: ہم جب حلال و حرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایت کرتے ہیں تو نرمی کرتے ہیں۔

۵۔ علامہ عبد الباقی زرقانی "شرح مواہب اللدنیہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

عادة المحدثین التساهل فی غیر الاحکام والعقائد مالم یکن موضوعا محدثین کی عادت ہے کہ احکام و عقائد کے غیر میں نرمی کرتے ہیں، جب تک موضوع نہ ہو۔

۱۰۲۶: مقدمہ امام ابو عمر و بن الصلاح مقدمہ جرجانیہ، و شرح الفیہ للمصنف و

تقریب النووی اور تدریب الراوی میں ہے، واللفظ للأخیرین:

یجوز عند اهل الحدیث وغیرہم التساهل فی الاسانید الضعیفة وروایة ماسوی الموضوع من الضعیف و العمل به من غیر بیان ضعفه فی فضائل الاعمال وغیرها ممن لاتعلق به بالعقائد والاحکام وممن نقل عنه ذالک ابن حنبل و ابن مہدی وابن المبارک قالوا اذا روینا فی الحلال والحرام شددنا واذاروینا فی الفضائل ونحوها تساهلنا .

محدثین کے نزدیک فضائل اعمال وغیرہ میں جن کو عقائد و احکام سے تعلق نہیں، ضعیف سندوں میں نرمی برتنا اور موضوع کے علاوہ ہر ضعیف کو اس کا ضعف بیان کئے بغیر

روایت کرنا اس پر عمل کرنا جائز ہے، جن لوگوں سے یہ منقول ہے ان میں امام احمد بن حنبل ابن مہدی اور ابن مبارک بھی ہیں ان لوگوں نے فرمایا ہے کہ ہم جب حلال و حرام میں روایت کرتے ہیں تو سختی کرتے ہیں، اور فضائل وغیرہ میں نرمی برتتے ہیں۔

ان کے علاوہ نصوص کثیر ہیں، نقل کی جائیں۔ ناظرین انہیں غور سے پڑھیں، ان پر واضح ہو جائے گا کہ ائمہ سیر کے ساتھ ساتھ جملہ محدثین کا اس پر اجماع ہے کہ عقائد و احکام چھوڑ کر سیر و مغازی فضائل و مناقب میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایت مقبول و مستند ہے سیر و مغازی کا جو معیار ہے، اس کے لحاظ سے روایات ضعاف بھی اس باب میں حجت ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ فن سیرت ہی سرے سے غیر معتبر اور غیر مستند ہے بلکہ یہ ہے کہ سیر و مغازی میں جن امور کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے ان کا اثبات احادیث متواترہ یا مشہورہ یا صحاح یا حسان ہی پر موقوف نہیں بلکہ یہ امور صحاح و حسان کے علاوہ ان روایات سے بھی ثابت ہو جاتے ہیں، جنہیں محدثین اپنی اصطلاح میں ضعیف کہتے ہیں۔ کیوں کہ ضعیف کے معنی یہ نہیں کہ وہ جھوٹی روایت ہے اور من گھڑت کہانی ہے، روایت ضعیف کی معنی صرف یہ ہیں کہ باعتبار اصطلاح روایت کو صحیح و حسن کہنے کے لئے جس درجہ اور جن شرائط کے مستجمع راوی درکار ہیں، اس کے راوی اس عالی درجہ کے نہیں۔ اس کا ما حاصل صرف یہ ہے کہ صحیح اور حسن سے جس اعلیٰ درجہ کا صدق حاصل ہوتا ہے روایت ضعیف سے اس اعلیٰ درجہ کا صدق نہیں حاصل ہوتا۔ صدق جس طرح صحیح اور حسن سے حاصل ہوتا ہے۔ ضعیف سے بھی حاصل ہوتا ہے، اگرچہ درجہ میں اس سے کم ہوتا ہے، اور فن سیرت میں جس درجہ کا صدق درکار ہے، وہ ضعیف سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

مدعا جس حیثیت کا ہوتا ہے، اس حیثیت کی دلیل کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک وہ مدعا ہے جو اعلیٰ درجہ کا ہے، جیسے عقائد کے وہ مسائل جو مدار کفر و ایمان ہیں، ان کے ثبوت کے لئے ایسی قطعی دلیل کی حاجت ہے، جس میں شک شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ اس باب میں احادیث آحاد اگرچہ صحیح ہوں، اگرچہ صحیحین کی ہوں حجت نہیں۔ یہاں صرف

قرآن مجید اور احادیث متواترہ حجت ہیں۔

دوسرے وہ مدعا جو اوسط درجے کا ہے، جیسے حلت و حرمت۔ اس کا ثبوت ایسی قطعی دلیل پر موقوف نہیں، تاہم اس کے ثبوت کے لئے ایسی دلیل ضروری ہے جو مفید ظن غالب ہو، اس کے لئے احادیث صحیحہ و حسنہ اگرچہ وہ آحاد ہوں، کافی ہیں۔ اگرچہ وہ صحیحین میں نہ ہوں، اگرچہ وہ صحاح ستہ میں نہ ہوں۔

تیسرے وہ مدعا جو اس سے بھی ادنیٰ ہے۔ اس کا ثبوت نہ دلیل قطعی پر موقوف ہے نہ ایسی مرجح الصدق دلیل پر جو رواۃ کے اعلیٰ درجہ کے ثقہ اور عادل اور سند کے اتصال اور علل قادحہ سے خالی ہوئے بغیر حاصل نہیں ہوتا، جیسے کسی معزز فی الدین انسان یا محمود عند الشرع فعل کی مخصوص یا غیر مخصوص فضیلت کا ثبوت یہ احادیث صحیحہ کے حسنہ کے علاوہ ضعاف سے بھی ثابت ہوتا ہے، البتہ موضوع یہاں بھی ناقابل قبول ہے، موضوع حدیث ہی نہیں کسی بد طینت انسان کی من گڑھت ہے۔

اب آئیے ہم اور آپ غور کریں کہ سیرت کے جزئیات کا درجہ ان تینوں میں کس درجہ پر ہے جو بھی عاقل منصف غور کرے گا، وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس کا مقام تیسرا ہے۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ جزئیات سیر و مغازی کا انکار نہ کفر ہے، نہ موجب اثم۔ اس لئے ابواب مغازی و سیر میں تیسرے درجے کی روایات جنہیں ضعیف کہتے ہیں، مستند ہیں، جس طرح واجبات و مکروہات کے اثبات کے لئے آیات قرآنیہ یا احادیث متواترہ تلاش کرنا تکلیف مالایکلف اور اصول شرع سے نابلدی ہے، اسی طرح مغازی و سیر فضائل و مناقب کے لئے احادیث صحیحہ متصلہ کی تحدید اپنے اوپر شدت ہے جا لازم کرنا، اور اصول دین سے بے خبری ہے۔

ضعیف اور موضوع کا فرق:

اب جب کہ دلائل عقلی و نقلی سے ثابت ہو چکا کہ سیر و مغازی میں موضوع کے علاوہ ہر قسم کی روایت مقبول ہیں تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کی بھی توضیح کرتے چلیں کہ موضوع اور ضعیف میں فرق کیا ہے۔ اس کی ضرورت یوں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، جب ہم

یہ دیکھتے ہیں کہ حضرت علامہ اور ان کے مقلدین جس روایت کو رد کرنا چاہتے ہیں، اس پر اتنی جرح کافی سمجھتے ہیں کہ کسی نے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا ہو، یہ صحیح نہیں، یہ ثابت نہیں۔ اس کا رفع صحیح نہیں۔ اس کا رفع ثابت نہیں۔ یہ شاذ ہے۔ منکر ہے۔ متروک ہے۔ اس سے ان عوام میں جو محدثین کی اصطلاح سے واقف نہیں یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ غالباً یہ سب موضوع کی تعبیرات ہیں۔

۱۔ موضوع اگرچہ ضعیف ہی کی قسم ہے مگر کتب قوم میں یہ دونوں بحیثیت قسم مستعمل ہیں، جیسے عرف عام میں انسان اور حیوان کہ اگرچہ حقیقت میں انسان حیوان کی ایک نوع ہے، مگر عرف عام میں دونوں متقابل معنوں میں بولے جاتے ہیں۔ اس لئے اثبات ضعیف سے اثبات وضع لازم نہیں۔ یونہی کسی حدیث کے بارے میں محدثین کے اس کہہ دینے سے کہ یہ صحیح نہیں، حدیث کا موضوع ہونا تو درکنار ضعیف ہونا بھی لازم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ حسن ہو بلکہ بعض ائمہ نقد نے "لا یصح" کو عدم وضع کی دلیل بتایا، اس کی تفصیل یہ ہے:

صحیح ان کی اصطلاح میں اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کے تمام رواۃ کا اعلیٰ درجہ کا حفظ و ضبط پر فائز ہونا ثابت ہو۔ اس کی سند متصل اور علت شذوذ نکارت سے خالی ہو، ان تمام شرائط کا اجتماع اور ان کے خلاف کا ارتقاع بہت کم ہوتا ہے۔ پھر ان شرائط کے اثبات میں بڑی دشواریاں ہیں۔ محدثین ان شرائط میں جہاں کچھ کمی دیکھتے ہیں، فرما دیتے ہیں، یہ حدیث صحیح نہیں اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ صحیح ہونے کے لیے جن جن شرائط کی ضرورت، وہ سب اس میں موجود نہیں، صحیح کے بعد حسن کا درجہ ہے لایصح کا مطلب کبھی یہ ہوتا ہے کہ یہ حسن ہے، حسن وہ حدیث جس میں صحیح ہونے کے بعض شرائط میں وہ معیار نہ پایا جائے جو صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے، فی نفسہ اس میں کوئی نقص نہیں، ورنہ حسن نہ کہلاتی، ناقص کہلاتی۔ حدیث حسن میں جو تنزل ہے وہ اگر کسی طرح منجر ہو جائے تو اسے صحیح لغیرہ کہتے ہیں۔ حدیث حسن سیر و فضائل کے علاوہ احکام میں بھی حجت ہے۔

حسن کے بعد ضعیف کا درجہ ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ حدیث صحیح و حسن میں

جو شرائط معتبر ہیں، ان میں سے کل یا بعض مفقود ہوں۔ اس کا تین درجہ ہے، ضعیف ضعیف بہ اخف، جس میں راوی پر اختلاط و سوء حفظ جیسے ہلکے طعن ہوں، پھر ضعیف بہ ضعیف خفیف جیسے فسق و کذب وغیرہ شدید جرحوں سے راوی مطعون ہو، تیسرے ضعیف بہ ضعیف شدید کہ اصلاً حدیث ہی نہ ہو بلکہ کسی بے باک کی من گڑھت ہو، یہی موضوع ہے۔

ضعیف بہ ضعیف اخف، جابر سے قوت پا کر حسن لغیرہ بلکہ صحیح لغیرہ کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔

یہ کل سات قسمیں ہوئیں: صحیح لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ ضعیف بہ ضعیف اخف، ضعیف بہ ضعیف خفیف، موضوع۔

پہلی چار قسمیں احکام، وسیر و مغازی فضائل و مناقب سب میں لائق احتجاج ہیں۔ پانچویں قسم شواہد و متابعات وغیرہ میں مقبول اور جابر سے قوت پا کر حسن لغیرہ یا صحیح لغیرہ کے رتبہ کو پہنچ جائے، تو احکام میں بھی معتمد، چھٹی قسم احکام میں غیر مقبول، مگر سیر و مغازی، فضائل و مناقب میں بالا جماع مستند۔

ساتویں قسم نہ حدیث نہ اس کا کہیں اعتبار۔ ہر منصف فیصلہ کر لے کہ ”لایصح“ کہنے سے صحیح کی نفی ہوئی۔ صحیح اور موضوع کے مابین پانچ قسمیں ہیں۔ یہ کسی عاقل کی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اٹلی کی نفی سے سب سے ادنیٰ کا اثبات ہو گیا۔ اسی بنا پر علمائے تصریح کی ہے:

بین قولنا لایصح و بین قولنا موضوع بون کبیر فان الوضع اثبات الکذب والاختلاق و قولنا لم یصح لایلزم منه العدم انما هو اخبار عن عدم الثبوت و فرق بین الامرین . (کتاب النکت علی بن الصلاح للعلامة الزرکندی)

تنزیہ الترمذی لآلی مصنوعة خاتمة مجمع بہار الانوار)

ہمارے ان دونوں قول ”میں یہ صحیح نہیں“ اور ”یہ موضوع ہے“ بہت بعد ہے۔ اس لیے کہ وضع جھوٹ اور من گڑھت ثابت کرتا ہے اور ہمارے اس کہنے سے کہ صحیح نہیں حدیث نہ ہونا لازم نہیں یہ تو صرف عدم ثبوت بتانا ہے اور دونوں میں بہت فرق ہے۔

اسی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محدثین کے یہ فرمانے سے کہ یہ ثابت نہیں

ثبوت وضع نہیں ہوتا۔

حلیہ شرح منیہ میں ہے:

قول الترمذی لم یصح من النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی هذا الباب شیئی انتھی لا ینفی وجود الحسن ونحوہ والمطلوب لا یتوقف ثبوته علی الصحیح بل کما یثبت بہ یثبت بالحسن۔

ترمذی کا یہ فرمانا کہ اس باب میں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کچھ صحیح نہیں، یہ قول حسن کے وجود کی نفی کرتا ہے۔ اور مطلوب کا ثبوت صرف صحیح پر موقوف نہیں بلکہ جیسے صحیح سے ثابت ہوتا ہے، حسن سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

صواعق محرقہ میں امام ابن حجر کی فرماتے ہیں:

قول احمد انه حدیث لا یصح ای لذاته فلا ینفی کونه حسنا لغيره و الحسنة لغيره یحتج بہ کما بین فی الحدیث۔

امام احمد کا یہ قول کہ یہ حدیث صحیح نہیں، یعنی صحیح لذاتہ۔ یہ حسن لغيرہ کی نفی نہیں اور حسن لغيرہ حجت ہے جیسا کہ علم حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

سند الحفاظ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اذکار امام نووی کی تخریج احادیث میں فرماتے ہیں:

من نفی الصحة لا ینفی الحسن۔

صحت کی نفی سے حسن کی نفی نہیں ہوتی۔

موضوعات کبیر میں ہے:

لا یصح لا ینافی الحسن۔

لا یصح کہنا حسن کے منافی نہیں۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں

نفیہ الصحة لا ینافی انه الحسن کما علم۔

صحیح ہونے کی نفی اس کے منافی نہیں کہ وہ حسن ہے جیسا کہ معلوم ہے۔

ان ارشاداتِ علماء سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ حدیث حسن احکام میں بھی مستند اور لائق احتجاج ہے وہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ لا یصح کہنے سے حسن کی بھی نفی نہیں ہوتی، چہ جائے کہ ثبوت وضع ہو۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ ناقدین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں اور وہ حسن ہوتی ہے۔ لا یصح سے ثبوت وضع تو بہت دور ہے، ادنیٰ ضعف بھی لازم نہیں۔ بلکہ بعض علماء نے لا یصح کو موضوع نہ ہونے کی دلیل بتایا۔

موضوعات کبیر میں حدیث ”البطیخ قبل الطعام یغسل البطن غسلا ویذهب الداء اصلاً“ کے متعلق ابن عساکر کا قول لا یصح نقل کر کے فرماتے ہیں:

وہو یفید انه غیر موضوع کما لا یخفی۔

لا یصح کہنا یہ افادہ کرتا ہے کہ یہ حدیث موضوع نہیں جیسا کہ پوشیدہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ حدیث موضوع ہوتی تو صاف صاف فرمادیتے یہ موضوع ہے، صرف لا یصح پر اکتفا نہیں کرتے۔

ناظرین غور کریں! آج کسی حدیث کے بارے میں لا یصح کہیں مل گیا تو بغیر یہ تحقیق کیے ہوئے کہ یہ لا یصح کہنے والا کون ہے، اور اس کا مطلب کیا ہے، اور حقیقت بھی یہ ہے جو قائل نے کہی ہے یا اس کے برعکس ہے۔ حدیث کو پوری بے دردی کے ساتھ مردود و مطرود کر دیتے ہیں، اور خود لا یصح کہنے والے اس کا مطلب یہ بتا رہے ہیں کہ لا یصح بنے سے یہ حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں، حدیث حسن کو بھی لا یصح کہہ دیتے ہیں۔ اسے مستند و معتمد بتاتے ہیں بلکہ لا یصح کو موضوع نہ ہونے کی دلیل بتاتے ہیں اور یہ سخن فہم لوگ اس کا صرف یہی مطلب لیتے ہیں کہ یہ غیر مقبول ہے، غیر مستند ہے، مردود ہے، مطرود ہے۔

اسی طرح آپ کو جگہ جگہ ملے گا کہ ذرا کسی روایت کے بارے میں ملا یہ مجہول ہے پس رد کر دیا۔ حالانکہ سند میں کسی راوی کا مجہول ہونا صحت حدیث میں قارح ہونا علماء میں مختلف فیہ ہے، اور اگر ہے بھی تو صرف اس حد تک کہ مورث ضعیف ہے نہ کہ موجب وضع۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ مجہول کی تین قسمیں ہیں: مستور، مجہول العین مجہول الحال۔

۱۔ مستور: وہ ہے جس کی عدالت ظاہری معلوم ہو، ہانی کی تحقیق نہ ہو۔

۲۔ مجہول العین: وہ ہے جس سے صرف ایک شخص نے روایت کی ہو۔
 ۳۔ مجہول الحال: وہ ہے جس کی عدالت ظاہری اور باطنی کسی کی تحقیق نہ ہو۔
 مستور کی روایت جمہور محققین کے نزدیک مقبول ہے، اور قطعاً محل صحت نہیں۔
 چنانچہ صحیح مسلم میں اس قسم کے راویوں کی کثیر روایتیں موجود ہیں۔
 فتح المغیث میں ہے:

قبلہ ابو حنیفہ خلافاً للشافعی

مستور کی روایت امام ابو حنیفہ نے قبول فرمائی، امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے۔
 امام نووی نے اس کی تصریح فرمائی۔
 امام عمرو بن الصلاح نے اس کو مختار فرمایا۔ یعنی مستور کی روایت کے مقبول ہونے کو۔
 مجہول الحال کو بھی بعض اکابر لائق حجت جانتے ہیں۔ البتہ جمہور محدثین اس کو
 ضعیف مانتے ہیں بلکہ امام نووی نے مجہول العین کے بھی مقبول ہونے کو محققین کی طرف
 منسوب کیا۔

مقدمہ منہاج میں فرماتے ہیں:

المجهول اقسام مجہول العدالة ظاهراً و باطناً و مجہولها باطناً مع
 وجودها ظاهراً و هو المستور و مجہول العین فاما الاول فالجمہور علی ان لا
 یحتج به و اما الآخر فاحتج بهما کثیرون من المحققین۔
 مجہول کی چند قسمیں ہیں: ایک وہ جس کی عدالت ظاہری و باطنی دونوں نامعلوم
 ہو۔ دوسرے وہ کہ عدالت ظاہری معلوم ہو باطنی نامعلوم ہو، یہ مستور ہے۔ تیسرے مجہول
 العین اول تو جمہور کے نزدیک لائق احتجاج نہیں۔ رہ گئے آخرین تو اکثر محققین اس سے
 احتجاج کرتے ہیں۔

عارف باللہ امام ابو طالب کی نے اسی کو اولیائے کرام اور فقہا کا مسلک بتایا۔
 قوت القلوب میں فرماتے ہیں:

بعض ما اضعف به رواة الحدیث وتعلل به احادیثهم لایکون تعلیلاً

ولا جرعا عند الفقهاء ولا عند العلماء بالله تعالى مثل ان يكون الراوى مجهولا لا يشاره الخمول وقد ندب اليه ولقلة الاتباع له اذ لم يقع لهم الاثره عندي.

بعض وہ باتیں جن سے رُوایۃ اور احادیث کی تضعیف و تعلیل کی جاتی ہے۔ فقہا اور اولیا کے نزدیک طعن اور جرح نہیں۔ جیسے راوی کا مجہول ہونا، کیوں کہ اس نے گنہگار کی، اور یہ شریعت میں پسندیدہ بھی ہے۔ یا اس کے تلامذہ کم ہوئے، اس بنا پر کہ لوگوں کو اس سے روایت کا موقع کم ملا۔

المختصر اس میں اختلاف ہے کہ جہالت راوی سرے سے وجوہ طعن میں سے ہے بھی یا نہیں۔ اور جو لوگ اسے طعن مانتے ہیں، وہ بھی صرف مورث ضعف بتاتے ہیں۔ موجب وضع کوئی نہیں کہتا بلکہ اگر کسی نے جہالت راوی کی بنا پر حدیث کو موضوع کہا تو علما نے اس کی تردید فرمائی۔

امام بدرالدین زرکشی نے پھر لالی مصنوعہ میں فرمایا:

لو ثبت جهالته لم يلزم ان يكون الحديث موضوعا ما لم يكن في اسناده من يتهم بالوضع .

اگر مجہول ہونا ثابت بھی ہو جائے تو اس سے حدیث کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ جب تک اس کی اسناد میں کوئی متہم بالوضع نہ ہو۔ علامہ زرقاتی فرماتے ہیں:

قال السهيلي في اسناده مجاهيل وهو يفيد الضعف فقط .

سہیلی نے کہا کہ اس کی سند میں مجہول ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضعیف ہے اور بس۔

یوں ہی راوی پر جن وجوہ سے طعن ہوتا ہے، ان میں کذب و وضع کے علاوہ جتنے وجوہ ہیں، سب زیادہ سے زیادہ مورث ضعف ہیں۔ مثبت وضع صرف کذب ہے کہ معاذ اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا۔ جس بے باک نے ایک دفعہ بھی عمر میں

ولا جرعا عند الفقهاء ولا عند العلماء بالله تعالى مثل ان يكون الراوى مجهولا لا يشاره الخمول وقد ندب اليه ولقلة الاتباع له اذ لم يقع لهم الاثره عندي.

بعض وہ باتیں جن سے رُواۃ اور احادیث کی تضعیف و تعلیل کی جاتی ہے۔ فقہا اور اولیا کے نزدیک طعن اور جرح نہیں۔ جیسے راوی کا مجہول ہونا، کیوں کہ اس نے گنہگار پنہاں کی، اور یہ شریعت میں پسندیدہ بھی ہے۔ یا اس کے تلامذہ کم ہوئے، اس بنا پر کہ لوگوں کو اس سے روایت کا موقع کم ملا۔

المختصر اس میں اختلاف ہے کہ جہالت راوی سرے سے وجوہ طعن میں سے ہے بھی یا نہیں۔ اور جو لوگ اسے طعن مانتے ہیں، وہ بھی صرف مورث ضعف بتاتے ہیں۔ موجب وضع کوئی نہیں کہتا بلکہ اگر کسی نے جہالت راوی کی بنا پر حدیث کو موضوع کہا تو علما نے اس کی تردید فرمائی۔

امام بدرالدین زرکشی نے پھر لآلی مصنوعہ میں فرمایا:

لو ثبت جهالته لم يلزم ان يكون الحديث موضوعا ما لم يكن في اسناده من يتهم بالوضع.

اگر مجہول ہونا ثابت بھی ہو جائے تو اس سے حدیث کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ جب تک اس کی اسناد میں کوئی متہم بالوضع نہ ہو۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

قال السهيلي في اسناده مجاهيل وهو يفيد الضعف فقط.

سہیلی نے کہا کہ اس کی سند میں مجہول ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضعیف ہے اور بس۔

یوں ہی راوی پر جن وجوہ سے طعن ہوتا ہے، ان میں کذب و وضع کے علاوہ جتنے وجوہ ہیں، سب زیادہ سے زیادہ مورث ضعف ہیں۔ مثبت وضع صرف کذب ہے کہ معاذ اللہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا۔ جس بے باک نے ایک دفعہ بھی عمر میں

کا موضوع ہونا اور بات ہے، جہاں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا استحقاق ناز کا موجب ہے، وہاں قول رسول کو یہ کہنا کہ یہ قول رسول نہیں اسی درجہ کا جرم ہے کہ درحقیقت یہ بھی جھوٹ باندھنا ہے، اس کو یوں سمجھئے کہ غیر قرآن کو قرآن کہنا اور قرآن کے کسی جز کو قرآن نہ ماننا دونوں یکساں طور پر کفر ہیں۔ یوں ہی غیر حدیث کو حدیث کہنا اور حدیث کو حدیث نہ ماننا ایک درجہ پر ہے، اس لیے کسی حدیث کو موضوع کہنے میں جلدی کرنا عندالشرع محمود نہیں۔ اس لیے اس بارے میں بڑی احتیاط کامل تتبع اور استقصا کے بعد ہی کسی حدیث کے بارے میں یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ یہ موضوع ہے یہ بھی برسبیل ظن، یہاں یقینی حکم بہت مشکل ہے۔ ”فان الکذوب قد یصدق“

حضرت شیخ مقدمہ اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

و حکم بوضع وافترا بحکم ظن غالب است و قطع و یقین را بدارا راہ نیست فـان

الکذوب قد یصدق.

ترجمہ: وضع وافترا کا حکم ظن غالب سے ہے، قطعی یقین کی یہاں کوئی صورت نہیں۔ اس لیے کہ پکا جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے۔

اور حقیقت میں یہ کام ہمارا آپ کا نہیں، علمائے محدثین نے ہمیں اس سے مستغنی فرماویا۔ اس راہ میں سوائے ان کی تقلید کے کوئی چارہ کار نہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ناقد نے کسی ایک سند کو سامنے رکھ کر ایک حدیث کو موضوع یا ضعیف کہا، مگر اسی حدیث کی ایک یا زیادہ سندیں ایسی ہوتی ہیں، جن میں خلل نہیں ہوتا، اور اس سند سے وہ حسن یا صحیح ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کسی ناقد نے کسی حدیث کو موضوع یا ضعیف کہا ہے، تو آنکھ بند کر کے اس پر یقین کرنا درست نہیں۔ دوسرے ناقدین کی رائیں اور دوسرے طرق تلاش کرنا ضروری ہے، اگر مل جائیں تو اس کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔

مثلاً ایک طریقہ سے وہ موضوع ہے مگر دوسرے طریقے سے صحیح یا حسن ہے تو اس کو صحیح یا حسن ہی مانیں گے، یہ نہیں کہ دوسرے طریقوں کے ہوتے ہوئے جو وضع و قدح سے

خالی ہیں اس کو موضوع ہی کہیں، یوں ہی کسی ناقد نے کسی حدیث کو موضوع کہا دوسرے اس کو صحیح یا حسن کہتے ہیں یا ضعیف کہتے ہیں تو دونوں ناقدین کی حیثیت، رتبہ، امت میں اعتبار و اعتماد، دلائل و قرائن کی قوت پر فیصلہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ بس جب فلاں نے موضوع کہہ دیا تو وہ موضوع ہی ہے۔ خواہ ساری امت اسے حدیث مانے، اسے قبول کر لے۔ یہ وہ اہم اور لطیف نکتے ہیں، جن سے غفلت کی وجہ سے لوگ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں، اور امت میں انتشار و افتراق کے باعث بنتے ہیں۔ (ماہنامہ المیزان، کچھوچھ شریف ص: ۷۳ تا ۷۴)

خلاصہ ابحاث

ہماری اس کتاب میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، جنہیں تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کر آئے۔

۱۔ سیر و مغازی، فضائل و مناقب کے وہ ابواب جو قطعی نہیں، ان میں علاوہ موضوع کے ہر حدیث اور ہر روایت مستند ہے۔ اسی پر تمام امت اور علمائے سیر و مغازی کا عمل ہے۔
۲۔ عقائد و احکام میں البتہ موضوعات کے ساتھ ضعاف بھی غیر معتمد ہیں، اگرچہ وہ سیر و فضائل کا جز ہوں۔

۳۔ جب تک علمائے معتمدین و محتاطین جن پر امت کو اطمینان ہے، یہ تصریح نہ کریں کہ یہ حدیث موضوع یا ضعیف ہے، کسی غیر محتاط متغالی یا متہور کے موضوع کہہ دینے سے موضوع نہ ہوگی۔

۴۔ کسی حدیث یا روایت پر کسی محدث کا طعن اس کے ساقط الاعتبار ہونے کے لیے کافی نہیں، جب تک کہ اس کی مکمل چھان بین نہ کر لی جائے۔

۵۔ لایصح، لایثبت، صحیح نہیں، ثابت نہیں، مجہول ہے، شاذ ہے، منکر ہے، منقطع ہے۔ مرسل ہے، مدلس ہے، معطل ہے، مضطرب ہے، مدرج ہے، معلل ہے، غریب ہے، اس قسم کی اور جرحیں سیر و مغازی اور فضائل و مناقب میں مستند ہونے میں مغل نہیں، بلکہ ان میں سے بعض احکام میں بھی معتمد ہیں۔

۶۔ ہاں! تعارض کے وقت کتاب اللہ پھر احادیث، صحاح، حسان کو ہمیشہ ترجیح ہوگی۔
۷۔ روایت مقبولہ کے ہوتے ہوئے محض اپنی رائے اور قیاس سے مزاحم ہونے کی وجہ سے کسی مروی کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری عقل خواہ کتنا ہی ابا کرے۔



مسلمانوں کے فرقے

۱۔ ہر مذہب کی بنیاد دو باتوں پر قائم ہے۔ پہلی یہ کہ ایک ایسی ذات ضرورت موجود ہے۔ جو ساری موجودات سے زیادہ قوت اور قدرت رکھتی ہے۔ اسی نے ساری دنیا کو پیدا کیا۔ اور دنیا کا سارا نظام حقیقت میں اسی کے قبضے میں ہے۔ وہ حاکم مطلق ہے۔ اس کے اوپر کوئی حاکم نہیں وہ سب پر حاکم ہے۔ سب کا مالک ہے۔ وہ جو چاہے کرے۔ وہ جلاتا بھی ہے مارتا بھی ہے۔ وہی پیدا بھی کرتا ہے۔ وہی فنا بھی کرتا ہے اور تمام عالم میں جو کچھ ہوتا ہے سب اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ ذات میں نہ صفات میں نہ عبادت میں۔ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔ اس کی کوئی صورت اور شکل نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور نہ وہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ کبھی مرے گا۔ وہ ہر آن دنیا کے ذرے ذرے کی خبر رکھتا ہے۔ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے جانتا ہے۔ مگر نہ اسے کان ہے نہ آنکھ ہے نہ دماغ ہے۔ وہ جسمانی اعضا اور عوارض سے پاک ہے۔ اسی ذات کو ہم لوگ اللہ کہتے ہیں۔ دوسری یہ کہ اس نے بندوں کی ہدایت کے لیے کچھ مخصوص انسانوں کو چن لیا ہے جن کے پاس وہ ڈائریکٹ بھی اور فرشتوں کے واسطے سے بھی اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ ان مخصوص انسانوں کو نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔ اس لیے مسلمان ہونے کے لیے اللہ عزوجل کو بھی ماننا ضروری اور رسول کو بھی ماننا ضروری ہے۔

۲۔ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ رسولوں کے ذریعہ اللہ عزوجل کا جو پیغام انسانوں تک آئے یا رسول جو کچھ فرمائیں ان سب کو دل سے سچا مانے اور زبان سے ان کے سچے ہونے کا اقرار بھی کرے۔ رسول کی بات بلا چون و چرا تسلیم کرے۔

۳۔ اللہ کی شان میں یا رسول کی شان میں کوئی گستاخی کا جملہ بولنا ان کی تحقیر کرنا ایمان نہیں کفر ہے۔

۴۔ رسول جو اللہ کا پیغام لائے یا رسول نے جو کچھ بھی فرمایا۔ اور یہ سب جن لوگوں کے ذریعہ سے ہم تک پہنچا ان سب کو سچا مسلمان، شریعت کا پابند، اللہ سے ڈرنے والا، رسول کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا نہ ہونا، دنیوی باتوں میں بھی سچا، راست باز اعلیٰ کیرکٹر کا ہونا ضروری ہے۔

۵۔ اللہ کے مخصوص پیغام کو قرآن کہا جاتا ہے اور رسول کے اقوال کو حدیث۔ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی ان سے تعلیم براہ راست حاصل کی۔ ان کے جو معانی و مطالب بتائے وہ صحیح اور برحق ہیں۔ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لائق نہیں۔

۶۔ اسی طرح جو عمل یا قانون صراحت کے ساتھ قرآن و حدیث میں نہیں ان کے بارے میں صحابہ اور تابعین اور اسی طرح آج تک کے معتمد علمائے کرام کا فیصلہ حق ہے۔ اسے بھی قبول کرنا۔ ان پر بھی عمل کرنا ضروری ہے۔ بشرطیکہ وہ قرآن و حدیث اور پہلے کے گزرے ہوئے بزرگوں کے قول اور فیصلے کے خلاف نہ ہو۔

۷۔ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایمان کی حالت میں زیارت کی اور اخیر دم تک وہ ایمان پر قائم رہے وہ صحابی ہیں۔ اور جن لوگوں نے اسی تفصیل کے ساتھ صحابی کی زیارت کی وہ تابعی ہیں۔

۸۔ چوں کہ قرآن و احادیث سے قانون بنانے کے لیے بہت اعلیٰ دماغ بھی چاہئے اور بہت زیادہ علم بھی چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اسے خدا ترس متقی پرہیزگار مخلص سچا بھی ہونا چاہیے۔ اس لئے ہر شخص یا کم علم والے یا کم دماغ والے قرآن و حدیث سے قانون نہیں بنا سکتے۔ ان اعلیٰ صفات کے اور کمال کے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ ان کو مجتہد کہا جاتا ہے۔ ان میں چار بہت مشہور اور ممتاز ہیں امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، ان کو امام اعظم کہا جاتا ہے۔ یہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ میں انتقال کر گئے۔ ان کے ماننے والوں کو حنفی کہا جاتا ہے۔ دوسرے امام مالک بن انس یہ ۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ مدینہ طیبہ میں رہتے تھے۔ ان کے مقلدین یعنی ماننے والوں کو مالکی کہا جاتا ہے۔ تیسرے محمد بن ادریس شافعی۔ یہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور یہ ۲۰۴ھ میں فوت

ہوئے۔ یہ مصر میں رہتے تھے۔ ان کے مقلدین کو شافعی کہا جاتا ہے۔ چوتھے امام احمد بن حنبل۔ یہ ۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں فوت ہوئے۔ یہ بغداد کے باشندے تھے۔ ان کے مقلدین کو حنبلی کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے مجتہدین ہوئے مگر ان لوگوں نے جو مسائل (قانون) قرآن و حدیث سے بنائے وہ محفوظ نہیں رہ سکے۔ اس لیے ان کے مقلدین نہیں رہے۔

۹۔ اس وقت دنیا کے ایک ارب مسلمانوں میں تقریباً ۹۵ فی صد مذکورہ بالا مجتہدین کے مقلدین ہیں۔ جن کو اہل سنت و جماعت کہا جاتا ہے۔ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اب کوئی مجتہد نہیں۔ اب پوری دنیا کے مسلمانوں کو انہیں چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید واجب ہے۔ اس کی اجازت نہیں کہ کوئی از خود انزات قرآن و حدیث سے کوئی قانون بنالے۔ کیوں کہ اجتہاد یعنی قرآن و حدیث سے مسائل (قوانین) بنانے کی کسی کو قدرت نہیں۔ نہ وہ دماغ ہے نہ وہ علم ہے اور نہ اتنی دیانتداری۔

۱۰۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، چاروں عقیدے میں متفق ہیں۔ عقیدے میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب کا عقیدہ ایک ہے۔ صرف عبادات اور اعمال کے طریقوں میں اور کچھ چیزوں کے حلال و حرام ہونے میں معمولی سا اختلاف ہے اس اختلاف کی وجہ سے آپس میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ان کے سب سے پہلے خلیفہ و جانشین حضرت ابو بکر صدیق ہوئے ان کے بعد حضرت عمر فاروق ان کے بعد حضرت عثمان غنی اور ان کے بعد حضرت مولا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم خلیفہ ہوئے۔

۱۱۔ اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل حضرت ابو بکر ہیں ان کے بعد حضرت عمر فاروق، ان کے بعد حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

۱۲۔ حضرت ابو بکر حضرت عمر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلیفہ برحق ہونے پر سب کا اتفاق ہے ان تینوں کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی خود خلیفہ تسلیم کیا۔

۱۳۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ۱۸ ذی الحجہ ۳۶ھ تک مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے اخیر دنوں میں عبد اللہ بن سبامی ایک یہودی نے تخریب کاری کے لیے بظاہر کلمہ پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا۔ بظاہر بہت بڑا نمازی، شریعت کا پابند، متقی، اور پرہیزگار تھا اور ساتھ ہی ساتھ انتہائی چالاک اور عیار تھا اس نے ایک خفیہ گروہ بنایا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف اکساتا رہا۔ جس کے نتیجے میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد مدینہ طیبہ میں جو ذی اثر اور بڑے بڑے صحابہ اور سردار تھے ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔ ان کی خلافت کو تمام دنیا کے مسلمانوں نے تسلیم کیا۔ مگر شام کے گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تسلیم نہیں کیا اور ان کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے یہ بہانا بنایا کہ پہلے حضرت عثمان کے قتل کا قصاص لیا جائے اور جن لوگوں نے ان کے گھر کا محاصرہ کیا تھا یعنی ان کے گھر کو گھیرا تھا ان کو سزا دی جائے حضرت علی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ قاتلین مفرور ہیں اور ان کا صحیح پتہ معلوم نہیں کہ ان کا قاتل کون ہے۔ میں ان کا پتہ لگا رہا ہوں اگر وہ مل جائیں گے تو ضرور ان سے قصاص لوں گا۔ جن لوگوں نے حضرت عثمان کا گھر گھیرا تھا انہوں نے حضرت عثمان کو قتل کرنے کے لیے نہیں محاصرہ کیا تھا ان کا مطالبہ یہ تھا کہ مشہور فتنہ پرور سازشی مروان بن حکم کو ہمارے حوالے کیا جائے جو حضرت عثمان کے گھر میں چھپا ہوا تھا اس لیے وہ حضرات مجرم نہیں۔ اس پر بات بڑھی اور ۳۷ھ میں صفین کے مقام پر حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما میں بہت زبردست جنگ ہوئی۔ جب معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ میں شکست کھا جاؤں گا تو انہوں نے نیزوں پر قرآن باند کر اٹھایا اور یہ کہا کہ ہم قرآن کے حکم کے مطابق صلح چاہتے ہیں۔ اس پر لڑائی رک گئی پھر باہمی بات چیت سے یہ طے پایا کہ طرفین اپنا اپنا ایک نمائندہ مقرر کر دیں جو چھ مہینہ تک عام مسلمانوں کی رائے معلوم کر لے۔ پھر مقام "دومتہ الجندل" میں فریقین اور ان کے نمائندے اکٹھے ہوں اور اپنا فیصلہ سنا دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو

اور معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ اس کے بعد حضرت معاویہ دمشق چلے گئے۔ اور حضرت علی کوفہ آگئے۔ اس اثنا میں خارجی فرقہ پیدا ہوا انہوں نے کہا کہ قرآن مجید میں ہے: "إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ" فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ آپ نے قرآن کے حکم کی خلاف ورزی کی اس لیے آپ خلافت کے لائق نہیں۔ ان لوگوں نے کوفہ کے قریب "حرورا" نامی جگہ پر ایک لشکر جمع کر لیا جب حضرت علی کو اس کی اطلاع ملی۔ تو انہوں نے ان خارجیوں کو سمجھانے کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ ابن عباس کو بھیجا۔ انہوں نے ان خارجیوں سے کہا کہ قرآن مجید ہی میں ہے کہ جب میاں بیوی میں اختلاف ہو جائے تو شوہر اپنا ایک نمائندہ بھیجے اور بیوی اپنا ایک نمائندہ مقرر کرے۔ دونوں بیٹھ کر جھگڑے کو طے کر لیں۔ قرآن مجید میں ہے:

فابعثوا حکما من اہلہ و حکما من اہلہا ان یریدا اصلاحاً یوفق اللہ

بینہما

ایک بیچ مرد والوں کی طرف سے اور ایک بیچ عورت والوں کی طرف سے بھیجو۔ یہ دونوں اگر صلح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان میں میل کر دے گا۔ (سورہ نساء ۳۵)

اس لیے حضرت علی کا حکم بنانا قرآن کے خلاف نہیں اس پر خارجیوں کے لشکر میں سے ہزاروں آدمی ٹوٹ گئے مگر جو شہر پسند تھے وہ نہیں مانے۔ اس کے بعد حضرت علی نے ان سے جنگ کی اور انہیں بری طرح پسا کر دیا۔ جو لوگ بھاگ گئے ورنہ سب مارے گئے۔

پھر "دومتہ الجندل" میں دونوں فریق اور ان کے بیچ اکٹھا ہوئے۔ حضرت عمرو بن عاص نے (حضرت معاویہ کے نمائندے) حضرت ابو موسیٰ اشعری (حضرت علی کے نمائندے) سے کہا کہ سارا جھگڑا علی اور معاویہ کی طرف سے ہے اس کا حل یہ ہے کہ ان دونوں کو معزول کر دیا جائے اور کسی تیسرے کو خلیفہ منتخب کیا جائے۔ ابو موسیٰ اشعری نے یہ بات مان لی اب عمرو بن عاص نے کہا کہ تم علی کے نمائندے ہو اور بزرگ بھی ہو اس لیے پہلے تم کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دو کہ میں نے علی کو معزول کیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے یہی کہا اس کے بعد حضرت عمرو بن عاص کھڑے ہوئے اور انہوں نے یہ کہا کہ ابو موسیٰ اشعری

نے حضرت علی کو معزول کر دیا لہذا اب وہ خلیفہ نہیں رہے میں حضرت معاویہ کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں اس پر حضرت ابو موسیٰ اشعری نے ان کو ٹوکا پھر دونوں میں شدید جھڑپیں ہوئیں جس پر وہاں ایک ہنگامہ ہو گیا اور دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئے۔ اور اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد حضرت علی ۲۰ رمضان ۴۰ھ کو شہید کر دیئے گئے۔ اس اختلاف کے نتیجے میں مسلمانوں میں تین گروہ پیدا ہو گئے۔

اول خارجی: جو حضرت علی اور حضرت معاویہ دونوں کو ناحق پر مانتے تھے۔ حروراء کی جنگ میں حضرت علی نے اگرچہ ان کا زور ختم کر دیا تھا مگر چونچ گئے تھے وہ جہاں بھی تھے وہیں چپکے چپکے اپنی تحریک چلا رہے تھے۔

دوسرے شیعان علی: شیعان شیعہ کی جمع ہے جس کے معنی گروہ کے ہیں یہ لوگ حضرت علی کے ساتھ تھے اور ان کو خلیفہ برحق مانتے تھے۔

تیسرے عثمانی: جو حضرت معاویہ کو برحق مانتے تھے اور حضرت علی کو اس بنیاد پر ناحق مانتے تھے کہ انہوں نے حضرت عثمان کے قتل کا بدلہ نہیں لیا اور نہ ان کا گھر گھیرنے والوں کو سزائیں دیں۔

عبداللہ بن سبا

یہ ایک یہودی تھا جو صرف مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنے کے لیے مسلمان بنا بظاہر بہت پکا مسلمان معلوم ہوتا تھا نماز روزے کا بہت پابند تھا برائیوں سے بالکل اور رہتا تھا جس کی وجہ سے مسلمان اس کے گرویدہ ہو گئے اس نے جب یہ دیکھا کہ کچھ لوگ میرے معتقد ہو گئے ہیں تو اس نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر تنقیدیں شروع کر دیں مثلاً یہ کہ حضرت ابو بکر حضرت عمر بہت سادے رہتے تھے اور معمولی غذا کھاتے تھے ظاہری طور پر ان کی شان و شوکت کا کوئی سامان نہیں تھا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ چوں کہ بہت بڑے کروڑ پتی تھے اس لیے ان کا لباس رہن سہن بہت اونچا تھا عمدہ لباس پہنتے غلاموں کے ہمرٹھ میں چلتے۔ عبداللہ بن سبا نے چپکے چپکے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ پہلے کے

دونوں بزرگ خلیفہ کس سادگی سے رہتے تھے اور یہ کس شان و شوکت سے رہتے ہیں۔

حضرت عثمان خاندان بنو امیہ کے فرد تھے جس نے شروع شروع میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بہت بڑی مخالفت کی تھی لیکن بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو گئے۔ بنی امیہ کے لوگ بہت ذہین، ہوشیار اور حکمرانی کی صلاحیت رکھتے تھے جس کی وجہ سے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خاندان کے لوگوں کو بڑے بڑے ملکوں کا حاکم بنایا۔ حضرت عمرو بن عاص کو مصر کا حاکم بنایا۔ حضرت یزید ابن ابوسفیان کو شام کا اور ان کے فوت ہونے کے بعد ان کے بھائی معاویہ بن ابوسفیان کو ان جگہ شام کا والی بنایا۔ حضرت عثمان نے اپنے دور میں اپنے خاندان کے باصلاحیت لوگوں کو مختلف ممالک کا حاکم بنایا۔

عبداللہ بن سبا نے لوگوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ یہ اقربا پروری ہے اس طریقے سے تنقیدیں کر کے حضرت عثمان کے خلاف جو شیلے اجڈ لوگوں کو ورغلا یا جس کے نتیجے میں ان کی شہادت ہوئی۔ اب جب کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کا اختلاف ہوا تب عبداللہ بن سبا اور اس کے پیلوں نے اندر ہی اندر بہت آگ بھڑکائی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے تین گروہ ہو گئے۔ خارجی، شیعہ، عثمانی، جن کا ذکر اوپر ہوا۔

ابتداء یہ گروہ صرف سیاسی تھا مگر عبداللہ بن سبا ہی نے اور اس کے پیلوں نے بھر کہ جب تک نام مسلمانوں سے عقائد میں اختلاف نہیں کرو گے اور اپنے لوگوں کو یہ نہیں یقین کراؤ گے کہ عام مسلمان اصل اسلام سے ہٹ گئے ہیں تمہیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوگی۔ جس کے نتیجے میں عام مسلمانوں کے خلاف سب سے پہلے خارجیوں نے کچھ عقیدہ بنایا۔ ایک اسلامی عقیدہ یہ تھا کہ انسان جب تک اسلام کے بنیادی عقیدوں کو ماتا رہے کہ مسلمان رہے گا اگرچہ اس سے کچھ گناہ ہو جائیں گناہ کرنے کی وجہ سے کوئی کافر نہ ہوگا البتہ گنہگار اور فاسق ہوگا۔

خارجیوں نے اس کے برخلاف یہ عقیدہ بنایا کہ اگر کوئی شخص کوئی گناہ کرے تو وہ مسلمان نہیں رہتا بلکہ وہ کافر ہو جاتا ہے اگرچہ وہ اسلام کے بنیادی عقیدوں کو حق مانے اس کے فائدہ خارجیوں کو یہ ہوا کہ انہیں عام مسلمانوں سے لڑنے کا حق مل گیا ابتداء میں یہ فرقہ بہت

زور پکڑ گیا تھا جن کے ساتھ عام مسلمانوں کی بڑی زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں بالآخر یہ زیر ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد نیست و نابود ہو گئے۔

رافضی یا شیعہ

شروع شروع میں تو یہ لوگ صرف حضرت معاویہ کے مقابلے میں حضرت علی کو برحق مانتے تھے مگر عبد اللہ بن سبا اور اس کے چیلوں نے ان ایرانیوں کو جن کی ہزار سالہ حکومت حضرت ابو بکر حضرت عمر حضرت عثمان نے ختم کر دی تھی یہ پٹی پڑھانی شروع کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ان کے جانشین اور خلیفہ ہونے کا حق صرف حضرت علی کو تھا کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خاندان کے اعتبار سے قریبی تھے۔ ان کے چچا کے لڑکے بھی تھے اور داماد بھی یہ بات ایران کے اصول کے مطابق تھی کیونکہ ایران میں ایک بادشاہ کے بعد اس کا جانشین اس کا بیٹا ہوتا۔ بیٹا نہ ہوتا تو بیٹی ہوتی۔ جب ابن سبا اور اس کے چیلوں نے ایرانیوں کو یہ باور کرایا کہ خلیفہ ہونے کا سب سے پہلا حق حضرت علی کو تھا تو اس نے پھر یہ سکھانا شروع کیا کہ حضرت ابو بکر حضرت عمر حضرت عثمان غاصب تھے۔ انہوں نے حضرت علی کا حق غصب کیا ایرانی چونکہ دل سے ان تینوں حضرات سے کڑھتے تھے کہ ان تینوں حضرات نے ایرانیوں کی ہزار سالہ حکومت ملیا میٹ کر دی ہے اس نے اسے بڑی آسانی سے قبول کر لیا، ایرانی چونکہ ایک بہت چالاک قوم تھی، اس لئے کھل کر سامنے آنے کے بجائے بہت پوشیدہ احتیاط کے ساتھ اپنی اس تحریک کو چلایا اس کے لئے انہوں نے دو بنیادی قاعدے بنائے۔ ایک ”کتمان“ یعنی اپنے عقیدے کو چھپائے رکھنا اور جب تک مکمل اعتماد نہ ہو جائے کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ دوسرے تقیہ۔ کہ اپنے عقیدے کے خلاف ظاہر کرنا۔ رافضی اور شیعہ کی بنیاد یہی چیز سے پھر بعد میں چالاک ایرانیوں نے اپنے مذہب میں بہت سی باتیں داخل کر لیں مثلاً یہ کہ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک حضرت علی اور قیامت تک آنے والے بارہ اماموں کو امام برحق نہ مانے یہ قرآن مجید کو پہلے والے تینوں خلفائے گھٹا دیا ہے حضرت علی اور بارہ ائمہ کے بارے میں جو آیتیں تھیں ان کو نکال دیا اور اس قرآن میں

بھی بہت کچھ رد و بدل کیا۔ ترتیب بدل دی پھر اس کے بعد ان لوگوں نے نئی نئی ہزاروں حدیثیں گڑھ لیں اور اس سلسلے میں بہت موٹی موٹی کتابیں لکھیں۔

پہلے دور میں ان میں خود مختلف فرقے پیدا ہوئے جو خود آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے تھے پھر بعد میں اثنا عشری یا امامیہ نام سے ان کی اکثریت متفق ہو گئی ان کے بیسوں فرقے ناپید ہو گئے ان کے اب چار فرقے موجود ہیں۔

اول امامیہ اثنا عشریہ: ایران، عراق، ہندوستان، وغیرہ میں غالب اکثریت اسی فرقے کی ہے۔

نصیری: یہ حضرت علی کو خدامانتے ہیں بنیادی طور پر اور دیگر اعتقادات و عملیات میں تمام شیعوں سے مختلف ہیں یہ فرقہ آج کل شام میں بہت زور پکڑے ہوئے ہے شام کے صدر حافظ الاسد اسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

تفضیلی: دیگر اعتقاد اور عملیات میں اہل سنت کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں مگر ان کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی تمام صحابہ حتیٰ کہ تینوں خلفا سے افضل ہیں اور خلافت کے مستحق، لیکن، جب خود حضرت علی نے تینوں خلفا کو مان لیا تو وہ تینوں خلیفہ برحق ہو گئے یہ صحابہ کرام پر تبر نہیں کرتے یعنی انہیں گالیاں نہیں دیتے۔

داؤدی بوہرے: جو بھی میں رہتے ہیں دیگر شیعوں سے بہت سے عقائد اور اعمال میں یہ مختلف ہیں مگر یہ اپنے عقیدوں کو ایسا چھپاتے ہیں کہ دوسری کو ہوا بھی نہیں لگ پاتی۔ ان چار علاوہ شیعوں کے محدود پارٹیاں اور بھی ہیں مثلاً آغا خانی، خوجہ، بابی یہ بہت محدود ہیں اور اپنے عقائد کو اتنا خفیہ رکھے ہوئے ہیں کہ باوجود کوشش کے بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

معتزلہ: اہل سنت کے مخالف فرقوں میں معتزلہ دیگر فرقوں کے بہ نسبت تعداد میں بھی زیادہ رہے اور کئی صدی تک باقی رہے۔ ان میں بہت نامور اہل علم اور صاحب تصنیف اور ذی اثر افراد گزرے ہیں ان کا زور اتنا بڑھا کہ بنی عباس کے بہت سے شہنشاہوں نے بھی

ان کا مذہب قبول کر لیا۔ مثلاً مامون، متوکل، معتصم وغیرہ۔ یہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ علامہ جار اللہ زنجبیری تفسیر کشاف کے مصنف، ابو یعقوب سکا کی مفتاح العلوم کے مصنف، جاحظ وغیرہ جیسے علم و فضل والے معتزلی تھی۔ اس فرقے کی بنیاد دوسری صدی ہجری کے اوائل ہی میں پڑ گئی تھی۔ اس فرقے کا بانی و اصل ابن عطا متوفی ۱۳۱ھ/۲۴۸ء تھا یہ بہت سے عقائد میں اہل سنت کے مخالف ہیں۔ چند اختلافات یہ ہیں۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان مومن ہو گا یا کافر، بیچ میں کوئی درجہ ایسا نہیں کہ ایک شخص نہ مومن ہو نہ کافر۔ اگرچہ وہ کتنا ہی گناہ کرے معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو مسلمان گناہ کرے وہ نہ مومن ہے نہ کافر وہ بیچ کے درجے میں ہیں۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ بندوں کا خالق ہے اسی طرح ان کے افعال کا بھی خالق ہے اور بندے کا سبب ہیں بندوں کو یہ قوت ہے کہ وہ اپنے اختیار سے جو چاہیں کریں مگر ان افعال کو پیدا اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خالق ہے اور بندے اس کے کاسب ہیں۔ اس کے برخلاف معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اللہ تعالیٰ کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان کے مرنے کے بعد ایک زندگی ہوتی ہے جس کو برزخی زندگی کہتے ہیں اس کے برخلاف معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسانی مٹی ہو جاتا ہے اسے کسی قسم کی کوئی زندگی نہیں ملتی۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں مومن اور نیک انسانوں کو انعام ملتا ہے ان کے لیے جنت کی کھڑکیاں کھول دی جاتی ہیں جنت کے بچھونے بچھا دیئے جاتے ہیں۔ کافر اور کچھ گنہگاروں کو قبر میں عذاب ہوتا ہے اس برخلاف معتزلہ کہتے ہیں کہ قبر کا انعام اور عذاب باطل ہے۔

اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جنتیوں کو جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا اس کے برخلاف معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ محال ہے۔ اس قسم کے بہت کثیر اختلافات ہیں۔ یہ فرقہ صدیوں تک رہا مگر علمائے اہل سنت کے دلائل اور ان کی کوششوں سے اب نیست و نابود ہو گیا لیکن اس فرقے کی کچھ باتیں اس وقت کے کچھ فرقوں نے اختیار کر لی ہیں۔

قدر یہ: یہ فرقہ صحابہ کرام کے اخیر دور میں پیدا ہو چکا تھا یہ فرقہ تقدیر کا منکر

تھا۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل اپنے ازلی قدیم علم سے ہر بندے کے بارے میں جانتا تھا کہ مومن ہوگا یا کافر۔ نیک ہوگا یا بد۔ امیر ہوگا یا غریب وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے مطابق اس نے لوح محفوظ میں فرشتوں سے لکھوادیا۔ لوح محفوظ ایک بہت بڑا دفتر سمجھ لیجئے۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے یا قیامت تک ہونے والا ہے سب اس میں لکھا ہوا ہے، اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اسی کے مطابق ہو رہا ہے اس کے خلاف ہونا محال ہے۔ قدر یہ اس کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی صلاحیت، اپنی محنت اور اپنی کوشش سے ترقی کرتا ہے یا اس میں کمی کی وجہ سے تنزلی پاتا ہے۔ امیر ہوتا ہے یا غریب ہوتا ہے۔ مومن ہوتا ہے یا کافر ہوتا ہے ہر حال میں اس کی محنت و کوشش ہی کو دخل ہے۔

جبر یہ: یہ فرقہ بھی پہلی صدی ہجری کے اخیر میں پیدا ہو چکا تھا۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اگرچہ اللہ عزوجل تمام بندوں کا اور ان کے افعال کا خالق ہے مگر اس نے بندوں کو کچھ قدرت اور اختیار بھی دے رکھا ہے اس نے انسان کو سمجھ دی ہے۔ پڑھنے لکھنے کی قوت دی۔ اچھے برے کے پرکھنے کی قوت دی اور پرکھنے کے لئے عقل دی۔ انسان کے اعضاء میں حرکت کی قوت دی۔ انسان اپنی صواب دید سے مذہب اختیار کرتا ہے۔ چلتا پھرتا ہے۔ وہ چاہے تو مسجد میں نماز کے لئے جائے۔ وہ چاہے تو شراب خانے میں شراب پینے کے لئے جائے۔

اس کے برخلاف جبر یہ یہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبور محض ہے جس طرح (رعشہ) کچی والے ہاتھ پاؤں سر وغیرہ بے اختیار ہلتے ڈولتے ہیں حالانکہ رعشہ کا مریض انہیں ہلاتا نہیں چاہتا اسی طریقے سے ہر بندہ مجبور محض ہے وہ اپنے اختیار سے کچھ نہیں کر سکتا۔

مرجیہ: یہ فرقہ بھی دوسری صدی ہجری میں پیدا ہو چکا تھا۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جو اسلام کی بنیادی باتوں کو حق مانے اس کے باوجود کوئی گناہ کرے تو وہ جہنم کا مستحق ہے اپنی گناہ کی سزا میں وہ کچھ دن جہنم میں رہے گا مگر یہ کہ اللہ عزوجل اسے معاف فرمادے۔ اس کے برخلاف مرجیہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان کو گناہ کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

قرامطہ: عراق کے مشہور شہر واسط میں ایک بستی قرامطہ ہے وہاں ۲۵۸ھ میں حم

ان نامی ایک شخص پیدا ہوا اس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی اس کا بھی اصل رشتہ اسمعیلی رافضیوں سے تھا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔ یہ بہت ہی خطرناک فرقہ تھا۔ یہ خفیہ خفیہ اپنی تحریک چلاتا تھا اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا مگر قرآن و احادیث کے وہ معانی بتاتا تھا جو ظاہر کے بالکل خلاف اور ایچ پیج سے ثابت ہوتے تھے۔ مثلاً وضو کے معنی امام وقت کی محبت بتاتا تھا اور تیمم کا معنی یہ بتاتا تھا کہ امام جب غائب ہو تو اس کی اطاعت میں کچھ کچھ ڈھیل دی جائے۔ زکوٰۃ کے معنی یہ بتاتا تھا کہ جو باتیں دین کی ہیں انہیں سے جان کر اپنی ذات کو صاف و ستھرا رکھا جائے۔ یہ فرقہ بہت زور پکڑ گیا تھا۔ حجاج کو لوٹتا تھا مکہ معظمہ پر قابض ہو گیا۔ کعبہ شریف کا وہ مقدس پتھر جسے حجر اسود کہتے ہیں اکھاڑ کر لے گیا تھا اس کے آدمی تقیہ کر کے بڑے بڑے علماء و مشائخ اور حکام کے یہاں رسوخ حاصل کرتے پھر انہیں ختم کر دیتے لیکن پھر ایک ہی صدی میں سلاطین اسلام نے ان کو بالکل ہی ختم کر دیا۔

نجدی: یہ فرقہ بارہویں صدی کے اخیر اور تیرہویں صدی کے اوائل میں ظاہر ہوا۔ اس فرقے کا بانی محمد بن عبدالوہاب نامی ایک شخص ہے جو نجد کی ایک بستی میں پیدا ہوا تھا اس کے باپ دادا پیری مریدی کرتے تھے جس کی وجہ سے اس کے خاندان کا نجد میں کافی اثر تھا اس نے درعیہ کے حاکم محمد بن مسعود سے اپنی لڑکی بیابا اور اس کو اپنا بنایا۔ پھر اس کو ساتھ لے کر تلوار کے زور سے اپنے فرقے کو پھیلانا شروع کیا پہلے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے علاقے کو زیر کیا پھر نجد سے حجاز تک قابض ہو گیا۔ اس وقت حجاز پر ترکوں کی حکومت تھی۔ مگر ان دنوں ترک برطانیہ، جرمنی، اس کے ساتھ جنگ میں الجھے ہوئے تھے اس لئے ابن سعود نے آسانی سے حجاز پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں کے ہزار ہا باشندوں کو قتل کیا۔ پھر جب ترکوں کو اطمینان ملا تو ترکوں نے ان کو حجاز ہی نہیں بلکہ نجد سے بھی نکال باہر کیا۔ پھر ۱۸۱۴ھ کی جنگ کے بعد ترک اپنے محدود علاقے میں رہ گئے اور حجاز، شام، مصر وغیرہ کے لوگوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں تو برطانیہ کی امداد سے عبدالعزیز بن سعود نے پھر پورے نجد و حجاز پر قبضہ کر لیا اور ترکوں کو نکال باہر کر دیا۔ ان کو وہابی بھی کہا جاتا ہے ان کی مذہبی بنیادی کتاب "کتاب التوحید" ہے جو ابن عبدالوہاب نے لکھی ہے اس فرقے کے بنیادی عقائد یہ ہیں:

۱۔ سوائے ان کے (وہابیوں کے) پوری دنیا کے مسلمان کافر و مشرک ہیں ان سے جہاد کرنا ان کو قتل کرنا ان کے ملکوں کو لوٹنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔

۲۔ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و اولیا کو یہ قوت بخشی ہے کہ لوگوں کی مدد کریں۔ یہ قوت انہیں زندگی میں بھی حاصل ہے اور فوت ہونے کے بعد بھی حاصل رہتی ہے نجدی وہابی یہ کہتے ہیں اللہ عزوجل کے علاوہ کسی نبی ولی سے مدد مانگنا شرک ہے۔

۳۔ تمام اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ انبیاء و اولیا قیامت کے دن گنہ گاروں کی شفاعت کریں گے وہابی نجدی شفاعت کے منکر ہیں۔

۴۔ تمام اہل سنت و جماعت میلاد و فاتحہ، عرس وغیرہ کرتے ہیں وہابی نجدی ان سب کو حرام و گناہ کہتے ہیں۔

ان مذکورہ بالا فرقوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے فرقے پیدا ہوئے جو محدود دائرے میں رو کر چند دن کے بعد فنا ہوئے۔

ہندوستان کے موجودہ فرقے

وہابی: یہ فرقہ ہندوستان میں نجد سے آیا۔ اس کی بنیاد محمد بن عبد الوہاب نجدی کی کتاب "التوحید" پر ہے۔ اس فرقے کے بانی مولوی اسماعیل بن عبد الغنی بن ولی اللہ دہلوی ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی گیارہویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے بہت زبردست عالم تھے اور بہت بڑے پیر بھی۔ ان کا اثر پورے ہندوستان پر تھا۔ بلکہ ہندوستان کے باہر بھی تھا۔ انہیں کے صاحبزادے شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ہیں جو دہلی کے بہت بڑے مرکزی عالم تھے۔

مولوی اسماعیل دہلوی چونکہ شاہ ولی اللہ کا پوتہ اور شاہ عبد العزیز کا بھتیجا اور شاہ گربھی تھا۔ عوام میں بزرگ پرستی عام ہے جس کے نتیجے میں اپنے استاذ اور پیر کی اولاد کو پیروں کی طرح ماننے کا جذبہ موجود ہے اس کی وجہ سے مولوی اسماعیل دہلوی کے ماننے والوں کی اچھی خاصی تعداد دہلی اور اس کے علاقوں میں موجود تھی۔ چونکہ ان کے والدین کا بچپن ہی میں

انتقال ہو گیا تھا اس لئے ان کی کما حقہ تربیت نہیں ہو سکی۔ ساتھ ہی ساتھ فطری طور پر منحلے اور شوخ اور نئی نئی باتوں کے گرویدہ تھے۔ یہ دور وہ تھا کہ مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ انگریز پورے طور پر اس کو اپنی مٹھی میں لے چکے تھے۔ صرف دہلی پر مغل شہنشاہ کی حکومت رہ گئی تھی۔ وہ بھی برائے نام۔ ان کی حیثیت انگریزوں کی وظیفہ خوار کی کی تھی۔ پورے پنجاب پر سکھ قابض ہو چکے تھے۔ البتہ پشاور اور سرحد کے لوگ آزاد تھے مولوی اسماعیل کے اندر بادشاہ بننے کا خبط پیدا ہوا انہوں نے پہلے ایک کتاب لکھی جس کا نام ”تقویۃ الایمان“ رکھا اس میں انہیں عقائد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جو ابن عبدالوہاب نجدی کی کتاب ”التوحید“ میں ہے۔ ان عقائد کو پھیلانے کے لئے مسلمانوں میں دو تحریک چلائی ایک یہ کہ اللہ ہی کو مان۔ اوروں کو مت مان۔ اوروں کو ماننا خبط ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید سمجھنے کے لئے بہت زیادہ علم کی ضرورت نہیں۔ عربی زبان جان لینا کافی ہے۔ اس لئے ان کو زیادہ دین کا علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے وہ یہ فائدہ حاصل کرتا تھا کہ ہر عربی داں خود قرآن مجید کو سمجھے۔ قرآن مجید کے وہ معانی و مطالب جو صحابہ کرام اور ان کے بعد کے آنے والے مسلمانوں نے بتایا ہے ان کو ماننے کی ضرورت نہیں۔

تقویۃ ایمان میں مولوی اسماعیل دہلوی نے انبیاء کرام و اولیاء عظام کی شان میں بہت سے نازیبا الفاظ استعمال کئے۔ مثلاً وہ ذرہ ناچیز سے کم تر ہیں۔ عاجز و نادان ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ بلکہ یہ بھی ایک جگہ لکھ دیا کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا اللہ کی شان کے آگے چہرے سے بھی ذلیل سے ایک جگہ لکھ دیا کہ جس کا نام محمد یا علی ہو وہ کسی چیز کا مالک و مختار نہیں۔ ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں لکھا وہ مرکرٹی میں مل گئے۔

تمام اہل سنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوسرے انبیاء کرام و اولیاء عظام قیامت کے دن اللہ عزوجل کی بارگاہ میں شفاعت فرمائیں گے انہوں نے جگہ جگہ اس کا بھی انکار کیا۔ تقویۃ الایمان کے بارے میں خود ان کا اپنا یہ خیال تھا اس سے شورش ہوگی۔ لڑائی اور جھگڑا ہوگا۔ چنانچہ ان کے اس گمان کے مطابق تقویۃ الایمان کے شائع ہونے کے بعد لڑائی جھگڑا اور شورش شروع ہوئی اس وقت کے تمام علمائے اہل سنت نے اس کا رد

لکھا۔

خود ان کے بھتیجے مولانا موسیٰ، مولانا مخصوص اللہ نے تقویت الایمان کا رد لکھا، جس کا نام ”معید الایمان“ ہے اس زمانے میں دہلی کے سب سے بڑے عالم علامہ فضل حق خیر آبادی نے بھی اس کا رد لکھا جس کا نام ”تحقیق الفتویٰ“ ہے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے حادثے میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ انگریزوں سے باقاعدہ جنگ کیا، جس کی سزا میں جزیرہ انڈمان جلا وطن کر دیئے گئے۔ وہیں ان کا انتقال بھی ہوا، وہیں ان کا مزار بھی ہے اس وقت کے علمائے اہل سنت کی متحدہ مخالفت کے نتیجے میں مولوی اسماعیل دہلوی کا مذہب وہابیت پنپ نہ سکا محدود دائرے میں رہ گیا۔

پھر کچھ دنوں کے بعد انگریزوں سے اجازت لے کر سکھوں کے خلاف جہاد کی تحریک چلائی، اس کے لیے پورے ملک کا دورہ کیا، جہاد کے نام پر مولوی اسماعیل کے ساتھ ایک بھیڑ جمع ہو گئی اور یہ اس بھیڑ کو لے کر صوبہ سرحد پہنچے، وہاں اس وقت مختلف سرداروں کی منتشر حکومتیں تھیں۔ سرحد کے جن سرداروں نے ان کا مذہب قبول کیا، ان کو اپنے ساتھ لیا، ورنہ انہیں تباہ و برباد کر دیا، یہاں تک کہ وہاں کے کچھ سردار جن کی سکھوں سے مسلسل جنگ چلی آرہی تھی، صلح کر لی اور مولوی اسماعیل سے بچنے کے لیے سکھوں کے ساتھ مل گئے، جن کے نتیجے میں مولوی اسماعیل بالاکوٹ میں قتل کر دیئے گئے۔

غیر مقلد:

دہلی میں کچھ لوگوں نے ان کی تحریک کو قبول کر لیا تھا، جن میں ایک مشہور عالم نذیر حسین دہلوی ہیں۔ یہ بہت قابل ذہین عالم تھے، انہوں نے اپنے طور پر فری (بلا معاوضہ) حدیث پڑھانا شروع کیا، اور اپنے شاگردوں کو وہابیت کی تلقین کی جو عقائد نجدی وہابیوں کے تھے، وہی عقائد ان کے بھی تھے۔ بنیادی طور پر انہوں نے اپنے شاگردوں کو یہ سمجھایا کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی وغیرہ نے قرآن و احادیث سے جو مسائل نکال کر فقہ کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اکثر غلط ہیں۔ حدیث کی کتابیں موجود ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم براہ راست قرآن و احادیث سے مسائل نکالیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ”اہل حدیث“ کہتے ہیں

اور عرف عام میں انہیں ”غیر مقلد“ کہا جاتا ہے۔ ان سے اہل سنت کا سیکڑوں مسائل میں اختلاف ہے، جس کی تفصیل بہت طویل ہے۔

دیوبندی:

مولوی اسماعیل ہی سے متاثر ہو کر کچھ لوگ عقیدے میں ان کے ساتھ تھے۔ لیکن عملی طور پر وہ اپنے آپ کو حنفی کہتے تھے۔ یعنی عملیات میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے مقلد تھے اور تقلید کو واجب جانتے تھے۔ ایسی ہی لوگوں سے نانوتہ ضلع سہارن پور کے مولوی قاسم بانی مدرسہ دیوبند نے تعلیم حاصل کی۔ فراغت کے بعد دیوبند میں ایک مدرسہ کو دارالعلوم بنانے کی تحریک چلی جو وہاں کے مقامی لوگوں نے قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ دیوبند کی ایک مسجد جس کا نام چھتہ کی مسجد ہے قائم ہوا تھا۔ جب مدرسہ جم گیا تو مولوی محمد قاسم دیوبند پہنچ گئے اور مدرسے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس مدرسے میں مولوی اسماعیل دہلوی اور عبدالوہاب نجدی کے عقائد کی تعلیم دینے لگے۔ ادھر مولوی رشید احمد گنگوہی نے اپنے وطن گنگوہ میں خانقاہ قائم کر لی اور پیری مریدی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس طرح وہابیت کی دوسری شاخ وجود میں آئی۔ یہ لوگ تمام عقائد میں وہابیوں کے ہمنوا ہیں۔ دیوبندی اور غیر مقلدین میں عقیدے کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف ہے تو صرف یہ کہ غیر مقلد کسی امام کی تقلید کو شرک سمجھتے ہیں اور دیوبندی تقلید کو واجب جانتے ہیں اور اپنے آپ کو حنفی کہتے ہیں۔ غیر مقلد پیری مریدی کو حرام اور بدعت کہتے ہیں اور دیوبندی بہت دھوم سے پیری مریدی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اہل سنت سے عقیدے کا اختلاف یہ ہے:

تمام اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو خصوصاً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب عطا فرمایا اور دیوبندی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لیے علم غیب ثابت کرنا شرک ہے۔

تمام اہل سنت میلاد، نیاز، عرس، فاتحہ کرتے ہیں اور دیوبندی اس کو حرام و بدعت کہتے ہیں۔ اور بھی چھوٹے چھوٹے بہت سے اختلافات ہیں۔ خاص دیوبندیوں کے مزید عقائد یہ ہیں۔

- (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی کر خاتم الانبیا نہیں کہ آپ سب میں آخری نبی ہیں اگر آپ کے زمانے میں یا آپ کے زمانے کے بعد کوئی نبی پیدا ہو جائے تو خاتمیت نبی میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔ آپ بدستور خاتم الانبیا ہیں۔ (تخذیر الناس)
- (۲) شیطان کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے۔ (براہین قاطعہ)
- (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا علم غیب ہر زید، عمر، بکر بلکہ ہر صبی (بچہ، و مجنون (پاگل) جمیع حیوانات (جانوروں) بہائم (چوپایوں) کو بھی حاصل ہے۔ (حفظ الایمان)
- (۴) اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے۔ ہر کام جو بندے کر سکتے ہیں وہ بھی کر سکتا ہے۔

نیچیری:

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں انگریزوں سے بہت قریب تھے اور انگریزوں سے کافی متاثر بھی۔ انگریزوں نے اسلام پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان سے متاثر ہو کر انہوں نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ جو باتیں قرآن و حدیث میں مذکور ہیں، اگر ہمارا نیچر قبول کرے تو مانیں ورنہ ان کے ایسے معانی بیان کریں جسے ہمارا نیچر قبول کرے۔ مثلاً فرشتوں کا کوئی وجود نہیں۔ چیزوں میں جو قدرتی خیر کی قوت ہوتی ہے، انہیں کا نام فرشتہ ہے۔ جنت کوئی گھر نہیں جو بطور انعام مسلمانوں کو ملے گا۔ بلکہ اپنی نیکیوں پر خوش ہونے کا نام ہے۔ دوزخ کسی جگہ کا نام نہیں بلکہ اپنی برائیوں پر کڑھنے کا نام دوزخ ہے۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر لکھی جس میں ان سب باتوں کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے میں تمام مسلمانوں نے ان سے عقیدے کی بنیاد پر بیزاری ظاہر کی۔ جس کے نتیجے میں نیچری فرقہ منظم نہیں ہو سکا، پھر بھی ہزاروں مسلمان کہلانے والے انہیں کے مطابق اعتقاد رکھتے ہیں۔

قادیانی:

پنجاب ضلع گرداسپور میں ایک بستی قادیان ہے۔ وہاں ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی پیدا ہوا۔ اس نے مولوی محمد قاسم دیوبندی سرغنہ کی کتاب ”تخذیر الناس“ پڑھ کر یہ

سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کا پیدا ہونا خاتم الانبیاء ہونے کے منافی نہیں تو اس نے نبوت کا دعویٰ کر لیا کہ میں ظلی اور بروزی نبی ہوں اور یہ کہا کہ حدیثوں میں جو آیا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم قیامت کے قریب آئیں گے، وہ میں ہوں اس کے علاوہ اور بھی مسلمانوں کے خلاق عقیدے ایجاد کیے۔ چوں کہ وہ آدمی بہت ذہین پڑھا لکھا اور چالاک تھا، اس لیے اس نے زیادہ تر انگریزی داں طبقہ کو اپنا ہموا بنایا۔ اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس نے اپنی تحریک کو چلایا جس کے نتیجے میں ہندوستان کے ہزاروں آدمی قادیانی ہو گئے اور اب بھی موجود ہیں۔

اہل قرآن:

ایک شخص عبداللہ نامی پیدا ہوا۔ یہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کا بہت زبردست ماہر تھا۔ اس نے یہ کہا کہ احادیث معتبر نہیں۔ اس لیے کہ آج جو حدیث کی کتابیں ملتی ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ایک صدی گزرنے کے بعد لکھی گئی ہیں اور یہ کتابیں لکھنے والے سب ایرانی ہیں جنہوں نے اپنے جی سے گڑھ کر حدیثوں کے دفتر تیار کیے۔ ہاں! قرآن مجید محفوظ ہے۔ ہم صرف قرآن کو حق مانتے ہیں جو کچھ ہمیں قرآن سے سمجھ میں آئے وہی عقیدہ رکھیں گے۔ اور اسی پر عمل کریں گے۔ حدیثوں کا اور علمائے اسلام نے جو کچھ لکھا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بجائے پانچ وقت کے صرف دو وقت نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز کا طریقہ بھی عام مسلمانوں سے الگ تھلگ ہے۔ اس فرقے کے لوگ بہت تھوڑے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

مودودی:

اس فرقے کے بانی ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ہیں یہ لوگ اپنے آپ کو جماعت اسلامی کہتے ہیں یہ فرقہ بھی حقیقت میں وہابیت ہی کی ایک شاخ ہے یہ لوگ بھی تمام دیوبندیوں کی طرح ابن عبدالوہاب نجدی اور اسماعیل دہلوی کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں اور ابن عبدالوہاب کی کتاب ”کتاب التوحید“ اور مولوی اسماعیل دہلوی کی کتاب ”تقویۃ“

الایمان“ کو اپنے مذہب کی بنیادی کتاب مانتے ہیں۔ مزید برآں ان کا اختلاف غیر مقلد اور دیوبندیوں سے بھی بہت باتوں میں ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب صحابہ کرام کی شان میں بہت گستاخ ہیں۔ اپنی کتاب خلافت و ملوکیت میں انہوں نے صحابہ کرام پر بے جا، ناروا حملے کیے ہیں۔ نیز قرآن مجید کے بعض قوانین میں ترمیم کے بھی حامل ہیں۔ مثلاً چور کی سزا میں ہاتھ کاٹنا، یازنا کی سزا میں سنگساری کرنا، اگرچہ وہ یہ ترمیم محدود دائرے میں چاہتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا اختلاف دیوبندیوں سے بھی ہے اور غیر مقلدین سے بھی ہے۔ اہل سنت سے تو ہے ہی انہوں نے بھی انگریزی طبقہ کو زیادہ تر اپنا ہم نوا بنایا ہے۔ اس وجہ سے یہ جماعت بہت منظم اور مضبوط ہے لیکن مسلمانوں کی اکثریت خواہ وہ عوام ہوں یا علما و مشائخ سب ان سے بے زار ہیں۔

نیازی:

ایک شخص شمع نیازی پیدا ہوا، جس کا رجحان شیعیت کی طرف زیادہ تھا۔ اس نے یہ کہا کہ کعبہ بیت اللہ نہیں بلکہ وہ حضرت آدم کی قبر ہے اسی لیے اس کا طواف کیا جاتا ہے، اور حج کیا جاتا ہے یہ لوگ تعزیر داری وغیرہ بہت دھوم سے کرتے ہیں۔ شیعوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے، اور قبر پرستی میں بہت آگے ہیں، اس فرقے کے بہت تھوڑے اشخاص کہیں کہیں خال خال پائے جاتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے کہ میری امت میں ہتر فرقے ہوں گے، سوائے ایک کے سب جہنم میں جائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک اتنے فرقے ہوں گے اور اس سے مراد بنیادی فرقے ہیں۔ ورنہ بنیادی فرقوں کی شاخوں کو لیا جائے تو اب تک بہت سے زائد ہو چکے ہیں، جن میں اکثر فنا ہو گئے۔

(۱۵/ جمادی الآخرہ ۱۳۱۵ھ - ۲۸/ دسمبر ۱۹۹۰ء)

باب سوم

تحقیقات
و
فقہیات

پیغمبر خدا

قانون داں بھی قانون ساز بھی

قانون ساز اور قانون داں یہ دو لفظ عرف میں الگ الگ معنی کے لیے آتے ہیں۔ قانون داں کے معنی ہیں۔ قانون جاننے والا، جس کی حیثیت صرف قانون کے کلیات و جزئیات کے معتد بہ حصہ پر عبور کی ہوتی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر اتنی مہارت ضروری ہے کہ وہ ہر نئے پیش آنے والے حادثہ کا حکم قانون کی کلیات سے یا اس کے مثل و نظیر دوسری جزئی سے قیاس کر کے نکال سکے جس کی مثال وکیل اور بیرسٹر ہیں کہ یہ لوگ صرف قانون داں ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی قابل، ذہین، فطین ہوں یہ لوگ قانون کی دفعات یا اس کی عبارت میں کوئی ادنیٰ رد و بدل نہیں کر سکتے۔ قانون کے اصطلاحی معنوں میں کوئی تغیر نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ان میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نئے مقدمات کے لیے قانون کی دفعات سے احکام نکال لیتے ہیں اور اسے اپنے دعویٰ کے مطابق کرنے کے لئے ہفتوں، مہینوں بحث و تمحیص کر سکتے ہیں، مگر قانون میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے ہیں۔

شریعت اسلامیہ میں ان کی نظیر علمائے دین ہیں جو شریعت کے اصول و فروع پر حاوی ہوتے ہیں۔ اتنی استعداد رکھتے ہیں کہ کوئی نیا واقعہ رونما ہو تو اس کا حکم استخراج کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسائل شرعیہ پر اعتراض کرنے والوں کو دندان شکن جواب دے لیتے ہیں، مگر شریعت کے کسی حکم کو بدل نہیں سکتے اس میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے اس کے الفاظ کو نیا معنی نہیں پہنا سکتے۔

رہ گیا قانون ساز تو یہ لفظ اس اختیار ہستی پر اطلاق کیا جاتا ہے جو جب چاہے خواہ با اختیار خود یا باذن مختار مطلق قانون کی جس دفعہ کو چاہے منسوخ کر دے، اس میں رد و بدل

کردے۔ الفاظ کے نئے معنی معین کر دے، جن افراد کو چاہے جس قانون سے چاہے مستثنیٰ کر دے۔ اس کی ایک مثال ہمارے معاشرے میں شہنشاہ کی ہے کہ وہ اپنی مملکت کا آمر مطلق ہوتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو قانون چاہتا ہے ختم کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے جس قانون سے چاہتا ہے مستثنیٰ کر دیتا ہے۔ دوسری مثال وزیر قانون کی ہے کہ وہ شہنشاہ کے اذن و اختیار سے قانون بناتا ہے، اس میں ترمیم و تبدیل کرتا ہے۔

اب جب قانون بنادوں و قانون ساز دونوں الفاظ کے معانی ذہن نشین ہو گئے تو اب آئیے شریعت اسلامیہ کی تائیس کا ایک تحقیقی جائزہ لیں اور یہ تلاش کریں کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیثیت صرف قانون داں کی تھی یا یہ کہ آنحضرت ﷺ باذن اللہ قانون ساز بھی تھے۔

۱۔ اس بحث کے چند پہلو ہیں ایک یہ کہ آنحضرت ﷺ باذن اللہ قانون ساز تھے۔ قرآن کی روشنی میں۔

۲۔ آنحضرت ﷺ قانون ساز ہیں احادیث کی روشنی میں۔

۳۔ آنحضرت ﷺ قانون ساز ہیں شواہد کی روشنی میں۔

۴۔ اس بارے میں امت کا عقیدہ آج سے پہلے کیا رہا اور کیا ہے؟

(۱) آیات:

آیات قرآن کریم پر اگر کوئی تحقیقی نظر ڈالے تو اسے اس بارے میں صدہا نصوص مل جائیں گی۔ سرسری نظر ڈالنے پر بھی جو نصوص سامنے ہیں وہ کم نہیں۔

آپ قرآن مجید کی تلاوت کریں، جگہ جگہ ملے گا اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ جس نے اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی وہ فاسق و ظالم ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اللہ عزوجل کے مختار مطلق ہونے کے بارے میں کسی مدعی اسلام کو ادنیٰ شبہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی شان توفیعال لَمَّا يُرِيدُ اور يَحْكُمُ مَا يَشَاءُ ہے۔ اللہ عزوجل کی اطاعت و عصیان کے موازی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم اور عصیاں کی ممانعت اس کی دلیل ہے کہ اس باب میں مختار و ماذون، عطائی و ذاتی و جوہ

وامکان، حدود و قدم وغیرہ کا فرق تو ہے مگر واجب الاتباع و مطاع دونوں ہیں۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ جس طرح اللہ عزوجل شریعت میں نسخ، ترمیم، تبدیل، تخصیص، تقلید کر سکتا ہے اس کے اذن سے اس کے رسول ﷺ بھی یہ سب اختیار رکھتے ہیں، اور یہی معنی قانون ساز کے ہیں۔ ان عمومی ارشادات کے علاوہ آئیے چند خصوصی ارشادات ملاحظہ کریں، ارشاد ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ.

(آل عمران: پ ۳، ع ۱۲۶ آیت ۳۱)

ترجمہ فرمادو! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب بنا لے گا۔

اور ہر شخص جانتا ہے کہ اتباع کا یہی مطلب ہے کہ جو حکم دیا جائے اس کو مانا جائے اور پر عمل کیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ رسول جو حکم دین اس کا ماننا لازم ہے تو ثابت ہو گیا کہ رسول کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امت کو جو چاہیں حکم دین، یہی قانون ساز کے معنی ہیں، اور فرمایا گیا:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ وَ سَاءَ ثَمَّ مَصِيرًا. (سورہ نساء: پ ۵، ع ۱۳۶، آیت ۱۱۵)

ترجمہ: حق ظاہر ہو جانے کے بعد جو بھی رسول کے خلاف کرے، اور مومنوں کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ پکڑے، ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جہنم اور اسے جہنم میں ڈالیں گے اور یہ برا ٹھکانا ہے۔

رسول کا خلاف یہی ہے کہ وہ جو فرمائیں نہ مانا جائے اس پر عمل نہ کیا جائے یہ اسی بنا پر ہے کہ ان کا ہر حکم قانون شریعت ہے اور جس کا حکم ہر قانون شریعت ہوتا ہے، وہ قانون ساز ہوتا ہے، صرف قانون داں نہیں۔ اور سنیے سورہ نور میں ہے:

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. (سورہ نور: پ ۱۸، ع ۱۵۶، آیت ۶۳)

ترجمہ: جو لوگ رسول کے حکم کے خلاف کرتے ہیں وہ ڈریں کہیں ان کو فتنہ نہ آئے یا دردناک عذاب نہ پہنچے۔

رسول کے حکم کے خلاف کرنے والے پر یہ وعید اسی لئے ہے کہ ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی شریعت کی خلاف ورزی ہے، اور یہ حیثیت شریعت ساز کی ہو سکتی ہے صرف شریعت داں کی نہیں۔ لیجئے سورہ احزاب کی آیت ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا.

(سورہ احزاب: پ ۲۲. ع ۲۶. آیت ۳۶)

ترجمہ: کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کی مجال نہیں کہ اللہ و رسول کوئی حکم فرمائیں تو انہیں اپنے معاملہ کا اختیار رہے اور جو اللہ و رسول کا حکم نہ مانے وہ بلاشبہ کھلے بند گمراہ ہوگا۔

اس آیت کریمہ کی مراد کی توضیح کے لیے اس کا شان نزول بھی سنتے چلیے۔ حضور سید عالم ﷺ نے اپنے متبنی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح کا پیام زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے بھائی کو دیا، ان لوگوں نے نا منظور کیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ غور کیجئے! زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت زینب کا نکاح ہونا حضور ﷺ ہی نے بہ نفس نفیس طے فرمایا۔ خود ہی پیام دیا، اس بارے میں کوئی آیت نہیں اتری تھی، مگر اسے نا منظور کرنے پر اتنی سخت وعید آئی اور اسے اللہ کا بھی حکم فرمایا گیا، اس کی نافرمانی اللہ کے حکم کی نافرمانی قرار دی گئی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آں حضور ﷺ کی حیثیت صرف قانون داں کی نہیں قانون ساز کی بھی ہے۔

(۲) احادیث:

(۱) ترکت لیکم امرین لن تضلوا اما ان تمسکتہم بہما کتاب اللہ وسنة رسولہ.

ترجمہ: میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک ان دونوں کے پابند رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ۔

کتاب اللہ کے قانون شریعت ہونے میں کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔ اس کے

ترجمہ: اس کا لحاظ نہ ہوتا کہ میری امت پر شاق ہو تو میں حکم فرما دیتا کہ ہر پچھلے پہر مسواک کیا کریں۔

(۸) امام بخاری و مسلم و نسائی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

لو لا ان اشق علی امتی لامرتهم ان یصلوها ہکذا یعنی العشاء نصف اللیل۔
ترجمہ: اگر میری امت پر شاق ہونے کا خیال نہ ہوتا تو میں حکم دیتا کہ اسے یعنی عشاء کو اس وقت یعنی آدھی رات کو پڑھیں۔

غور کیجیے! ہر نماز کے وقت وضو یا مسواک یا ہر وضو کے ساتھ مسواک یا ہر صبح کو مسواک یا نماز عشاء کا نصف لیل تک موخر کرنا فرض نہیں، مگر حضور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا لحاظ ہے کہ ان چیزوں کے فرض فرمادینے سے امت مشقت میں پڑ جائے گی ورنہ ان چیزوں کو فرض کر دیتا مگر چونکہ ان کے فرض کر دینے سے امت مشقت میں پڑ جائے گی، اس لیے میں نے ان کو فرض نہیں فرمایا۔

(۹) یہ قول کسی قانون داں کا نہیں ہو سکتا یہ قول صرف قانون ساز کا ہو سکتا ہے فرماتے ہیں:

انی احرم علیم حق الضعیفین الیتیم والمرأة۔
ترجمہ: میں دو کمزوروں کی حق تلفی تم پر حرام کرتا ہوں: یتیم اور عورت۔ متفق علیہ (۱۰) ارشاد ہے:

لا تشرب مسکر افانی حرمت کل مسکر۔
ترجمہ: نشہ کی کوئی چیز نہ پی، میں نے ہر نشہ آور حرام فرمادیا۔

(۳) شواہد:

شواہد و نظائر بھی اس باب میں اتنے کثیر ہیں کہ ان سب کا احاطہ دشوار ہے۔ بلکہ جو فقیر کے علم میں اس وقت ہیں ان سب کا بھی کہ یہ نمبر متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ایک صاحب حاضر ہوئے، عرض کی: میں ہلاک ہو گیا۔ فرمایا کیا بات ہے؟ عرض کی، میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے ہم بستری کر لی ہے۔ فرمایا: ایک غلام آزاد کر سکتا ہے؟ عرض کی نہیں۔ فرمایا: کیا اسی طاقت ہے کہ مسلسل ساٹھ روزے رکھے، عرض کی نہیں۔ فرمایا: کیا اتنی استطاعت ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ عرض کی نہیں۔ اتنے میں سوادومن خرے کسی نہ پیش کئے۔ فرمایا: انہیں خیرات کر دے۔ عرض کی: اپنے سے زیادہ محتاج پر نہ؟ مدینہ بھر میں کوئی گھر ہمارے برابر محتاج نہیں۔

یہ سن کر حضور سید عالم ﷺ اتنا ہنسے کی دندان مبارک ظاہر ہو گئے، فرمایا: جا، اپنے گھر والوں کو کھلا دے۔

(۲) اسی کے مثل کفارہ ظہار میں بھی وارد ہے:

ظہار اور روزے کا کفارہ یہ مقرر ہے کہ وہ غلام آزاد کرے، اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے میں لگاتار روزے رکھے۔ اس کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کھانا کھلائے۔ مگر یہ حضور سید عالم ﷺ کی شان قانون سازی ہے کہ ان دونوں صاحبوں کو اس کفارہ سے مستثنیٰ فرما دیا، نہ صرف یہ کہ مستثنیٰ فرما دیا، بلکہ انہیں اتنے کثیر خرے عطا فرمائے۔

(۳) امام احمد مسند میں ثقات رجال صحیح مسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص آئے اور اس شرط پر اسلام لائے کہ صرف دو ہی نماز پڑھوں گا، نبی کریم ﷺ نے قبول فرمایا۔ کیا صرف قانون داں کی حیثیت ہے کہ وہ اللہ کی فرض کی ہوئی تین نمازوں کو معاف کر دے۔ یہ صرف قانون ساز کا عہدہ ہے۔

(۴) حارث بن اسامہ بن نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور خود حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، مصنف ابن ابی شیبہ و تاریخ بخاری و مسند ابو یعلیٰ و ابن خزیمہ اور معجم کبیر طبرانی میں مروی ہے کہ فرمایا:

من شهد له خزیمة فهو شهد عليه وحسبه.

ترجمہ: خزیمہ کسی کے موافق یا مخالف گواہی دیں ان کی تہا گواہی کافی ہے حالان کہ قرآن کریم میں ہے:

واشهدوا ذوی عدل منکم. (طلاق: پ ۲۸. ع ۱۷. آیت ۲)

ترجمہ: تم میں سے دو عادل گواہی دیں۔

مگر آنحضرت ﷺ نے حضرت خزیمہ کی تہا شہادت کو دو کے برابر فرمادیا، یہ دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ قانون ساز ہیں:

(۵) سونا اور ریشمی کپڑا مردوں کے لیے حرام ہے۔ مگر حضور ﷺ نے حضرت براء کے لیے سونے کی انگوٹھی اور حضرت سراقہ کے لیے کسریٰ کے زریں کنگن اور حضرت عبد الرحمن بن عوف و زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لیے خارش کے وقت ریشمی لباس حلال فرمایا۔

(۶) حکام کے لیے تحفے قبول کرنا جائز نہیں، مگر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے حلال فرمایا۔ (سیف فی کتاب المفتوح)

(۷) فرماتے ہیں:

قد عفوت عن الخیل والرقيق وهاتو اصدقة الورقة من كل اربعین درهما درہم۔

ترجمہ: میں نے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کر دی، روپیوں کی زکوٰۃ دو ہر چالیس درہم میں ایک درہم ہے۔

صحیحین اور مسند امام احمد اور شرح معانی الآثار میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا:

اللهم ان ابراهيم حرم مكة انى احرم ما بين لابتيها۔

ترجمہ: اے اللہ! ابراہیم نے مکہ کو حرم کر دیا اور میں (مدینہ کی) دونوں پہاڑیوں کے درمیان کو حرم بناتا ہوں۔ ”یعنی مدینہ طیبہ کو“۔

(۸) حجۃ الوداع کا موقع ہے، حرم مکہ کے احکام بیان فرما رہے ہیں، ارشاد ہوا۔ اس کا میدان نہ صاف کیا جائے یعنی گھاس نہ چھیلی جائے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کی:

الا الا ذخر فانه لقينهم و بيوتهم.

ترجمہ: سوائے اذخر کے یا رسول اللہ! اس لیے کی یہ ان کی بھٹی کے لیے ہے اور

ان کے گھروں کے لیے ہے۔

فورا بلا تاخیر اس کا استثنا فرما دیا۔

حجۃ الوداع کا موقع ہے۔ حضور سید عالم ﷺ حج کی فرضیت بیان فرما رہے ہیں کہ

اقرع بن حابس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے عرض کیا:

العامنا هذا ام للأبد.

کیا اسی سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے۔

فرمایا: اسی سال کے لیے۔ اگر میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال کے لیے واجب ہو

جائے۔

ان شواہد کو دیکھئے کیا یہ سب پکار پکار کر نہیں بتا رہے ہیں کہ آنحضرت ﷺ قانون ساز

ہیں۔ صرف قانون داں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک حدیث سے قرآن مجید کا نسخ جائز ہے۔ مرقات

میں ہے:

قد اثبت عند الحنفية ان الحديث يكون ناسخا للكتاب.

ترجمہ: حنفیہ کے نزدیک ثابت ہے کہ حدیث کتاب اللہ کی ناسخ ہو سکتی ہے۔

اور یہ حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ ارشاد فرمایا:

كلامي ينسخ بعض بعضنا كنسخ القرآن.

میرا کلام بعض بعض کو منسوخ فرمادیتا ہے جیسے قرآن کو منسوخ کرتا ہے۔

امت کا عقیدہ:

حضور سید عالم ﷺ قانون ساز ہیں۔ اس بارے میں امت کا عقیدہ عہد صحابہ سے

لے کر یہی رہا ہے کہ حضور سید عالم ﷺ قانون ساز ہیں، صرف قانون داں نہیں۔

(۱) سنن ابی داؤد ابن ماجہ و مسند امام طحاوی و معجم طبرانی و بیہقی وغیرہ میں حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

جعل رسول اللہ ﷺ للمسافر ثلاثا ولو مضى السائل عنى مما لته لجعلها خمسا.

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کے لیے موزوں پر صبح کی مدت تین دن مقرر فرمائی۔ اگر مانگنے والا مانگے جاتا تو ضرور پانچ دن کر دیتے۔

(۲) بخاری میں زید بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

وجدتها مع خزيمه الذي جعل رسول الله ﷺ شهادته وشهادتين.

ترجمہ: میں نے یہ آیت خزیمہ کے پاس پائی، جن کی شہادت رسول ﷺ نے دو گواہوں کے برابر فرمائی۔

(۳) حرم مدینہ کے سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

نهى النبي صلى الله تعالى عليه وسلم ان يعضد شجرها او ينحط او يوخذ طيرها.

ترجمہ: نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ مدینے کے درخت کاٹے جائیں یا پتے جھاڑے جائیں یا چڑیا پکڑی جائے۔

ان کے علاوہ خود یہی حضرت ابو ہریرہ، انس بن مالک، سعد بن ابی وقاص، زید بن ثابت، ابو سعید خدری، عبدالرحمن بن عوف، صعب بن جشمہ، رافع بن خدیج، خبیب بن ہدی، اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا:

حرم رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم ما بين لابتي المدينة و لابتيها شجرها ان يعضد او ينحط حرم صيدها حرم البقيع باختلاف الالفاظ بعضهم بعضا.

ترجمہ: مدینہ کے دونوں پہاڑیوں کے مابین حرم بنایا۔ اس کے درخت کاٹنا یا پتے کا جھاڑنا حرام فرمایا، اس کا شکار حرام فرمایا بقیع کو حرم بنایا۔

یہ دس صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ارشادات ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ کو حرم بنایا اس کے درخت کاٹنا پتے جھارنا، اس کی چڑیا پکڑنا حرام فرمایا۔ حرام کرنے کی اسناد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف کرنی اس کی دلیل ہے کہ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کا اختیار تھا کہ جس چیز کو چاہیں حلال فرمادیں، جسے چاہیں حرام فرمادیں۔ اسناد میں اصل حقیقی ہے جب تک کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو، جو یہاں منٹھی ہے تو ثابت ہو گیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا عقیدہ یہی تھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قانون ساز ہیں۔

۴۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

نہانا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عن خاتم الذهب.

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں سونے کی انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا

۵۔ حضرت جیش بن اویس نخعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر

ایک قصیدہ مدیہ عرض کیا، جس میں ہے:

شرعت لنا دین الحنیفة بعد ما

عبدنا کما مثال الحمیر طواغیا

ہمارے لیے دین حنیفہ کی آپ نے تشریح فرمائی اس کے بعد کہ ہم گدھوں کی طرح

بتوں کو پوجتے تھے۔

۶۔ امام قدوری فرماتے ہیں:

سن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الغسل للجمعة والعیدین

والاحرام وعرفة.

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسنون فرمایا غسل جمعہ اور عیدین اور احرام

اور عرفہ کے دن۔

سنن کی اسناد حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف کرنی اس بات کی دلیل

ہے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قانون ساز ہیں۔

۷۔ امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ میزان الشریحہ الکبریٰ میں فرماتے ہیں:
 كان الحق تعالى جعل له صلى الله تعالى عليه وسلم ان يشرع من قبل
 نفسه ما شاء .

اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ اختیار دے رکھا تھا کہ اپنی
 طرف سے جو چاہیں مشروع فرمادیں۔

۸۔ امام احمد خطیب قسطلانی مواہب میں فرماتے ہیں:

من خصائصه صلى الله تعالى عليه وسلم انه كان يخص من شاء من
 الاحكام.

سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خصائص میں سے یہ ہے کہ شریعت کے احکام
 میں جسے چاہیں جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں۔

۹۔ علامہ زرقانی نے اس کی شرح میں اضافہ فرمایا:

من الاحكام وغيرها

احکام کی تخصیص نہیں جس چیز سے چاہیں جسے چاہیں خاص فرمادیں۔

۱۰۔ علامہ اجل سیوطی قدس سرہ نے خصائص کبریٰ میں اس مضمون کا ایک باب

منعقد فرمایا:

باب اختصاصه صلى الله تعالى عليه وسلم بانه يخص من شاء بما شاء

من الاحكام.

اس کا بیان کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس منصب کے ساتھ خاص ہیں کہ جسے

چاہیں جس حکم سے چاہیں خاص فرمادیں۔

۱۱۔ علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانی شرح مواہب میں فرماتے ہیں:

قد اشتهر اطلاقه عليه صلى الله تعالى عليه وسلم لانه شرع الدين

والاحكام.

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شارع کہنا مشہور ہے اس لیے کہ حضور نے دین اور

احکام کی تشریح فرمائی۔

۱۲۔ قصیدہ بردہ شریف میں ہے:

فینما الأمر الناهی فلا احد

ابر فی قول لا منه ولا نعم

ہمارے نبی امر اور نہی ہیں۔ ”ہاں“ اور ”نہیں“ کہنے میں ان سے زیادہ کوئی سچا

نہیں۔

۱۳۔ علامہ شہاب خفاجی اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں:

معنی نبینا الأمر الخ انه لا حاکم سواہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فہو

حاکم غیر محکوم۔

نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے امر و نہی ہونے کے معنی یہ ہیں حضور حاکم ہیں،

حضور کے سوا عالم میں کوئی حاکم نہیں، وہ کسی کے محکوم نہیں۔

اور آج اس بارے میں امت کا کیا عقیدہ ہے یہ معلوم کرنا ہو تو ترجمان ملت مجدد

وقت اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا رسالہ مبارکہ منبہ اللیب اور الامن والعلیٰ کا مطالعہ

کریں۔



اسلامی فکر کی تعمیر نو

جامعہ ملیہ دہلی میں ۱۵ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ایک سیمینار منعقد ہونے والا تھا۔ اس میں اسلامی فکر کی تعمیر نو کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھا جانے والا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے وہاں سے یہ چند سوالات بھیجے تھے۔ باوجود گونا گوں مصروفیتوں کے قلم برداشتہ جو جوابات ارسال کیے گئے ہیں، وہ ہدیہ ناظرین ہیں۔ اس امید پر کہ ہو سکتا ہے یہ مضمون اسلامی مفکرین کو بہت سی غلط فہمیوں سے بچالے۔ (فقیر امجدی)

(۱) کیا اسلام فکر کی اجازت دیتا ہے؟

(۲) اگر جواب اثبات میں ہے تو کوئی مثال دیجئے کہ اسلامی تاریخ کے ارتقائی کن

مراحل پر فکر سرگرم عمل رہی۔ آزادی فکر کن حدود کی پابند رہی؟

(۳) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اسلامی فکر میں جمود آ گیا ہے؟

(۴) اگر جمود آ گیا ہے تو کب سے؟

(۵) جمود کے لیے کون سے مخصوص حالات ذمہ دار قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ ذمہ

داری فکر کی ہے یا سماجی حالات کی۔

(۶) کیا اجتہاد کے دروازے کھولے جاسکتے ہیں، یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں

ہے تو بتائیے اجتہاد کا حق کس کو دیا جائے؟ اور اس کا نفاذ کس طرح کیا جائے؟

(۷) کیا موجودہ دور میں اسلامی فکر کے احیاء کی ضرورت ہے؟

(۸) اگر جواب اثبات میں ہے تو بتائیے وہ کون سی ممتیں ہیں جن میں اسلامی فکر کی

تعمیر نو اسلامی معیشت اور انسانیت کی ترقی کے لیے معاون ہو سکتی ہے؟

(۹) اسلامی فکر کی تعمیر نو کے سلسلے میں کون سے مسائل یا مشکلات حائل ہو سکتے

ہیں۔ کیا انہیں دور کیا جاسکتا ہے؟

جوابات:

(۱) فکر مبہم لفظ ہے۔ آپ کی مراد کیا ہے، واضح کریں۔ عرف عام میں کسی الجھے ہوئے معاملہ کو سلجھانے کے لیے غور کرنے کو فکر کہتے ہیں۔ منطقی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں: جو باتیں معلوم ہوں ان کو منضبط قواعد کے تحت اس طرح ترتیب دینا کہ ان کے ذریعہ وہ بات معلوم ہو جائے جو معلوم نہیں تھی۔

لیکن سوال ۱۶ سے شبہ ہوتا ہے کہ فکر سے آپ کی مراد اجتہاد ہے۔ یہ ایک خالص شرعی لفظ ہے، اور مخصوص شرعی معنی کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی ایک شی کا حکم شرعی دوسری شی کے لیے ثابت کرنا۔ اس بنا پر کہ اس حکم شرعی کی علت دوسری شی میں بھی پائی جاتی ہے۔ بشرطیکہ شی ثانی کا حکم منقول نہ ہو۔

فکر سے آپ کی مراد کچھ بھی ہو۔ اس نمبر کا جواب اثبات میں ہے۔ اسلام نے بڑی فراخ دلی سے فکر کی اجازت ہی نہیں، حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (المعشر: بیہ ۲۸-۴۶-آیت ۲)

ترجمہ: اے بصیرت والو! غور کرو۔

فاعتبروا، اعتبار مصدر کا امر ہے۔ اعتبار کے دو معنی ہیں۔ عبرت حاصل کرنا، غور کرنا۔ الفاظ قرآنیہ کے اگر چند معانی ہوں اور وہ آپس میں مزاحم نہ ہوں تو دونوں معتبر ہیں۔ یہاں دونوں معانی مراد ہیں۔ عبرت حاصل کرو، اور غور و فکر کرو۔ ترمذی، ابوداؤد، اور دارمی کی یہ حدیث اس پر نص صریح ہے۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کے لیے قاضی مقرر فرمایا تو ان سے دریافت کیا:

معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟

عرض کیا: کتاب اللہ سے۔

فرمایا: اگر اس میں نہ ملے تو؟

عرض کیا: پھر رسول اللہ کی سنت سے۔

فرمایا: اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟

عرض کیا: غور و خوض کر کے اپنی رائے سے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

الحمد لله الذي وفق رسول الله لما يرضى به رسول الله

ترجمہ: اس اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسول کے فرستادہ کو اس بات کی توفیق

دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔

صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں دوسری حدیث حضرت عبد اللہ بن عمرو، حضرت ابو

ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یوں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

”حاکم خوب غور کر کے فیصلہ کرے، اور صحیح کرے تو اسے دونا ثواب ہے اور اگر

چوک جائے تو ایک ثواب کا مستحق ہے“

۲۔ اسلامی فکر کی ایک نہیں سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ عہد رسالت میں جو باتیں

باہمی غور و خوض سے طے ہوتیں ان سے چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم متفق ہوتے

تھے۔ اس لیے وہ بہ فحوائے: ”مَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ وحی ہے۔

اس لیے اس کو جانے دیجئے۔ عہد رسالت کے بعد کی مثال لیجئے:

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ظاہر ہے

کہ یہ مسئلہ کتنا اہم تھا۔ اسلام کی ترقی و تنزلی، بقا و فنا کا مدار یہ مسئلہ تھا۔ اس وقت پوری دنیا کا

مزاج شاہنشاہی تھا۔ مرنے والے حکمران کے بعد اس کے عصبات رشتہ دار، الاقرب فالاقرب

کی ترتیب سے جانشین ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جانشینی کے سلسلہ میں ایک

رجحان یہ بھی پیدا ہوا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی بنا پر اس کے خواہش مند بھی

ہوئے مگر کامل بحث و تمحیص، مکمل غور و خوض کے بعد جملہ صحابہ کرام نے حضرت صدیق اکبر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جانشین منتخب کیا۔ خلافت راشدہ کی تیس

سالہ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اس سے موزوں تر کوئی دوسرا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔

صدیوں سے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے قانون کے خلاف ایک نئی راہ نکالنا اسی

کاشمہ تھا کہ اسلام نے اپنے پرستاروں کو مکمل آزادی فکر کی اجازت دی ہے۔ یہ دوسری بات

ہے کہ اسلامی فکر بہر حال! قرآن و حدیث کی پابند ہے۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ اسلامی فکر کی جولانگاہ وہ ہے جہاں کتاب و سنت سے کوئی حکم منقول نہ ہو۔ جس پر دلیل قاطعہ اور گزری ہوئی حدیث معاذ ہے۔ یہ دروازہ بند نہیں ہوا۔ خلافت راشدہ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ عہد صحابہ کے بعد تابعین کا دور آیا۔ قرآن مجید گھر گھر پہنچا۔ احادیث کا سلسلہ اشاعت پورے بلاد اسلامیہ میں پھیل گیا۔ قرآن مجید میں نسخ بھی ہے، منسوخ بھی، عام بھی ہے، خاص بھی۔ مطلق بھی ہے، مقید بھی، ظاہر البیان بھی ہے، خفی البیان بھی، یہی حال احادیث کا ہے۔ علاوہ ازیں احادیث میں صحیح بھی تھیں اور سقیم بھی، بلکہ تا خدا ترسوں کی من گھڑت تراشیدہ خرافات بھی بنام احادیث عوام تو عوام کتنے خواص کی زبانوں پر جاری اور صحائف میں مسطور تھیں۔ اب تک کا مزاج یہ تھا کہ کسی معاملہ میں اتنا کہہ دینا کافی تھا: قال رسول اللہ کذا، فعل رسول اللہ کذا وغیرہ وغیرہ مگر اب اس میں دشواریاں بھی تھیں، اور خطرے بھی۔ اب اہل حل و عقد علمائے ایک نیا راستہ اپنی صواب دید سے نکالا۔

مقتدایان اسلام دو گروہ میں منقسم ہو گئے۔

ایک تو احادیث کریمہ کی حفاظت و صیانت، نشر و اشاعت، نقد و جرح میں مصروف ہو گیا، یہ محدثین کہلائے۔

دوسرا گروہ ان احکام کی تدوین و ترتیب میں مشغول ہو گیا، جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہوئے، یہ فقہاء و مجتہدین کہلائے۔

اگر اس وقت ملت کے ذمہ داروں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ یقین کر لیں کہ اسلام کا بھی وہی حال ہوتا جو یہودیت اور نصرانیت کا ہوا۔ جو کچھ ہوا علمائے اپنی صواب دید سے کیا۔ مگر ہوا کتاب و سنت کی روشنی میں، ان کی مقرر کی ہوئی حدود میں۔ اس لیے اس نکتے سے کبھی غفلت نہیں کی جاسکتی کہ اسلامی فکر کی آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قرآن و سنت سے بھی آزاد ہے۔

(۳) اسلامی فکر سے مراد، اگر اجتہاد ہے تو بلاشبہ اس میں جمود ہے۔ اور عرفی و منطقی

فکر مراد ہے تو اس میں نہ اب جمود ہے، اور نہ رہ سکتا ہے۔

(۴) اجتہاد میں کب سے جمود ہے اس کی صحیح تاریخ بتانا مشکل ہے۔ اندازہ ہے کہ تیسری صدی کے بعد کوئی مجتہد نہیں پیدا ہوا۔

(۵) اجتہاد کے بند ہونے کے اسباب نہیں صرف ایک سبب ہے۔ یعنی صرف مجتہدین کا فقدان ہے۔ اور یہ اسی وقت سمجھ میں آسکتا ہے کہ شرائط اجتہاد معلوم ہوں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

الف: کتاب اللہ کے اس حصے کا عالم ہونا جس کا تعلق احکام سے ہے، کتاب اللہ کے عالم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے الفاظ و تراکیب کے اپنے شرعی، عربی معنی بخوبی جانتا ہو۔

ب: اسی تفصیل کے ساتھ احادیث کریمہ کا بھی عالم ہو، مزید یہ کہ احادیث صحیحہ وغیرہ صحیحہ، ضعیف، حسان میں تمیز کی صلاحیت رکھتا ہو۔ نیز احادیث سے متعلق جملہ علوم پر مکمل حاوی ہو۔

ج: قیاس کے طریقے جانتا ہو نہ صرف جانتا ہو بلکہ اس کا ملکہ تامہ رکھتا ہو۔ قیاس صحیح و فاسد میں امتیاز کی پوری مہارت رکھتا ہو۔
د: مسلمان صحیح العقیدہ ہو۔

ہ: تقویٰ، خدا ترسی، دیانت میں اعلیٰ درجہ پر فائز ہو۔
و: اعلیٰ درجہ کا ذہین، طباع، نکتہ رس ہو۔
یہ کہنے کے لیے چھ شرطیں ہیں، لیکن اگر ان کی تفصیل کی جائے تو دفتر کے دفتر تیار ہو جائے۔ اندازے کے لیے ایک جھلک دیکھ لیں۔

قرآن و حدیث کے معنی لغویہ و عرفیہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ عہد رسالت میں ان الفاظ و تراکیب کے کیا معانی تھے، اس کو کا حقہ جاننے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد میں اہل حجاز خصوصاً قریش کے کلام کا پورا ذخیرہ اسی کی معلومات کے احاطے میں ہو، اور آج یہ ممکن نہیں۔ آج قریش اور اہل حجاز کے کلام کا جو سرمایہ موجود ہے، وہ چند اشعار اور گنتی کے مقولوں کے سوا کچھ نہیں۔ یہ شرط ضروری ہے یا نہیں اس کا اندازہ اس واقعے سے کیجیے۔

قرآن کریم میں ایک جگہ ”لن یحور“ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آج ہی کے نہیں اپنے دور کے بھی سید المفسرین ہیں۔ فرماتے ہیں: میں اس کا معنی نہیں جانتا تھا۔ ایک دفعہ ایک بدویہ کو سنا اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی: حور یعنی لوٹ، تو میں نے جانا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔

حضرت ابن عباس حجازی قریشی ہیں۔ علم و فضل، ذہانت و ذکاوت میں اپنے اقران ہی نہیں، بہت سے اسلاف پر بھی فائق ہیں۔ مگر وہ قرآن کریم کے معنی جانتے نہیں۔ ان لوگوں کے دست نگر ہیں جن کی لغت میں قرآن اترا ہے۔ تو آج کے ماوشما، زید و عمرو کیسے مستغنی ہو سکتے ہیں۔

معانی لغویہ جاننے کے بعد کیا کیا دشواریاں ہیں، ان کا بھی ایک منظر ملاحظہ کریں: قرآن مجید نے طلاق کی عدت تین قروء بتائی ہے، ارشاد ہے:

وَالْمُطَلَّاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ. (بقرہ: پ ۲. ع ۱۲. آیت ۲۲۸)
ترجمہ: طلاق والیاں اپنے کو تین قروء رو کے رکھیں۔

قروء قرء کی جمع ہے۔ قرء کے دو متضاد معانی ہیں۔ حیض اور طہر۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہاں طہر مراد ہے۔ اور امام اعظم فرماتے ہیں: حیض مراد ہے۔ دونوں اپنی اپنی تاویل پر جو قرآن پیش کرتے ہیں وہ اتنے ٹھوس اور مضبوط ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، اتنی نکتہ رسی اس زمانے میں محال عقلی نہیں تو محال عادی کے قریب ضرور ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. (بقرہ: پ ۳. ع ۶. آیت ۲۷۵)
ترجمہ: اللہ نے بیع حلال فرمائی اور سود حرام۔

ربوا کا ترجمہ سود ہے، اس کے لغوی معنی نفع کے ہیں، اور یہ قطعاً مراد نہیں ورنہ بیع بھی حرام ہوتی۔ لامحالہ! متعین ہے کہ ربوا کا شرعی معنی مراد ہے۔ شرعی معانی کیا ہیں؟ یہ وہ اہم سوال ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور ربوا کے ابواب کو شافی طور سے بیان

نہیں فرمایا۔

سود کے معنی کے تعین میں مجتہدین کو کتنی کدو کاوش کرنی پڑی ہے، وہ وہی جان سکتا ہے جو شروح حدیث، اصول فقہ، فقہ کی کتابوں میں اس باب کا مطالعہ کرے۔ سود کے بارے میں وارد تمام احادیث کا استقصا، ان سب کو سامنے رکھ کر اس جامع علت کا معلوم کر لینا جو سود کی حرمت کا مدار ہے، جس کی رو سے، سود سے دیگر بیوع سے ممتاز ہوتا ہے۔ پھر اس سے متعلق جزئیات کی تفصیل، یہ وہ ہفت خواں ہے کہ اگر مجتہدین نے ان سب کو طے نہ کرایا ہوتا تو آج سود اور بیع میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ قوت فیصلہ جواب دے جاتی۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بعض الفاظ قرآنیہ کے بارے میں طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس سے مراد لغوی معنی ہیں یا شرعی۔ جیسے یہ آیات کریمہ ہے:

انما حرم علیکم الميتة والدم ولحم الخنزیر و ما اهل به لغير الله
فمن اضطر غیر باغ و لاعاد فلاثم علیہ. (بقرہ: پ ۲. ۵ع. آیت ۱۷۳)

ترجمہ: یہی چیزیں تم پر اللہ نے حرام کی ہیں۔ مردار، خون، سور کا گوشت، اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو جو لاچار ہو اور بغیر خواہش کے ضرورت سے زیادہ نہ کھائے، اس پر کوئی گناہ نہیں۔

یہاں باغی کے بارے میں سخت معرکہ ہے کہ اس کے لغوی معنی مراد ہیں یا شرعی۔ باغی کے لغوی معنی خواہش کرنے والے کے ہیں۔ باغی کے شرعی معنی امام و سلطان عادل کی طاعت سے باہر ہونے والا۔ شواہح کہتے ہیں کہ باغی سے یہاں اس کا شرعی معنی مراد ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ اس کا لغوی معنی مراد ہے۔ ہر ایک کے الگ الگ دلائل ہیں۔ ان دلائل تک از خود آج کے بڑے سے بڑے عالم کی رسائی نہیں ہو سکتی ہے، کم از کم یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

اس کے قریب قریب ”عادی“ بھی معرکہ ہے۔ اگر مجتہدین نے ان گتھیوں کو سلجھانہ لیا ہوتا تو آج کیا ہوتا، نہیں کہا جاسکتا۔

پھر آج دیانت کا معاملہ بہت اہم ہے۔ جب کہ بندگان غرض نے لاکھوں حدیثیں

گڑھ لیں۔ علما کی کتابوں میں الحاقات کر دیے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم میں تبدیل و ترمیم کرنے سے نہیں چو کے تو قرآن و احادیث کے معانی بیان کرنے میں کیا کیا گل کھلاتے وہ ظاہر ہے۔ پھر بھی جو گل کھلائے جارہے ہیں وہ کم عبرت آموز نہیں۔

ابھی جو میں نے آیت کریمہ لکھی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ سور کا گوشت حرام ہے۔ ایک صاحب نے تحقیق کی کہ سور کی چربی حلال ہے۔ صرف گوشت حرام ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں۔ ایک صاحب نے فتویٰ دیا کہ دادی اور ثانی سے نکاح حلال ہے۔

ابھی چند دن کی بات ہے کہ ایک بزرگ جنہیں لوگ نعمان زماں، جنید عصر کہتے تھے۔ ان کی یہ کرامت مع دستاویز موجود ہے۔ ایک حدیث لوگوں کی زبان پر تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بخدا! میں نہیں جانتا، اس دیوار کے پیچھے کیا ہے۔

اس کے بارے میں حضرت محقق عبدالحق محدث دہلوی قدق سرہ نے مدارج النبوة جلد اول میں فرمایا ہے۔

اسی سخن اصلے ندارد و روایت ہذا صحیح نہ شدہ است۔

ترجمہ: اس کی کوئی اصل نہیں، یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

ان بزرگ نے اپنے عقیدے کے اثبات میں لکھ دیا:

شیخ عبدالحق روایت کرتے ہیں کہ مجھے دیوار کے پیچھے کا علم نہیں۔

انہیں بزرگ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک سوال کے جواب میں زید کو کافر لکھ دیا ہے،

مگر جب پتہ چلا کہ یہ زید ان کے بزرگ ہیں تو گول ہو گئے۔

ابھی چند دن کی بات ہے کہ ایک بہت مشہور درس گاہ کے مفتی نے زید پر اس کی ایک

عبارت سے متعلق بہت بھیانک فتویٰ دیا۔ یہ زید کفری عبارت لکھنے والا اس درس گاہ کا افسر

اعلیٰ تھا۔ جب بات ظاہر ہوئی اور افسر اعلیٰ نے مفتی صاحب سے مواخذہ کیا تو فتویٰ تو بدل ہی

گیا، معذرت بھی کرنی پڑی کہ میں نہیں جانتا تھا، یہ عبارت آپ کی ہے۔ اور آپ ہی وہ زید

ہیں۔ جب ان لوگوں کی دیانت کا یہ حال ہے جو اس دور میں مذاہب کے ٹھیکے دار جانے جاتے ہیں تو اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اس زمانہ میں کوئی شخص ان تمام علوم کا جامع بھی پیدا ہو جائے جو اجتہاد کے لیے لازم ہیں، تو کیا مذکورہ صورت حال میں اس کی دیانت پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ کسی کو حیرت ہو تو ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ جس عالم میں جتنی ہی زیادہ دین داری، خدا ترسی ہوگی وہ اتنا ہی تقلید میں راسخ ہوگا اور اجتہاد سے بچے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ مگر اجتہاد کے لیے جن شرائط کی ضرورت ہے وہ صدیوں سے کسی شخص میں پائی نہیں گئیں۔ اور نہ اس دور میں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے صدیوں سے مجتہد کوئی نہیں ہوا اور نہ آج ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ بالفرض اگر کوئی ہستی شرائط اجتہاد کی جامع پیدا ہو جائے تو کیا اسے بھی اجتہاد کی اجازت نہ ہوگی۔

جواب ظاہر ہے کہ یہی ہوگا کہ اسے اجتہاد کی اجازت ہے۔ یہی نہیں اسے تقلید جائز نہ ہوگی۔ مگر کام فرض سے نہیں چلتا، وقوع سے چلتا ہے اور وقوع کا مسئلہ لائیکل ہے اگر کوئی ادعا کرے یا کسی کے بارے میں دوسرا کوئی دعویٰ کرے تو اس وقت انگلی پکڑ کے بتا دیا جائے گا کہ دیکھئے ان میں یہ کمی ہے، یہ کمی ہے۔

آج کل کچھ لوگوں کو اس کا خبط ہوا ہے کہ میں مجتہد ہوں یا ہمارا فلاں بزرگ مجتہد ہے لیکن جب ان لوگوں کے اجتہادی مسائل سامنے آئے تو پتا چلا ہے کہ اجتہاد کی منزل تو بہت دور ہے، یہ لوگ مترجم ہونے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔
لطیفے کے طور پر ایک اجتہاد کا نظارہ کر لیں۔

ان مجتہدین نے دعویٰ کیا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ اگر پانی میں نجاست گر جائے تو جب تک نجاست سے پانی کارنگ یا مزہ یا بونہ بدلے پانی پاک ہے۔ اب ایک متفق علیہ مسئلہ ہے جو ان مجتہدین زمانہ کو بھی تسلیم ہے۔ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے۔ تو برتن ناپاک ہے۔ فرض کیجئے، ایک برتن میں پانی ہے اس میں کتے نے منہ ڈال دیا ہے، منہ ڈالتے ہی کسی کی دھکار پر کتا بھاگ گیا۔ تجربہ کر لیں، اس برتن کے پانی کا نہ رنگ بدلے گا نہ مزہ

بدلے گا نہ ہو۔ مذکورہ بالا اجتہاد کی رو سے پانی پاک رہا، مگر برتن ناپاک۔ اس قسم کے بے شمار لطائف ان مجتہدین کے ہیں۔ کون سا مسلمان یہ پسند کرے گا کہ اجتہاد کی آزادی دے کر اسلامی احکام کو لطائف و ظرائف کا ایسا میگزین بنا دیا جائے کہ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کے جانشینوں کو اپنی طرز نگارش کے لیے احکام ہی بہترین مواد ہوں، وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر صدیوں سے پوری امت کا اس پر اجماع ہے کہ اب اجتہاد کی کسی کو اجازت نہیں۔ سب پر، ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید لازم ہے۔

(۶) نہیں۔

(۷) اجتہاد کے سوا عرفی، منطقی فکر کے احیا کی ضرورت شدید ہی نہیں اشد ہے۔

(۸) مندرجہ ذیل امور ہماری فکرنو کی حدود سے باہر ہیں۔

الف: جو باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں۔

ب: جو باتیں احادیث سے ثابت ہیں۔

ج: جو باتیں اجماع امت سے ثابت ہیں۔

د: جو باتیں ائمہ اربعہ امام اعظم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل یا ان کے

جانشینوں کے ارشادات سے ثابت ہیں۔

ان کو چھوڑ کر ہزاروں مسائل ہیں جن پر غور کرنا ہے، جنہیں حل کرنا ہے۔ سیاسیات،

اقتصادیات، معاشیات وغیرہ متعدد درہیں ہیں، جو ہماری فکرنو کی منتظر ہیں۔

(۹) بہت لمبی داستان ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس راہ میں آپس میں اختلاف، اپنی خود

غرضی، کچھ سستی، کچھ کاہلی، کچھ نااہلی، کچھ اسباب کی عدم فراہمی، کچھ اختیار کا دباؤ وہ اسباب

ہیں جو رکاوٹ ہیں۔ اگر ہمت کر کے آگے بڑھا جائے تو ضرور کچھ دشوار گزار مرحلے درپیش

ہوں گے۔ لیکن ان کا دور کرنا محال نہیں ہوگا۔ اگرچہ سخت مشکل، مگر۔ ع:

مشکلے نیست کی آساں نہ شود

☆☆☆

تقلید شخصی کی شرعی حیثیت

تقلید کا مادہ قلاادہ ہے۔ قلاادہ کے معنی پٹے کے ہیں۔ باب تفعیل میں جا کر اس کے معنی گلے میں پٹہ ڈالنے کے ہو گئے۔ اصطلاح شرع میں تقلید کے معنی علما نے یہ لکھے:

تسلیم قول الغير بلا دلیل .

ترجمہ: دوسرے کی بات بلا دلیل مان لینا۔

اسی کو علامہ سمہ دی نے عقد الفرید میں یوں بیان فرمایا:

التقلید قبول القول بان يعتقد من غير معرفة دليل .

ترجمہ: کسی کی بات دلیل جانے بغیر اس طرح مان لینا کہ اس پر اعتقاد جم جائے۔

اگر دلیل کے ذریعہ کسی بات کے حق ہونے کا اعتقاد ہو تو یہ تقلید نہیں بلا دلیل محض

قائل کے ساتھ حسن ظن کی بنا پر اس کی کہی ہوئی بات پر اعتقاد جم جائے کہ چوں کہ یہ شخص اعلیٰ

درجے کا دین دار، صادق، امین اور علوم و فنون کا ماہر فائق ہے۔ اس لیے جو بات کہتا ہے وہ

حق ہے، یہی تقلید ہے۔

معمولات شرعیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم روزمرہ کے حالات اور اپنی طرز

زندگی پر نظر کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں تقلید کے بندھنوں

میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس میں عوام و خواص شہری، دیہاتی ہر طبقہ کے لوگ مساوی حصہ

دار ہیں۔

آپ غور کریں۔ ایک بچہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے ماں باپ، اپنے مربی کی تقلید کے

سہارے پروان چڑھتا ہے۔ ایک بیمار اپنے معالج کی تقلید ہی کر کے شفا یاب ہوتا ہے۔ ایک

مستغیث کسی قانون داں وکیل کی تقلید کر کے ہی اپنا حق پاتا ہے۔ راستے سے نابلد ایک راہ رو

کسی راستہ بتانے والے کی تقلید کر کے ہی منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ ایک ناخواندہ اپنے معلم

کی تقلید ہی سے صاحب علم و فضل بنتا ہے۔ صنعت و حرفت سے عاری کسی ماہر فن استاذ کی تقلید کر کے ہی صنعت کار ہوتا ہے۔ یہ وہ روزہ مرہ کی باتیں ہیں کہ ان سے نہ تو انکار کی کوئی گنجائش ہے اور نہ بحث و تمحیص کی۔ ایک بنگالی کا بچہ اپنے ماں باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ مچھلی بھات کھاتے ہیں تو وہ کوئی دلیل طلب کیے بغیر خود بھی مچھلی بھات کھانے لگتا ہے۔ دھوتی باندھنے لگتا ہے، بنگالی بولی سنتا ہے، تو خود بھی بنگالی بولنے لگتا ہے۔ یوں ہی پنجابی کا بچہ اپنے والدین کی عادت و خصلت دیکھ کر روٹی گوشت کھانے لگتا ہے۔ شلوار قمیص پہننے لگتا ہے۔ گپڑی باندھنے لگتا ہے۔ پنجابی بولنے لگتا ہے۔ یہی تقلید ہے۔

مکتب میں ایک بچہ گیا، معلم نے بچے کو ایک حرف پر انگلی رکھ کر بتایا کہ یہ ”الف“ ہے، بچے نے بلا دلیل مان لیا کہ یہ الف ہے۔ دوسرے حرف پر انگلی رکھ کر معلم نے بچے سے کہا: ”با“ بچے نے بلا بحث و تمحیص اسے مان لیا کہ یہ ”با“ ہے۔ کبھی کسی بچہ نے اپنے استاذ سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ کیوں پہلے والے حرف کو ”الف“ کہتے ہیں اور دوسرے کو ”با“۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر بچہ اس وقت کیوں اور کیوں کر کے چکر میں پھنسا تو اصل تعلیم سے بھی محروم رہ جائے گا۔

ایک مستغیث وکیل کے یہاں جاتا ہے، اپنا مدعا بیان کرتا ہے، وکیل اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ تعزیرات ہند کی فلاں دفعہ کے ماتحت دعویٰ کرے۔ مستغیث بلا چوں و چرا وہی کرتا ہے، اسی کا نام تقلید ہے۔

ایک مریض، معالج کے یہاں گیا، اس نے مرض کی تحقیق کر کے اس کے لیے ایک نسخہ لکھا۔ دنیا کا کوئی مریض، حکیم ڈاکٹر سے یہ بحث نہیں کرتا کہ میری بیماری کا نسخہ یہی کیوں ہے۔ یہ دوائیں کس طرح میرا مرض دور کریں گی، جو مریض اس بحث میں پڑا وہ اچھا ہو چکا؟ آپ ایک مسافت طے کر رہے ہیں۔ ایک چوراہے پر پہنچ کر حیرت زدہ ہو کر کھڑے ہو گئے کہ اب دائیں جائیں کہ بائیں یا سیدھے، آگے چلے چلیں۔ اچانک کوئی مقامی آدمی آگیا۔ آپ اس سے سوال کرتے ہیں کہ فلاں جگہ کون سا راستہ جائے گا؟ وہ جدھر بتاتا ہے، آپ اس کی کورانہ تقلید کرتے ہوئے بلا دلیل اسی راستے پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔

اب آپ حضرات غور کریں! اگر ہم تقلید کو اپنے تمدن سے نکال دیں، تو ہماری معیشت کی گاڑی ایک انج آگے نہیں چل سکے گی۔ ہم اپنی زندگی کے گوشہ گوشہ میں تقلید کے محتاج ہیں۔ اور یہ احتیاج قوم کے ہر فرد کو عام ہے۔ جس طرح ایک جاہل بیماری میں ڈاکٹر کا، قانونی ضرورت میں وکیل کا، راستہ معلوم نہ ہونے کی صورت میں رہنما کی تقلید کا محتاج ہے، اسی طرح ایک عالم بھی اور جس طرح ایک دیہاتی خورد و نوش، بول چال، تعلیم و تربیت میں اپنے ماں باپ، استاذ کا مقلد ہے، اسی طرح ایک شہری بھی۔

اب اگر تقلید کو ہم اپنے تمدن سے نکال دیں تو ہماری زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ غور کریں! اگر بیمار، معالج کے نسخہ کو استعمال کرنے سے پہلے نسخہ کے رموز سمجھنے کے لیے بحث شروع کر دے۔ شرح اسباب و علامات قرابادین و معالجات نفیسی کے اسباق پڑھنے لگے تو وہ اچھا تو کیا ہوگا، البتہ جلد ہی دوسرے عالم کا سفر کر دے گا۔ یوں ہی ایک مستغیث وکیل سے قانون کی لم سمجھے بغیر دعویٰ نہ کرے تو اس کا حق مل چکا۔ جب تک وہ ایل ایل بی کے نصاب پڑھنے کے لائق ہوگا۔ دعویٰ کی میعاد بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے ہر متمدن انسان کا اس پر اجماع ہے کہ جس فن کا انسان ماہر نہ ہو۔ اس میں کسی ماہر فن کی تقلید کرے۔ اسی لیے ہر فرد بشر کسی نہ کسی دوسرے فرد بشر کی کسی نہ کسی معاملہ میں تقلید کرتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ تقلید ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے اور بغیر تقلید کے زندگی بسر کرنا ناممکن ہے، جس طرح ہم اپنی زندگی کے معمولات میں تقلید سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح دینی معاملات میں بھی تقلید سے مفر نہیں۔ اس لیے امت کا اس پر اجماع ہے کہ تقلید فرض ہے۔ اس کی فرضیت اور وجوب ایسا قطعی ہے کہ منکرین تقلید کے پیشوائے اعظم، میاں نذیر حسین صاحب کو بھی معیار میں یہ لکھنا پڑا۔

سو جو کوئی اہل ایسے ذکر کا ہوگا عموماً خواہ کوئی ہو اس کا اتباع وقت لائے علمی واجب ہوگا۔ اس لیے کسی بھی دیندار یا مدعی دین داری کی یہ ہمت نہیں کہ وہ تقلید کی فرضیت سے انکار کر سکے معاملہ یہ ہے کہ اگر تقلید کو فرض قرار نہ دیں تو پھر دین پر عمل محذور اور شدید محذور ہو جائے گا۔

اس کا بیان یہ ہے کہ ہم کو اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے۔ اور اتباع و اطاعت موقوف ہے۔ قرآن و احادیث کے حصول پر نہ صرف حصول بلکہ یہ بھی جاننے پر کہ ان میں کون ناسخ ہے، کون منسوخ ہے۔ کون خاص ہے، کون عام ہے۔ کون ظاہر کون خفی، کون نص ہے، کون مشکل، کون مفسر ہے، کون مجمل، کون محکم ہے، کون متشابہ وغیرہ وغیرہ سیکڑوں باتیں ایسی ہیں کہ جب تک انسان ان سب پر کامل عبور حاصل کر کے قرآن و حدیث سے مسائل کے استنباط و استخراج پر کامل دست گاہ نہ رکھے۔ قرآن و حدیث پر عمل ناممکن ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

سورۃ بقرہ کے تیسویں رکوع میں ہے:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ

وَ عَشْرًا (سورۃ بقرہ ب ۲- رکوع ۱۴- آیت ۲۳۴)

ترجمہ: اور تم میں جو مریں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو یہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رہیں۔

اس کے بعد اسی سورہ کے اکتیسویں رکوع میں ہے:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لَأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى

الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ (سورۃ بقرہ ب ۲- رکوع ۱۵- آیت ۲۴۰)

ترجمہ: اور تم میں جو مریں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو ان کے لئے وصیت کر جائیں

کہ ان کو سال بھر کا نان و نفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالا جائے۔

ایک ہی سورۃ ایک ہی پارہ میں ایک ہی مسئلہ کے بارے میں دو مختلف احکام ایسے

مذکور ہیں کہ ان دونوں کو پڑھ کر آدمی چکرا جائے کہ وہ عمل کس پر کرے۔ پہلی آیت سے معلوم

ہوتا ہے کہ بیوہ کی عدت چار مہینے دس دن ہے، اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ کی

عدت ایک سال ہے۔ عربی زبان کا ماہر سے ماہر پروفیسر، عربی زبان پر کتنا ہی عبور رکھتا ہو۔

کس آیت پر عمل کرنا چاہیے، بتا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور آگے بڑھیے، ان دونوں آیتوں سے

ثابت ہوتا ہے کہ بیوہ خواہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ اس کی عدت چار مہینے دس دن، یا ایک سال

ہے۔ مگر سورہ طلاق میں حاملہ عورتوں کی عدت کے بارے میں فرمایا گیا:

وَأُولَاتِ الْأَحْمَالِ إِجْلَهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۝ (سورہ طلاق پ ۲۸، رکوع ۱۷۷)

اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل جن لیں۔۔۔

ایک نقطہ پر آ کر سورہ بقرہ اور سورہ طلاق کی آیتوں میں شدید تعارض ہے۔ ایک شخص مرا، اس کی بیوی حاملہ ہے، تو اس کی عدت کیا ہوگی۔ چار مہینے دس دن یا ایک سال یا وضع حمل۔ اور سنتے چلیے، اسی سورہ بقرہ کے بائیسویں رکوع میں ہے:

كَسِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةَ لِلْوَالِدَيْنِ

وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (سورہ بقرہ پ ۲، رکوع ۶۷، آیت ۱۸)

ترجمہ: تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے، اگر وہ کچھ مال چھوڑے تو وہ ماں باپ اور قریب کے رشتہ داروں کے لیے وصیت کرے، پرہیزگاروں پر واجب ہے۔

لفظ اقربین عام ہے، اولاد بھائی، بہن، دادا دادی وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ شریعت نے کسی کا کوئی حصہ مقرر نہیں فرمایا ہے۔ یہ مورث کے صواب دید پر ہے، جس کے لیے جتنا چاہے وصیت کر جائے، اس کی وصیت کے مطابق رشتہ داروں حتیٰ کہ ماں باپ کو بھی حصہ ملے گا، مگر سورہ نساء کا دوسرا رکوع تلاوت کریں۔

اس میں ماں، باپ، میاں، بیوی، بیٹی، بیٹا، پوتی، پوتا وغیرہ کے شرعی سہام کی تعیین تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ عربی زبان کا کوئی کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، محض زبان دانی سے وہ اس گنتی کو ہرگز ہرگز نہیں سلجھا سکتا۔

یہ چند مثالیں میں نے قرآن مجید سے تقریب فہم کے لیے پیش کر دی ہیں۔ اگر استقصا کیا جائے تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ احادیث میں اس قسم کے اشکالات کی کوئی گنتی نہیں۔ اب اگر تہذیب کو درمیان سے نکال دیا جائے تو فرض عین کہ ہر مسلمان ان تمام تفصیلات کو جانے جن سے اس قسم کے اشکالات حل ہو سکیں۔ اب اگر ہر مسلمان کو ان تمام تفصیلات کے جاننے کا مکلف کیا جائے تو۔

اولاً: یہ ممکن نہیں کہ ہر شخص ان تمام علوم کو حاصل کر سکے جو مجتہدین کے لیے ضروری
ولازم ہیں۔

ثانیاً: اگر بالفرض یہ تمام علوم حاصل بھی ہو جائیں تو تفقہ فی الدین جو خالص خدا
داد اور وہی صلاحیت ہے، سب کو بلکہ اکثر کو کہاں نصیب؟

حضرت امام بخاری جیسے امام فن و ناہر حدیث نے اسی وہی فضل خداوندی، تفقہ فی
الدین کی کمی کی وجہ سے ایسے عجیب و غریب فتوے دیئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً مشہور ہے کہ
امام بخاری نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی کسی بکری کا دودھ مدت رضاعت میں
پی لیں تو حرمت رضاعت ثابت ہو جائے گی۔

بخاری کو اٹھا کر دیکھئے! آپ انگشت بندھاں رہ جائیں گے۔ ایک جگہ ہے کہ پانی
میں نجاست پڑنے سے اس وقت تک ناپاک نہیں ہوگا جب تک پانی کے تین اوصاف میں
سے ایک وصف رنگ یا بو یا مزہ نہ بدل جائے۔

دوسری جگہ ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو برتن ناپاک ہے۔ ایسا کہ
اسے سات مرتبہ دھوؤ۔

اب آپ غور کریں! ایک برتن میں پانی ہے، اس میں کتے نے منہ ڈال دیا۔ پانی کا
نہ رنگ بدلا، نہ بو، نہ مزہ۔ تو لازم کہ پانی پاک رہے اور برتن بہر حال ناپاک۔

امام بخاری کے حفظ و اتقان، تقویٰ پرہیزگاری روایت حدیث میں احتیاط کے کمال
سے انکار نہیں، مگر تفقہ فی الدین ایک الگ نعمت ہے، جو ہر حافظ کو نہیں ملتی۔ اسی لیے تو ایک
جلیل القدر محدث نے فرمایا: الا حادیث مضلة الا للفقهاء۔

اور حضرت امام اعظم قدس سرہ نے بڑی صفائی اور دیانت داری کے ساتھ حضرت امام
اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تفقہ فی الدین کا اعتراف کرتے ہوئے خود حضرت امام صاحب سے
فرمایا: "نحن الصبادلة وانتم الاطباء" ہم دوا فروش ہیں اور تم لوگ طبیب ہو۔

ثالثاً: چلیے تفقہ فی الدین بھی حاصل ہو گیا، اور وہ تمام علوم و فنون جو لوازم اجتہاد
ہیں، حاصل ہو جائیں تو دین داری اور للہیت کا آج کتنا فقدان ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ حال

یہ ہے کہ بہت سے حنیفہ دوراں اور نعتمان زماں بننے والے جوشِ عداوت و فورِ محبت و افراطِ عقیدت کی بنیاد پر اپنے نوکِ قلم سے کیا کیا گل کھلائے، اس کی تھوڑی سی سیر کرتے چلیں۔

(۱) سارے دیوبندیوں اور غیر مقلدین نے اسماعیل کی ”ایضاح الحق“ کی ایک عبارت پر اسے کافر گمراہ ہونے کا فتویٰ دیا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے طائفہ کے امام کی عبارت ہے تو سب کو سانپ سونگھ گیا۔

(۲) ابھی چند دن کی بات ہے کہ مفتی دیوبندی مولوی مہدی حسن نے جناب قاری طیب صاحب کی ایک عبارت پر فتویٰ دیا کہ اس میں الحاد ہے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ تو ہمارے آقا کی عبارت ہے تو فتویٰ بدل گیا۔

(۳) قاسم نانوتوی صاحب کے اسی شعر:

جو چھو بھی دے سگ کو چہ ترا جو اس کی نعش
یقین ہے خلد میں ابلیس کا بنا میں مزار

پر پوری برادری نے وہ وہ فتوے دیئے کہ مزہ آ گیا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہ ہمارے پیرمغاں کا شعر ہے تو تاویل کے نام پر شاہنامہ کے ہفت خواں کا باب کھول دیا گیا۔

(۴) گنگوہی کو بکرے کے نصیبے بہت پسند تھے اور ان کو بہت مفید بھی ہوئے۔ اس لیے فتویٰ دے رکھا تھا کہ یہ حلال ہیں۔ یہ فتویٰ ان کے مجموعہ فتاویٰ کے پہلے ایڈیشن میں موجود بھی ہے، مگر جب پوری دنیا نے تھو تھو کیا، دوسرے ایڈیشنوں سے ایسا غائب کیا کہ فتاویٰ رشید یہ ہی کو خفی کر دیا۔

ایسی صورت میں امت کے عام افراد کو تقلید کیے بغیر چارہ نہیں اس لیے کہ اگر تقلید کو بدعتِ سیئہ و حرام قرار دے دیا جائے تو پھر قرآن و حدیث پر عمل کرنا سوائے معدودے چند حضرات کے امت کے اکثر افراد کو محال ہو جائے پھر لازم یہ کہ پوری امت کو قرآن و حدیث پر عمل کرنا وسعت سے زیادہ تکلیف دینا ہوا جو نص قرآنی ”لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا“ کے صریح منافی ہے۔ لاجرم امت کے دو گروہ ہوئے۔ ایک مجتہدین، دوسرے غیر مجتہدین۔ غیر مجتہدین کو حکم دیا گیا کہ وہ دینی معاملات میں مجتہدین کی طرف رجوع کریں اور

ان کا اتباع کریں۔

ارشاد ہے:

فَاسْتَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (سورہ انبیاء: آیت ۷)

اہل علم سے پوچھو جب تمہیں علم نہیں۔

اس آیت کے مخاطب غیر اہل علم ہیں، اور اہل ذکر سے مراد اہل علم اور سوال سے مقصود اہل علم کے ارشاد پر اتباع کا لازم ہونا ہے۔ اس قدر پر کسی کو اختلاف نہیں بلکہ اب تو ”بعد اللتیا واللتی“ یہ بھی طے ہو گیا کہ اہل ذکر سے خاص مجتہدین مراد ہیں۔

پس جب کہ یہ نص قرآنی سے ثابت ہے کہ غیر اہل ذکر پر اہل ذکر کا اتباع واجب ہے اور فریقین اس پر متفق ہیں کہ اہل ذکر سے مجتہدین مراد ہیں تو ثابت ہو گیا کہ غیر مجتہد پر مجتہد کی اتباع واجب ہے۔ یہی تقلید ہے۔

اس لیے کہ اگر مجتہد کی اتباع وضوح دلیل کے بعد ہوگی تو یہ مجتہد کی اتباع نہ ہوئی بلکہ اپنی تحقیق پر عمل ہوا۔ اس لیے مجتہد کی اتباع تقلید میں منحصر ہے۔ اس قدر پر اتفاق کے بعد وہ اصل اختلاف جس نے کروڑوں گھروں میں آگ لگا رکھی ہے، جس پر تمام امت کے ناجی یا ناری ہونے کا فیصلہ موقوف ہے وہ تقلید شخصی ہے۔

امت کا اس پر اجماع ہے کہ اب ہر شخص کو خواہ عالم ہو خواہ غیر عالم واجب ہے کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی جملہ امور فقہیہ میں تقلید کرے۔

صرف چند معدودے نفر جن کے دامن انبیائے کرام و اولیائے عظام کی اہانت سے بھی داغ دار ہیں، جس کی بنا پر وہ امت اجابت سے یقیناً خارج ہیں، تقلید شخصی کو حرام بدعت بلکہ شرک، حتیٰ کہ ”ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله“ کا مصداق ٹھہراتے ہیں۔

علامہ سید احمد طحطاوی حاشیہ در مختار میں فرماتے ہیں:

فعلیکم یا معشر المؤمنین بالباع الفرقة الناجية المسماة باهل السنة والجماعة فان نصرة الله تعالى وحفظه وتوفيقه في موافقتهم وخذلانه وسخطه ومقتته في مخالفتهم وهذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم في المذاهب الاربعة

هم الحنفیون والمالکیون والشافعیون والحنبلیون ومن كان خارجا من هذه المذاهب الاربعة فهو من اهل البدعة والنار (طمطاوی علی المد: کتاب الذبائح) ترجمہ: اے مومنو! تم پر فرقہ ناجیہ اہل سنت وجماعت کی اتباع لازم ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور حفظ و توفیق ان کی موافقت میں ہے، اور اس کی ناراضگی اور عذاب ان کی مخالفت میں ہے، اور فرقہ ناجیہ نے آج اس پر اجماع کر لیا ہے کہ وہ صرف مذاہب اربعہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی ہیں، اور جو ان چاروں سے خارج ہوگا، وہ بدعتی جہنمی ہے۔

مکرین تقلید کے امام الائمہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی عقد الجید میں لکھتے ہیں:

اعلم ان فی الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة وفي

الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة ونحن نبين ذلك بوجوه :

احدها ان الامة قد اجتمعت على ان يعتمدوا على السلف في

معرفة الشريعة فالتابعون اعتمدوا في ذلك على الصحابة وتبع التابعين

اعتمدوا على التابعين وهكذا في كل طبقة اعتمد العلماء على من قبلهم

والعقل يدل على حسن ذلك لان الشريعة لا يعرف الا بالنقل

والاستنباط والنقل لا يستقيم الا بان ياخذ كل طبقة عن قبلها بالاتصال

ولا بد في الاستنباط من ان يعرف مذاهب المتقدمين لئلا يخرج من

اقوالهم فيخرق الاجماع ويبنى عليها ويستعين في ذلك بمن سبق لان

جميع الصناعات كالصرف والطب والشعر والحدادة والتجارة

والصياغة لم يتيسر لاحد الا بملازمة اهلها وغير ذلك نادر بعيد لم يقع

وان كان جائزا في العقل واذا تعين الاعتماد على اقاويل السلف فلا بد

من ان يكون اقوالهم التي يعتمد عليها مروية بالاسناد الصحيح او مدونة

في كتب مشهورة وان يكون مخدومة يتبين الراجع من المرجوح من

محتملاتها وتخصيص عمومها في بعض المواضع ويجمع المختلف منها

وتبين علل احكامها والا لم يصح الاعتماد عليها وليس مذهب في هذه

الازمنة المتأخرة بهذه الصفة الا هذه المذاهب الاربعة.

ترجمہ: مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں عظیم مصلحت ہے اور ان سے اعراض کرنے میں بھاری فساد ہے ہم ان کو چند طریقے سے بیان کرتے ہیں:

اول: یہ کہ امت نے اجماع کر لیا ہے کہ شریعت کی معرفت میں سلف پر اعتماد کیا جائے، تابعین نے اس معاملہ میں صحابہ پر اعتماد کیا، اور تبع تابعین نے تابعین پر اسی طرح ہر طبقہ میں علما نے اپنے پہلے والوں پر اعتماد کیا، اس کی اچھائی پر عقل دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ شریعت نقل اور استنباط کے بغیر نہیں پہچانی جاسکتی، اور نقل نہیں درست ہوگی مگر اسی طرح کہ ہر طبقہ اپنے پہلے والے سے متصلاً حاصل کرے اور استنباط کے لیے یہ ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب کو جانا جائے تاکہ ان اقوال سے باہر نہ جائیں کہ خرق اجماع ہو جائے اور تاکہ انہیں اقوال کو بنیاد بنایا جائے اور اگلوں سے اس میں مدد لی جائے اس لیے کہ تمام صنعتیں مثلاً سناری اور طب اور شعر اور لوہاری اور تجارت اور رنگ ریزی کسی کو بھی میسر نہیں ہوئی مگر اس کے ماہرین کے ساتھ کام کرنے سے اور بغیر اس کے بہت نادر غیر واقع ہے، اگر چہ عقلاً جائز ہے اور جب یہ متعین ہو گیا کہ (شریعت کی معرفت) میں سلف کے اقوال ہی پر اعتماد ہے تو ضروری ہے کہ ان کے وہ اقوال جن پر اعتماد ہو، اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہوں، یا مشہور کتابوں میں مدون ہوں، اور یہ کہ منقح ہوں کہ ان محتملات میں راجح، مرجوح سے ظاہر ہو اور عام کی تخصیص مذکور ہو، متضاد اقوال میں تطبیق ہو، احکام کی علتیں بیان کی گئی ہوں۔ ورنہ ان پر اعتماد صحیح نہیں، اور اس پچھلے زمانہ میں کوئی مذہب اس صفت کے ساتھ موصوف نہیں، سوائے ان چار مذاہب کے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے۔

- ۱۔ فرقہ ناجیہ صرف اہل سنت و جماعت ہے، ان کے علاوہ دوسرے تمام فرقے خواہ وہ اپنا نام کچھ رکھیں، جہنمی اور بدعتی ہیں۔
- ۲۔ اس پر اجماع ہے کہ تقلید شخصی واجب ہے۔
- ۳۔ تقلید شخصی میں عظیم مصلحت ہے، اور اس کے ترک میں فساد کبیر ہے۔

۴۔ شریعت کی معرفت نقل اور استنباط پر موقوف ہے، اور یہ دونوں سلف کے اقوال جاننے پر موقوف ہے۔

۵۔ سلف میں صرف ائمہ اربعہ کے اقوال اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہیں، اور صرف انہیں کے مذاہب منقح ہیں۔

۶۔ سلف میں سے ائمہ اربعہ کے علاوہ دوسرے مجتہدین کے اقوال نہ تو اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہیں، نہ کتب مشہورہ میں جامعیت کے ساتھ مدون ہیں کہ ان پر اعتماد صحیح ہو اور نہ منقح ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مجتہدین میں سے صرف ائمہ اربعہ ہی کے مذاہب لائق اعتماد و قابل عمل ہیں، اور یہی علت ہے، ان میں سے کسی ایک پر عمل کے وجوب پر اجماع ہونے کی اور اجماع خواہ کسی عصر کا ہو حجت شرعی ہے، اس لیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”لا تجتمع امتی علی الضلالة“ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔
نیز قرآن میں فرمایا گیا:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ
الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ (نساء: ۱۴ آیت: ۱۱۵)
ترجمہ: اور جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خلاف کرے، اس کے بعد کہ حق کا
راستہ اس پر ظاہر ہو چکا اور مسلمانوں کے راستے سے الگ راستہ چلے ہم اسے اس کے حال پر
چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے، اور یہ کیا ہی بری جگہ پلٹنے کی ہے۔

لہذا اس میں شک و شبہ نہ رہا کہ اس عصر میں واجب ہے کہ ائمہ اربعہ میں کسی ایک
امام کی تقلید کی جائے۔ ان کے علاوہ دوسرے ائمہ کی تقلید ممنوع ہے۔ اس لیے کہ ان کے
مذاہب اتنی احتیاط اور جامعیت کے ساتھ آج موجود نہیں کہ ان کا اتباع کیا جاسکے۔ رہ گئی
ایک صورت یہ کہ ائمہ اربعہ میں کسی معین کی تقلید نہ کی جائے بلکہ بعض مسائل میں ایک کی بعض
میں دوسرے کی۔ اس میں کیا حرج ہے؟

پہلا حرج یہی ہے کہ یہ خرق اجماع ہے۔ اجماع اس پر ہے کہ جو جس امام کا مقلد ہو جملہ امور میں اس کی تقلید کرے۔ بعض مسائل میں ایک کی بعض مسائل میں دوسرے کی یہ ناجائز اور گناہ ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ حقیقت میں امام کی تقلید نہ ہوئی، اپنے نفس کی تقلید ہوئی۔ اس لیے کہ دوسرے امام کی تقلید ایک امام سے عدول کر کے دوسرے امام کی طرف رجوع کی بنیاد کیا ہوگی؟ اپنی پسند کے کچھ مسائل میں امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اجتہاد پسند آیا تو اسے اختیار کیا، اور بعض دوسرے مسائل میں دوسرے امام کا اجتہاد پسند آیا تو اسے اختیار کر لیا، یہی تو ہوائے نفس کی پیروی ہے۔ اگر یہ اعراض و رجوع دلیل کی قوت و ضعف کی بنا پر ہے تو یہ تسلیم قول بلا دلیل نہ ہو ابا دلیل ہوا۔ پھر تقلید نہ رہی اور کلام تقلید میں ہے۔

تیسرا حرج یہ ہے کہ یہ نص قرآنی سے حرام ہے کہ کبھی ایک طریقہ اختیار کیا جائے کبھی اس کے برعکس دوسرا۔ ہم کو حکم ملا ہے کہ ہم ایک ہی راستے کو اختیار کریں، اور اس کی پیروی کریں۔ چند راستے کا اتباع نہ کریں، فرمایا گیا:

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ (الانعام: ۸۷، آیت ۱۵۴)

ترجمہ: چند راستوں پر مت چلو ورنہ اس کے راستے سے ہٹ جاؤ گے۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اگر کہیں چند راستے گئے ہوں تو منزل پر وہی پہنچے گا جو ان میں کسی ایک کو اختیار کرے اور جو کبھی ایک راستے پر، کبھی دوسرے پر، پھر تیسرے پر، پھر چوتھے پر، پھر پہلے پر، اور پھر دوسرے پر، علیٰ ہذا القیاس چلتا رہے گا۔ وہ راستہ ناپتا ہی رہ جائے گا۔ منزل تک ہرگز نہیں پہنچے گا۔

اس لیے آج واجب ہے کہ جو حنفی ہے، وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی اور جو شافعی ہے، وہ حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اور جو مالکی ہے، وہ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور جو حنبلی ہے وہ حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جملہ فقہی مسائل میں تقلید کرے۔ امت کے کسی فرد کو ان کے علاوہ کسی مجتہد کی تقلید جائز نہیں۔ اور تعلق یعنی کچھ مسائل میں ایک کی تقلید اور کچھ مسائل میں دوسرے کی، یہ بھی حرام و گناہ

ہے۔ یہ اتباع شریعت نہیں، اتباع ہوائے نفس ہے۔

علمائے احناف کی تقلید پر ایک بہت مشہور و معروف اعتراض امرتسری آنجنابی صاحب کا یہ ہے کہ تقلید کی تعریف ہے: تسلیم قول الغیر بلا دلیل، اور علمائے احناف چوں کہ ہر مسئلہ کی دلیل جانتے ہیں، اس لیے یہ مقلد نہ ہوئے، مجتہد ہوئے۔ عرصہ ہوا منو میں یہ سوال اٹھا تھا، اسی وقت اس خادم نے یہ جواب دیا تھا کہ تقلید کی تعریف میں بلا دلیل کا تعلق تسلیم سے ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ کسی کی بات کا ماننا بلا دلیل ہو یعنی ماننے کی بنیاد دلیل نہ ہوں کہ چوں کہ اس قول کی دلیل بہت قوی ہے۔ لہذا مان لیا ہے۔ بلکہ ماننے میں دلیل کو قطعاً کوئی دخل نہ ہو۔ جیسے بچے، ماں باپ کی بات مانتے جاتے ہیں۔ طالب علم استاذ کی بات مانتے جاتے ہیں۔ اور مریض طبیب کی بات مانتا جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی بات کو ماننا تو بلا دلیل ہے، مگر اس کی دلیل بھی جانتا ہو یا بعد میں جاننے لگے۔ دلیل جانتا تقلید کے منافی نہیں جب کہ وہ علت تسلیم نہ ہو۔ دلیل کا جاننا اس وقت منافی ہے جب کہ تسلیم کی علت اور سبب دلیل ہو۔ مثلاً یہ کہ چوں کہ اس بات کی دلیل بہت قوی ہے۔ لہذا یہ مان لیا اور فلاں کی دلیل بہت کمزور ہے لہذا اسے ترک کر دیا۔

اس طرح کا ماننا دلیل کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہ تسلیم القول بلا دلیل نہیں، بدلیل ہے۔ لیکن اگر ہم ایک بات کو مان رہے ہیں مگر ماننے میں دلیل کو دخل نہ ہو، یا ماننا بلا دلیل ہو تو یہ تقلید ہے خواہ اس کی دلیل جانتے ہوں خواہ نہ جانتے ہوں۔ علمائے احناف کا حال یہی دوسرا ہے کہ وہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقوال اور ان کے مذہب مہذب کو بلا دلیل مانتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ابتدائے شعور ہی سے ہم وضو، غسل، طہارت، نماز، روزہ وغیرہ سب مذہب امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مطابق کرتے ہیں، اور اس کی تفصیل کو حق مانتے ہیں۔ جب شرح وقایہ اور ہدایہ وغیرہ پڑھتے ہیں تو دلیل سے واقف ہوتے ہیں، اس لیے یہ ماننا بلا دلیل ہوا یہ دوسری بات ہوئی کہ مان لینے کے بعد دلیل بھی جان گئے۔

رویت ہلال اور توقيت

ماہنامہ ”تہذیب الاخلاق“ علی گڑھ بابت ماہ مئی ۱۹۸۸ء میں اس کے ایڈیٹر صاحب نے مسلمانوں خصوصاً علما پر اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا ہے کہ نماز کے اوقات بلکہ خود روزے کے افطار و سحری میں علم توقيت و ہیئت کا اعتبار کرتے ہیں۔ مگر عید کے سلسلے میں اعتبار نہیں کرتے۔ جس کے نتیجے میں ایک ہی شہر میں دو دن عید ہوتی ہے۔

رسالہ کے اس حصہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ایک صاحب نے یہاں دارالافتا میں بھیجی۔ اور قلم برداشتہ اس کا جواب لکھ دیا گیا۔ ایک دین دار مسلمان کے لیے وہی کافی ہے۔ مزید کچھ لکھنے کی حاجت نہیں تھی مگر اس میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ چاند کی رویت کے لیے ایسا کوئی قاعدہ نہیں معلوم کیا جاسکا ہے جو قطعی ہو، اس کے لیے جو بھی قواعد بنائے گئے، ان سب میں تجربے سے تخلف ثابت ہو چکا ہے۔ اس لیے رویت ہلال کے سلسلے میں علم توقيت کا اعتبار نہیں۔

اس کے بعد بعض حضرات نے بتایا کہ قدیمی قواعد میں جو خامیاں تھیں، ان کو بار بار تجربہ کر کے دور کر دی گئی ہیں، اور اب ان میں ایسی پختگی آگئی ہے کہ ان میں تخلف نہیں ہوتا۔ ان قواعد کی صحت کا بار بار تجربہ بھی کر لیا گیا ہے، جس سے اس میں قطعیت آگئی ہے، اور حساب کا قطعی ہونا مسلم ہے۔ تو جیسے اوقات طلوع و غروب اور نماز میں علم توقيت پر اعتماد کی وجہ یہی تھی کہ حساب قطعی اور بار بار تجربے کے ان قواعد کو قطعی کر دیا ہے۔ رویت ہلال کے ان جدید قواعد پر بھی اعتماد کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ خصوصاً جب کہ ”گرینچ“ وغیرہ کی اعلیٰ رصد گاہوں میں سارا حساب کمپیوٹر کے ذریعہ ہوتا ہے، جس میں اس کا بھی احتمال نہیں کہ حساب میں کوئی غلطی ہوگی، یا بہت مختصر کسروں کو چھوڑنے کی وجہ سے کوئی کمی یا زیادتی ہوگی ہو۔ تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر صاحب کا بھی مقصد غالباً یہی ہے۔

اس پر گزارش یہ ہے کہ نئی تعلیم و تحقیق کے ماہرین میں جو سب سے بڑا نقص ہے وہ

یہ ہے کہ اپنی ہمہ دانی کے نشے میں اپنی عقل سے شرعی احکام میں بھی دخل دینے لگتے ہیں بلکہ مجتہد سے بھی آگے بڑھ کر قرآن و حدیث کے صریح ارشادات کے خلاف فتویٰ دینے کی بھی جسارت کرنے لگتے ہیں۔ مجتہدین بھی اس کے پابند تھے کہ ہر قضیے کا حکم پہلے قرآن مجید میں تلاش کریں، اس میں نہ ملے تو احادیث میں، ان میں بھی نہ ملے تو اجماع امت دیکھیں، اب اگر اس قضیے میں اجماعت امت نہیں یا سرے سے کوئی حکم صحابہ و تابعین سے منقول نہیں تو قیاس سے کام لیں۔ وہ بھی انہیں اصول کی پابندی کے ساتھ جو قرآن و احادیث سے مستنبط ہیں۔

اور ان حضرات کا حال یہ ہے کہ نیوٹن، کپلر، اشائٹن کے اصول و فروع کے حافظ ہوتے ہوئے قرآن و حدیث اور اصول اجتہاد سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی رائے عموماً نصوص شرعیہ کے معارض ہوتی ہے، جب کہ قرآن و حدیث مذہب اسلام کے غیر متبدل دستور اساسی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن و احادیث کے معارض بڑے سے بڑے ہمہ دان محقق مدقق کی ذاتی رائے کے مذہبی حکم کی جگہ دینی مذہب اسلام سے انحراف اور نئے مذہب کی بنیاد رکھنے کے مرادف ہے۔

بعینہ یہی قصہ یہاں بھی ہے کہ رویت ہلال کے سلسلے میں جو لوگ رصد گاہوں کی تحقیق پر اعتماد کی وکالت کر رہے ہیں، ان لوگوں کا یہی حال ہے کہ وہ لوگ کپلر اور نیوٹن اشائٹن کی کدو کاوش اور نکتہ آفرینیوں کو اتنا یقینی و قطعی جانتے ہیں کہ اس کے مقابل قرآن و احادیث کے ارشادات کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس سلسلے میں ہم دین دار، دین پسند مسلمانوں کی توجہ اس پر مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ روزہ، نماز، عیدین، صدقہ فطر، قربانی، حج خالص عبادات ہیں، اور جس طرح ان عبادات کے ارکان اور ہیئت کی تعیین میں عقل انسانی کو کوئی دخل نہیں بلکہ یہ اسی وقت صحیح اور معتبر ہوں گے جب انہیں ارکان اور ہیئت کے ساتھ ادا کیے جائیں جو منجانب شارع مقرر ہیں۔ اسی طرح ان عبادات کے اوقات بھی وہی معتبر ہوں گے جو شارع نے بتائے ہیں۔ اپنے جی سے نئے اوقات مقرر کر کے ادا کیے جائیں گے تو وہ صحیح نہ ہوں گے۔ بعینہ اسی طرح ان اوقات کے معلوم کرنے کا اگر شارع نے کوئی خاص طریقہ بیان فرما دیا ہے تو خاص اسی طریقہ سے

دریافت کیے ہوئے اوقات ہی حقیقت میں ان کے اوقات ہوں گے۔ اسی طریقہ سے ہٹ کر ہم اور آپ اگر کوئی نیا طریقہ ایجاد کریں تو اس طریقہ سے معلوم کیے ہوئے اوقات ان عبادات کے اوقات نہیں ہو سکتے اور ان میں ادائیگی حقیقت میں از روئے شرع ادائیگی نہ ہوگی۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ عبادات کے ارکان ہیئت اوقات کی طرح اگر اوقات کے جاننے کا کوئی طریقہ شارع نے مقرر کر دیا ہے تو اسی طریقہ سے دریافت کیا ہوا وقت اس عبادت کا وقت ہے، اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے دریافت شدہ وقت اس عبادت کا وقت نہ ہوگا۔ خصوصاً ایسے طریقے جسے شارع نے مسترد کر دیا ہو۔ ہاں! اگر اوقات معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا ہے تو پھر اپنی صواب دید سے دریافت کردہ اوقات میں عبادت کی ادائیگی صحیح ہوگی۔

اتنی بات ذہن نشین کرنے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ کسی بھی مہینے کی ابتدا اور انتہا جاننے کا کوئی طریقہ شریعت نے مقرر فرمایا ہے یا نہیں، اور نجوم و ہیئت کو اس خصوص میں لغو اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے یا نہیں۔ آئیے آگے بڑھیے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يسئلونك عن الاهلة قل هي مواقيت للناس والحج.

(بقرہ: ۲. ۸۶. آیت ۱۸۹)

ترجمہ: تم سے لوگ چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ فرمادو یہ لوگوں کے (اپنے) کاروبار اور حج کے اوقات جاننے کا ذریعہ ہے۔

سوال اصل میں یہ تھا کہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے۔ پہلی شب کو باریک نظر آتا ہے پھر بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پورا ہو جاتا ہے، پھر پتلا ہونا شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ غروب ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب نہ بتا کر اس کا فائدہ بتایا گیا۔ اس میں بہت خوش اسلوبی سے لوگوں کو چاند کے طلوع و غروب ہلال و بدر میں تبدیلی کی علت اور سبب جاننے کی کوشش سے روکا گیا ہے اور اس کے روکنے میں یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ اس کا سبب دریافت کرنا عبث اور بے فائدہ ہے۔ اس سے کوئی دینی فائدہ وابستہ نہیں، اس سے اقتضاء ثابت ہوا کہ ہیئت و نجوم کے اصول چاند کے سلسلے میں غیر معتبر ہیں۔

اس کے بعد آئیے احادیث کا مطالعہ کریں:

احادیث:

امام احمد نے اپنی مسند میں، امام مالک نے اپنے موطا میں، امام بخاری و امام مسلم نے اپنی صحیحین میں، امام ابو داؤد نے اپنے سنن میں، امام ترمذی نے اپنے جامع میں، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی نے اپنی سنن میں سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الشهر تسعة و عشرون ليلة فلا تصوموا حتى تروه فان غم
فاكملوا العدة ثلاثين.

ترجمہ: مہینہ انیس رات کا ہے، جب تک چاند نہ دیکھ لو، روزہ نہ رکھو اور اگر ابر ہو تو
تمیں کی گنتی پوری کرو۔

بعض روایتوں میں فاکملوا کی جگہ فاقدرو آیا ہے۔ بخاری میں فاقدرو والہ
ہے، اور ابو داؤد وغیرہ میں فاقدرو والہ ثلاثین ہے۔ یعنی اس کے لیے تمیں کی مقدار پوری
کر لو۔ اس کا بھی حاصل وہی ہوا کہ تمیں دن پورے کر لو۔

امام احمد نے اپنی مسند میں امام بخاری، امام مسلم نے اپنی صحیحین میں، امام ترمذی
نے اپنی جامع میں، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام دارمی نے اپنی اپنی سنن میں
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

صوموا الرؤیتہ والطرورا الرؤیتہ فان غم علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلاثين.
ترجمہ: چاند دیکھ کر روزہ رکھو۔ چاند دیکھ کر روزہ چھوڑو۔ اور اگر ابر ہو تو شعبان کی
تمیں کی گنتی پوری کرو۔

امام بخاری، امام مسلم وغیرہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے راوی کہ رسول
اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تصوموا حتى ترو الهلال ولا تفتروا حتى تروه فان غم علیکم فاکملوا والہ.
ترجمہ: جب تک چاند دیکھ نہ لو، روزہ نہ رکھو، اور جب تک چاند دیکھ نہ لو روزے نہ

چھوڑو، اور اگر ابر ہو تو مقدار پوری کرو۔

ابوداؤد میں فاقدروالہ ثلاثین ہے۔ یعنی تیس دن کی مقدار پوری کرو۔ اس مضمون کی احادیث متعدد حضرات صحابہ سے مروی ہیں۔ جیسے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو حذیفہ، حضرت عبداللہ بن عباس، اور عبدالرحمن بن زید بن خطاب، حارث بن حاطب، ربیع بن خراش رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ الفاظ میں کچھ روو بدل ضرور ہے مگر مفہوم سب کا ایک ہے۔ یہ احادیث اس پر نص ہیں کہ مدار رویت ہلال پر ہے۔ اگر انتیس شعبان کو چاند دیکھائی دے تو شعبان ختم اور رمضان شروع اگر انتیس کو دیکھائی نہ دے تو شعبان باقی اور اس کے بعد والا دن فرض روزے کا دن نہیں۔ اسی طرح رمضان میں بھی ہے کہ اگر انتیس رمضان کو چاند نظر آیا تو رمضان ختم اور دوسرا دن شوال کا ہے۔ اور اگر انتیس کو چاند نظر نہ آیا تو اس کے بعد والا دن رمضان ہی ہے۔ اس دن روزہ چھوڑنا فرض کا چھوڑنا اور گناہ اور نماز عید پڑھنی درست نہیں کیوں کہ ابھی اس کا وقت ہی نہیں ہوا ہے۔ جب شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرض روزے کے ایام جاننے کا طریقہ صرف رویت ہلال رکھا ہے تو دوسرے طریقے شرعا لغو اور غیر معتبر۔ اس لیے کسی بھی طریقے سے اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ چاند افق سے اتنی بلندی پر ہے کہ اگر مطلع صاف ہوتا تو ضرور دکھائی دیتا مگر دکھائی نہیں دیا تو یہ نا کافی ہے بلکہ غیر معتبر اور لغو ہے۔ اتنے ہی سے بات مکمل تھی کہ جب بنیاد رویت ہے، اگر رویت نہ ہوئی تو ایک مہینے کے ختم ہونے اور دوسرے کے شروع ہونے کا حکم شرعا درست نہیں۔

اس بارے میں حساب غیر معتبر ہے:

(۱) اسی سے ثابت ہو گیا کہ اس خصوص میں دوسرے ذرائع شرعا کا عدم ہے، مگر شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فان غم علیکم فرمایا۔ اس ارشاد نے براہ راست دوسرے ذرائع معلومات کے کا عدم ہونے پر مہر فرمادی۔ اس لیے کہ ”غم“ کے معنی ڈھانک لے نے کے ہیں۔ غم کو غم اسی لیے کہتے ہیں وہ دل ڈھانک لیتا ہے۔ اور اسی مناسبت سے بادل کو غمامہ کہتے ہیں کہ وہ آسمان کو ڈھانک لیتا ہے۔ اب غم علیکم کا ترجمہ یہ ہوا کہ چاند تم سے ڈھانک اور چھپا لیا جائے، اور چھپائی وہی چیز جاتی ہے جو موجود ہو۔ تو حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہوا کہ

چاند افق سے اوپر ہو اور وہ کسی چیز سے ڈھنک جائے چھپ جائے۔ مثلاً کہرا، گردوغبار وغیرہ کی وجہ سے نظر نہ آئے۔ اور اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو نظر آتا۔ مگر ان چیزوں میں سے کسی کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہا ہے، تو حدیث میں قطعی حکم موجود ہے کہ ایسی صورت میں تمیں کی گنتی پوری کرو۔ ان حسابات سے یہی نہ معلوم ہوگا کہ چاند افق سے اتنا اونچا ہو گیا کہ اگر کوئی چیز حائل نہ ہوتی تو ضرور نظر آتا، مگر جب نظر نہیں آیا تو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ مہینہ ختم نہ ہو باقی ہے۔ ایک دن اور پورا کرو۔

اس سے واضح اور غیر مبہم یہ حدیث ہے:

(۲) امام احمد اپنی مسند میں امام بخاری اپنی جامع میں امام مسلم اپنی صحیح میں، امام ابو داؤد اور امام نسائی اپنی اپنی سنن میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور اقدس نے فرمایا 'اللفظ للمسلم:

انا امة امية لا نكتب ولا نحسب الشهر هكذا وهكذا و عقد الابہام فی الثلاثة والشہر هكذا وهكذا یعنی تمام ثلاثین۔
ترجمہ: ہم امی قوم ہیں، حساب و کتاب نہیں کرتے۔ مہینہ اتنا ہے اور اتنا ہے اور اتنا ہے۔ تیسری مرتبہ انگوٹھے کو باندھ لیا، اور مہینے اتنا ہے اور اتنا ہے اور اتنا ہے یعنی پورے تیس دن۔ یعنی حضور اقدس ﷺ نے دونوں ہاتھوں کی دسوں انگلیوں کو پھیلا کر اوپر سے نیچے لاکر تین بار فرمایا کہ مہینہ اتنا ہے اتنا ہے اتنا ہے اور تیسری بار ایک انگوٹھے کو دبایا۔ یعنی اسی دن، پھر تین بار اسی طرح اشارہ کر کے فرمایا کہ اتنا اتنا اتنا ہے۔ اب کی بار انگوٹھے کو کھلا رکھا۔ یعنی تیس دن۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ مہینہ اسی (۲۹) دن تیس (۳۰) کا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود پہلے لکھنا کہ لا نحسب ارشاد فرمایا۔ پھر انتہائی واضح غیر مبہم طور پر بیان فرمایا کہ مہینہ اسی دن یا تیس دن کا ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ ہلال کے بارے میں اہل نجوم اور اہل بیت کے حساب کا اعتبار نہیں۔ وہ اس بارے میں قطعاً غیر معتبر ہے۔ اعتبار، رویت کا ہے۔ اگر اسی کو چاند دکھائی دے فیہا ورنہ تیس کا مہینہ ہوگا۔ جب شارع نے اہل نجوم اور

ہیت کے حساب کو لغو اور غیر معتبر قرار دے دیا تو شارع کے مقابل ہمیں یہ کب اختیار ہے کہ ہم اسے معتبر مان کر اس پر مہینوں کے ابتدا اور انتہا کی بنیاد رکھیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نجوم اور ہیت کے حساب پر عمل نہیں فرماتے تھے۔

ابو داؤد میں ہے:

وكان ابن عمر يفطر مع الناس ولا ياخذ بهذا الحساب.

یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما لوگوں کے ساتھ روزہ چھوڑتے تھے، اور اس حساب کو نہیں لیتے تھے۔

ایڈیٹر صاحب کے شبہے کا جواب:

ایڈیٹر صاحب کو یہ شکایت کہ نماز کے اوقات نیز سحری اور افطار میں اس حساب کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ پھر مہینے کی ابتداء اور انتہاء کے سلسلے میں کیوں نہ اعتبار کیا جائے۔

اس پر گزارش ہے کہ نماز اور سحری اور افطار میں شریعت نے رویت پر مدار نہیں رکھا ہے، بلکہ سورج کے طلوع و غروب و زوال۔ اور اس کے دو مثل سایہ ہونے اور صبح صادق کے طلوع اور شفق کے غروب پر رکھا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جب یہ دیکھ لو کہ صبح صادق طلوع کر آئی ہے، تو روزہ دار کھانا پینا چھوڑ دے، اور نماز فجر کا وقت ہو گیا۔ اور جب یہ دیکھ لے کہ سورج غروب ہو گیا تو روزہ توڑ دے، اور مغرب کا وقت ہو گیا بلکہ یہ فرمایا کہ صبح صادق کے طلوع سے روزہ دار کھانا پینا چھوڑ دے، اور نماز فجر کا وقت ہو گیا اور غروب آفتاب پر روزہ افطار کر لے اور مغرب کا وقت ہو گیا، علیٰ ہذا القیاس اگر دیکھے بغیر بھی صبح صادق کے طلوع اور آفتاب کے غروب کا علم ہو جائے تو ان سے جو احکام وابستہ ہیں وہ ثابت ہوں گے۔ اس کو یوں کہیے کہ ان اوقات کے معلوم کرنے کا کوئی خاص طریقہ شریعت نے مقرر نہیں فرمایا ہے مثلاً یہی کہ رویت ہو تو ہم کسی طریقے سے بھی ان اوقات کو جان لیں گے، کافی ہے مگر مہینے کی ابتداء اور انتہا معلوم کرنے کے لیے طریقہ متعین فرمادیا کہ وہ یعنی رویت ہی ہو اور دوسرے طریقوں کو غیر معتبر قرار دے دیا ہے اس لیے یہاں رویت کے علاوہ دوسرے طریقے کا عدم ہوں گے۔

ریڈیو وغیرہ کی خبر پر

عید منانے کے نقصانات

ہر سال عید کے موقع پر ریڈیو کے ذریعہ چاند کے اعلان پر پورے ملک میں ہنگامے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسال خصوصیت سے بہت زیادہ شورش مچی، جس کے نتیجے میں دارالافتاء میں اس سلسلے میں سوالات کی بھرمار ہو گئی۔ اس لیے میں نے ضروری جانا کہ اس موضوع پر ایک مفصل مدلل مضمون شائع کر دیا جائے۔ اسی جذبے کے تحت مندرجہ ذیل سطور سپرد قلم کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جو دین دار انصاف یسندان سطور کو پڑھے گا وہ پورے طور سے مطمئن ہو جائے گا۔

(۱) روزہ تمام عید تراویح خالص عبادات ہیں۔ شریعت نے ان کے لیے اوقات مقرر فرمائے ہیں۔ نہ وقت سے پہلے لو اہوں گے، نہ وقت کے بعد۔ روزے اور تراویح کے لیے رمضان کا مہینہ مقرر فرمایا، اور صدقہ فطر نماز عید کے وجوب کے لیے پہلی شوال۔

(۲) اوقات مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ اوقات جاننے کا طریقہ بھی مقرر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

صوم الرویتہ والظرو الرویتہ فان غم علیکم فاکملوا (بخاری و مسلم)
ترجمہ: چاند دیکھ کر روزہ رکھو چاند دیکھ کر روزہ چھوڑو۔ اگر انتیس کو چاند نظر نہ آئے تو
تیس دن پورے کرو۔

دوسری حدیث میں فرمایا:

إنا امة امیة لا نکتب ولا نحسب الشهر هكذا هكذا یعنی مرة تسعا و
عشرین و مرة ثلاثین. (بخاری و غیرہ)
ترجمہ: ہم حساب و کتاب نہیں کرتے، مہینہ ایسے ایسے ہے، اپنے دست مبارک کی

دسوں انگلیوں کو کھول کر دست مبارک اوپر اٹھائے اور نیچے کیا تیسری بار ایک انگوٹھا دبا لیا، یعنی کبھی انتیس کبھی تیس کا۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اسلامی مہینوں کی ابتدا و انتہا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے یا تیس دن پورے ہونے پر۔ یہی شارع علیہ السلام نے متعین فرمایا ہے۔ اہل بیت و توقيت و نجوم و جیوش کے حساب و کتاب کا قطعاً اعتبار نہیں۔

(۳) یہ بھی ظاہر ہے کہ ان احادیث کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک ہر شخص چاند دیکھ نہ لے نہ روزہ رکھے، نہ چھوڑے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب چاند کا دیکھنا بطریق شرعی ثابت ہو جائے تو جن لوگوں نے نہیں دیکھا ہے وہ بھی اس کے مطابق عمل کریں۔

(۴) چاند کے ثبوت کے آٹھ طریقے ہیں، جن سب کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے رسالہ مبارک ”طرق اثبات ہلال“ میں جمع فرمادیا ہے۔ اس وقت ان سب طریقوں کو بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں۔ ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ دوسرے شہر کے رویت کی خبر بذریعہ ریڈیو یا ٹیلیفون آئے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ دوسری جگہ کی خبر کیسے معتبر ہوگی۔ اس سلسلے میں ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، طحاوی میں ایک حدیث ہے، پہلے اسے ذہن نشین کر لیں:

اغمی علینا ہلال شوال فاصبحنا صیاما فجاء رکب من آخر النہار فشهدوا عند النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انہم رأوا الہلال بالأمس فامرہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان یفطروا وان یخرجوا الی عیدہم من الغد .

ترجمہ: ایک دفعہ شوال کا چاند ۲۹ کو دکھائی نہیں دیا۔ تو ہم نے دوسرے دن روزہ رکھا۔ دن کے آخر حصہ میں کچھ سوار آئے، پھر انہوں نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور گواہی دی کہ ہم لوگوں نے چاند کل دیکھا ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ روزہ توڑ دیں اور کل عید کے لیے نکلیں گے۔

اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ آنے والے صحابہ کرام تھے۔ جن کا جھوٹ بولنا وہ بھی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور شرعاً ممکن نہیں، وہ بھی صرف ایک صاحب

نہیں تھے، پوری جماعت تھی۔ اس لیے کہ ركب دس سے زائد سوار کو کہا جاتا ہے تو اتنا متعین ہو گیا کہ کم از کم دس صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبر دے رہے ہیں کہ ہم نے کل چاند دیکھا ہے۔ مگر ان کی یہ خبر شہادت کے بعد ہی سوال کے چاند کے بارے میں قبول ہوئی۔ تو پھر آج کل کے ماوشما کی خبر بغیر شہادت عید کے چاند کے سلسلے میں کب قابل اعتبار ہوگی۔ ریڈیو، ٹیلیفون، ٹی وی کی خبر کا کیا ٹھکانہ۔

(۵) جب دوسری جگہ کی رویت کے معتبر ہونے کے لیے شہادت بحکم حدیث شرط ہوئی تو شہادت اور گواہی کے تمام لوازم ضروری ہو گئے مثلاً یعنی شاہد ہونا، یعنی گواہ نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہو، اب اگر گواہ نے خود چاند نہیں دیکھا ہے۔ یہ گواہی دیتا ہے کہ فلاں جگہ کے فلاں فلاں یا سب لوگوں نے چاند دیکھا ہے تو معتبر نہیں اس لیے کہ یہ شہادت نہ ہوئی، حکایت اور واقعہ بیان کرنا ہوا۔

در مختار میں فرمایا:

لا لو شہدوا برویہ غیر ہم لانہ حکایۃ .

اگر دوسرے لوگوں کے چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو معتبر نہیں اس لیے کہ یہ حکایت ہے۔ اور یہی عالم گیری وغیرہ میں بھی ہے، اور یہ بات خود دنیوی کچھریوں میں بھی ہے۔ کسی معاملے میں گواہ اگر یہ گواہی دے کہ جو لوگ واقعے کے چشم دید گواہ ہیں انہوں نے مجھے بتایا تو یہ گواہی رد کر دی جائے گی۔ پھر عبادات وہ بھی فرائض و واجبات میں اتنی ڈھیل کیسے ہو سکتی ہے کہ محض حکایت کافی ہو۔ خصوصاً جب کہ حدیث سے ثابت کہ اس میں شہادت شرط ہے۔ یوں ہی گواہوں کا عادل ہونا اور بقدر نصاب ہونا لازم ہے۔ ارشاد ہے:

وَأَشْهِدُوا ذَوَىٰ عَدْلٍ مِّنكُمْ ۝ (طلاق: پ ۲۷-ع ۱۷۶-آیت ۲)

تم میں کے چند عادل گواہی دیں۔

اور فرمایا:

وَأَسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِّن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا وَجِلَيْنِ لِّوَجْهِ

وَأَمْرَاتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ (بقرہ: پ ۲۸-ع ۷۶-آیت ۲۸۲)

اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بناؤ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بناؤ، اپنے گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو۔

ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ کسی بھی معاملے میں گواہی اس وقت معتبر ہوگی جب گواہ کم از کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، جو سب کے سب مسلمان عادل ثقہ متدین ہوں نیز یہ بھی شرط ہے کہ عینی شاہد خود قاضی مفتی کے پاس حاضر ہو کر گواہی دے۔ دور دراز شہروں سے اپنے گھر بیٹھے گواہی کیا معتبر ہوگی۔ مجلس قضا میں پردے کی اوٹ سے گواہی معتبر نہیں۔

(۶) ان تفصیلات سے ظاہر ہو گیا کہ ریڈیو، ٹی وی کی خبر رویت ہلال کے سلسلے میں بالکل ساقط الاعتبار ہے۔ اولاً: یہ صرف ایک خبر ہے شہادت نہیں۔ ثانیاً: صرف ایک شخص کی خبر ہے۔ ثالثاً: ریڈیو پر اعلان کرنے والے عموماً غیر مسلم ورنہ فاسق ضرور ہوتے ہیں۔ رابعاً: یہ خود چاند نہیں دیکھتا۔ یہ اعلان کرتا ہے کہ فلاں جگہ چاند دیکھا گیا، فلاں امام یا مولوی نے یہ اعلان کرایا۔ خامساً: قاضی یا مفتی کے پاس موجود نہیں، میلوں کی دوری سے بول رہا ہے۔

(۷) ٹیلیفون کا بھی یہی حال ہے کہ وہ صرف ایک خبر ہوتی ہے اور اگر کوئی عادل ثقہ ٹیلیفون پر گواہی بھی دے تو بھی غیر معتبر کہ اولاً: یہ صرف ایک شخص ہے۔ ثانیاً: روبرو حاضر نہیں، پس پردہ دوری سے بول رہا ہے۔

(۸) اب بات بالکل واضح ہو گئی کہ اگر ۲۹ رمضان کو ریڈیو سے یہ خبر نشر ہو یا ٹیلیفون سے کوئی یہ کہے کہ فلاں جگہ چاند ہو گیا۔ فلاں امام یا مولانا نے تسلیم کر لیا، اور انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ کل یکم شوال ہے، تو یہ خبر شرعی اعتبار سے قطعاً ساقط و ناقابل اعتبار ہے۔ اس پر اعتماد کر کے دوسرے دن روزہ نہ رکھنا اور نماز عید پڑھنی ناجائز و گناہ، نہ صرف ایک گناہ بلکہ اکٹھے چار گناہوں کا ارتکاب ہے۔ اول: یہ کہ غیر شرعی طریقے کو شرعی طریقہ جان کر اس پر اعتماد کیا۔ دوم: دوسرے دن میں رمضان تھی۔ اس لیے اس دن روزہ رکھنا فرض تھا۔ روزہ نہ رکھا یا رکھ کر توڑ دیا تو فرض کو چھوڑ دیا۔ سوم: نماز عید کے نام سے جو نماز پڑھی وہ وقت نہ ہونے کی وجہ سے نماز عید نہ ہوئی، نفل ہوئی۔ نماز عید جس خاص بیت کے ساتھ پڑھی جاتی

ہے، یعنی زائد تکبیروں کے ساتھ ویسی کوئی نفل نماز مشروع نہیں تو یہ بنام نماز ایک لا یعنی نفل میں مشغولیت ہوئی۔ درمختار میں ہے:

لانه اشتغال بما لا یصح

چہارم: اس گمان پر کہ نماز عید پڑھ چکے ہیں۔ یکم شوال کو نہیں پڑھی اور نماز عید واجب ہے جسے چھوڑ دیا۔ پھر تیس رمضان کی تراویح سے محرومی اور تداعی کے ساتھ نفل کی ادائیگی مزید برآں۔

(۹) ریڈیو اور ٹیلیفون کی خبر پر روزہ سے روکنے والے روزہ توڑنے والے بڑے زور و شور سے یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اس پر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب کہ بہ طریق شرعی یہ ثابت ہو جائے کہ یہ عید کا دن ہے تو اس دن روزہ رکھنا ضرور مکروہ تحریمی ہے، حرام قطعی نہیں۔ اگرچہ کبھی کبھی فقہا مکروہ تحریمی پر بھی حرام کا اطلاق کر دیتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

والمکروہ تحریمہ کالعیدین۔

لیکن جب ۲۹ رمضان کے چاند کا ثبوت بہ طریق شرعی نہ ہو تو دوسرے دن بلاشبہ تیس رمضان ہے۔

حدیث زرچگی۔

فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین۔

جب نظر نہ آئے یا اس کا شرعی ثبوت نہ ملے، تو تیس کی گنتی پوری کرو۔

اور آپ نے دیکھا کہ اس دن روزہ چھوڑنے یا توڑنے اور نماز عید پڑھنے میں اکٹھے

چار گناہوں کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ تو یہ کون سی عقل مندی اور دین داری ہے کہ اس توہم پر کہ یہ عید کا دن ہے۔ کراہت سے بچنے کے لیے چار چار گناہوں کا ارتکاب کیا جائے۔

(۱۰) کچھ لوگ یہ دھوکا دیتے ہیں کہ نجی معاملات میں ریڈیو ٹیلیفون کی خبر پر سب

اعتماد کرتے ہیں۔ پھر چاند کے معاملے میں کیوں معتبر نہیں۔ اس کے جواب کی طرف ہم نے

ابتدا ہی میں اشارہ کر دیا ہے۔ روزہ اور نماز عید خالص عبادات ہیں۔ اور ان کے اوقات کی تعیین اور شناخت کا طریقہ خود شارع علیہ السلام نے مقرر فرما دیا ہے۔ اس میں ترمیم اور تبدیل کا ہمیں یا کسی کو کوئی حق نہیں۔ شارع علیہ السلام نے جیسے بتایا ہے اسی کے مطابق عمل واجب ہے۔ حدیث گزر چکی کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دوسری جگہ سے آئی ہوئی خبر پر شہادت کے بعد اعتماد فرمایا۔ حالانکہ دوسرے نجی معاملات میں ایک شخص کی خبر پر اعتماد فرمالتے تھے۔ مثلاً کسی کی بیماری موت وغیرہ میں۔ پھر کیا وجہ تھی کہ رویت ہلال کی خبر پر بغیر شہادت کے اعتماد نہیں فرمایا۔ ہم اس کے مکلف ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کریں گے۔ کیوں ایسا حکم ہے اس کے جاننے کے ہم مکلف نہیں۔

علمائے نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی نے چاند دیکھا مگر کسی وجہ سے اس کی گواہی قاضی نے رد کر دی تو اسے جائز نہیں کہ دوسرے دن روزہ چھوڑے اور نماز عید پڑھے، واجب ہے کہ روزہ رکھے۔

عالمگیری میں ہے:

رجل رأى هلال الفطرة ولم تقبل شهادته كان عليه ان يصوم فان افطر

كان عليه القضاء دون الكفارة كذا في فتاوى قاضى خان۔

ایک شخص نے عید الفطر کا چاند دیکھا اور گواہی دی اور اس کی گواہی قبول نہ ہوئی تو اس پر واجب ہے کہ روزہ رکھے۔ اگر روزہ نہیں رکھا، تو اس پر قضا واجب ہے، البتہ کفارہ نہیں۔

بلکہ اگر گواہی نہ دی تو بھی اس پر دوسرے دن روزہ رکھنا واجب ہے۔ اسی میں اس کے پہلے ہے:

فمن راه وحده لا يفطر اخذا بالاحتياط فى العادة فان افطر قضاہ ولا

كفارة عليه۔

ترجمہ: جس نے عید الفطر کا چاند تنہا دیکھا تو دوسرے دن روزہ نہ چھوڑے عبادت میں احتیاط کرتے ہوئے۔ اگر روزہ نہیں رکھا تو اس کی قضا کرے۔ البتہ اس پر کفارہ نہیں۔

لہذا انصاف: اس نے خود چاند دیکھا۔ اسے یقین ہے کہ کل یکم شوال ہے، روز عید

ہے۔ مگر علما فرماتے ہیں عبادت کے معاملے میں احتیاط لازم ہے۔ اس لیے وہ روزہ رکھے۔ یہ نہیں فرماتے کہ عید کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ اس لیے روزہ نہ رکھے بلکہ روزہ رکھنے کو واجب فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ نہ رکھنے پر قضا کا حکم دیتے ہیں۔ اپنی آنکھ سے چاند دیکھنے میں جو قوت ہے، وہ ریڈیو ٹیلیفون کی خبر میں کبھی نہیں۔ شنیدہ کے بودمانند دیدہ۔ تو یہاں بدرجہ اولیٰ روزہ رکھنا واجب ہوگا۔

پھر اپنی آنکھ سے دیکھی ہوئی بات پر ہر شخص عمل کرتا ہے۔ مگر روزے اور عید کے معاملے میں قاضی کا قبول کرنا، اور اس کا حکم دینا ضروری قرار دیا گیا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ یہ خالص عبادت کا معاملہ ہے۔ اس میں شارع علیہ السلام کی اتباع ضروری ہے۔ صحابہ کرام نے ان سواروں سے سن کر روزہ نہیں توڑا جب تک گواہی لے کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم نہیں فرمایا۔

اس طرح مسلمانوں پر لازم ہے کہ کوئی خبر سن کر خود روزہ نہ توڑیں، عید نہ کریں۔ جب تک کہ شہر کا قاضی یا مفتی اعلان نہ کرے۔ اور قاضی مفتی اس کا پابند ہے کہ دوسری جگہ کی آئی ہوئی خبر بغیر شہادت شرعیہ کے نہ قبول کرے۔ جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان صحابہ کرام کی خبر شہادت کے بعد قبول فرمائی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۝

(سورہ نساء ہ ۵-ع ۵۹-آیت ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی، اور اپنے میں سے امر والے کی۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر با و نہ رسیدی تمام بولہی ست

ہمیں کرنی ہے شاہنشاہ بطحا کی رضا جوئی د

وہ اپنے ہو گئے تو رحمت پروردگار اپنی

☆☆☆

ہلال عید اور ریڈیو

عوام بہت سی جگہ دہلی وغیرہ کے ریڈیو پر کچھ صاحبان کے اعلان پر ۲۹ ربیعہ کو عید کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو خصوصیت سے اس پر توجہ دینا چاہئے کہ روزہ رکھنا اور نہ رکھنا، رکھ کر توڑ دینا، نماز عید پڑھنا خالص دینی احکام ہیں۔ ان کو روزمرہ کے معمولات اور نجی کاروبار پر قیاس کرنا غلط ہے۔ اس میں اللہ عزوجل اور رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو طریقہ بتایا ہے، اس کی پابندی ضروری ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک بار ۲۹ رمضان کو عہد نبوی میں شوال کا چاند نظر نہیں آیا۔ تو صحابہ کرام نے دوسرے دن روزہ رکھا، پھر دوپہر بعد کچھ سوار خدمت اقدس میں آئے اور انہوں نے یہ بتایا کہ ہم نے کل چاند دیکھا ہے۔ اور اس کی گواہی دی کہ ہم نے کل چاند دیکھا ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس دن روزہ توڑنے کا حکم دیا۔ (طحاوی: صفحہ ۱۸۸، جلد ۱۔ مشکوٰۃ صفحہ ۱۲۸ جلد ۱ بحوالہ ابوداؤد ونسائی)

صحابہ کرام سے زیادہ سچا اس دور میں کون ہے۔ مگر عید کے چاند کے سلسلے میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی بات بھی بغیر گواہی کے قبول نہیں فرمائی۔ تو آج کسی کی بھی خبر کیسے قابل قبول ہوگی۔ جب تک کہ وہ گواہی نہ دے، پھر محض ریڈیو پر کسی مولوی کا اعلان کیسے قابل قبول ہوگا۔

دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے شاگرد کریب شعبان میں دمشق گئے تھے۔ رمضان میں واپس آئے، اور حضرت ابن عباس کو یہ بتایا کہ دمشق میں ۲۹ شعبان جمعہ کو لوگوں نے چاند دیکھا ہے، اور اسی حساب سے وہاں کے لوگوں نے اور خود حضرت معاویہ نے روزہ رکھنا شروع کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کریب سے پوچھا: تم نے چاند دیکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں اور لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس پر

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ہم نے اس کو (۳۰ شعبان) سنیچر کو دیکھا ہے۔ اسی حساب سے روزہ رکھیں گے۔ یہاں تک کہ تیس کی گنتی پوری کر لیں۔ یا ۲۹ کو چاند دیکھ لیں۔ اس پر کریب نے کہا کہ کیا آپ کو حضرت معاویہ کا دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: نہیں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ (ترمذی، صفحہ: ۷۸ جلد ۱)

مسلمان غور کریں! کریب جلیل القدر تابعی ہیں، وہ خبر دے رہے ہیں کہ دمشق میں چاند ہو گیا ہے۔ رویت عام ہوئی، صحابہ رسول سلطان وقت حضرت معاویہ نے بھی چاند دیکھا ہے، اور اسی حساب سے وہ روزہ رکھ رہے ہیں، مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اسے قبول نہیں فرماتے ہیں۔ تو پھر آج کل کے کسی مولوی یا امام کا دور دراز شہروں سے ریڈیو پر یہ اعلان کرنا کہ فلاں جگہ چاند ہو گیا ہے، دوسری جگہوں میں کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر فقہانے فرمایا:

لا لو شہدوا برویہ غیرہم لانہ حکایۃ (در مختار صفحہ: ۹۴ جلد ۲)

اگر کچھ لوگ دوسروں کے چاند دیکھنے کی گواہی دیں تو معتبر نہیں، اس لیے کہ یہ

حکایت ہے۔

غور کیجئے! عادل متدین اشخاص سامنے موجود ہوتے ہوئے یہ گواہی دے رہے ہیں کہ فلاں جگہ کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے۔ مگر یہ معتبر نہیں تو دور دراز شہر سے کسی ایک شخص کا اعلان کیسے معتبر ہوگا۔ ریڈیو، ٹیلیفون کی خبروں پر جو لوگ ۲۹ کا چاند مان کر دوسرے دن روزہ نہ رکھیں گے، یا روزہ رکھ کر توڑ دیں گے، اور نماز عید پڑھ لیں گے وہ ایک نہیں چار گناہ کے مرتکب ہوں گے۔

اول: غیر شرعی طریقہ کو شرعی طریقہ جان کر اعتماد کیا۔

دوم: دوسرے دن تیس رمضان کو روزہ فرض تھا، اسے چھوڑا، یا روزہ رکھ کر توڑا۔

سوم: اس دن نماز عید کے نام سے جو نماز پڑھی، وہ وقت نہ ہونے کی وجہ سے نماز

عید نہ ہوئی، اور جس خاص ترکیب کے ساتھ جو نماز پڑھی ویسی کوئی نفل نماز مشروع نہیں تو

ایک غیر صحیح فعل کو عبادت سمجھ کر ادا کیا۔

چہارم: اس گمان پر کہ ہم نماز عید پڑھ چکے ہیں۔ پہلی شوال کو نماز عید نہ پڑھی جو واجب تھی۔

اس طرح واجب کو ترک کیا، تیسویں شب کو تراویح نہیں پڑھی، تو اس سے محرومی اور مذاعی کے ساتھ نفل نماز پڑھی، یہ مزید برآں۔

مذکورہ بالا باتوں کو بغور پڑھیے اور حکم شرعی میں اپنی سمجھ سے مداخلت کر کے ان گناہوں سے بچئے۔ اس موقع پر کچھ لوگ یہ پروپیگنڈہ کر کے روزہ توڑ ڈالتے ہیں کہ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عید کے دن روزہ رکھنا مکروہ تحریمی ناجائز و گناہ ہے۔ لیکن پہلے یہ ثابت تو ہولے کہ یہ دن عید کا ہے، جب یہ ثابت ہی نہیں کہ یہ دن عید کا ہے تو روزہ کی ممانعت کا پروپیگنڈہ ہی غلط ہے۔ مزید اطمینان کے لیے گزارش ہے کہ ایک جگہ والوں کو دوسری جگہ والوں کی رویت پر اعتماد کر کے روزہ چھوڑنا یا توڑنا نماز عید پڑھنی اسی وقت جائز ہے۔ جب شریعت کے مقرر کردہ قواعد کے مطابق ثبوت ملے، اور اس ثبوت کے صرف پانچ طریقے ہیں:

یعنی شاہدوں کی شہادت، شہادت علی الشہادۃ، شہادت علی القضا، کتاب القاضی الی القاضی، استفاضہ۔

شامی جلد ۲ صفحہ ۹۶ میں ہے:

کان يتحمل اثنان الشہادۃ او يشهدوا علی حکم القاضی او استفاض الخبر بخلاف ما اذا اخبر ان اهل بلدة كذا راوه لانه حکایة .
یعنی دو شخص گواہی دیں یا دو شخص قاضی کے فیصلے کی گواہی دیں یا استفاضہ خبر ہو جائے۔ بخلاف اس کے دو شخصوں نے یہ خبر دی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے، اس کا اعتبار نہیں، اس لیے کہ یہ حکایت ہے۔

ریڈیو میں صرف یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک شخص خبر دیتا ہے کہ فلاں جگہ چاند ہوا نہ اس میں خبر دینے والا سامنے موجود ہوتا ہے، اور نہ دو ہوتے ہیں، اور نہ گواہی دیتے ہیں، پھر اس

کے معتبر ہونے کا سوال نہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ گاؤں کے بے پڑھے لکھے، سرمایہ دار، ذی اثر حتیٰ کہ بعض مسجدوں کے عہدیداران امام کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ تیس رمضان کو نماز عید پڑھائے ورنہ امامت سے الگ کر دیا جائے گا۔ ملازمت کی لالچ میں بہت سے خدانا ترس اماموں نے روزہ رکھ کر نماز عید پڑھائی ہے۔ عوام کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس صورت میں نماز عید قطعاً نہیں ہوئی۔ ان کی ضد اور ہٹ تو پوری ہوئی، مگر سب لوگ نماز عید سے محروم رہے، ائمہ مساجد پر فرض ہے کہ وہ خدا کا خوف کریں۔ رزاق، مسجد کے ممبران نہیں اللہ عزوجل ہے۔ ایسے موقع پر استقامت اختیار کریں۔ اور ریڈیو کی خبر پر ہرگز نماز نہ پڑھائیں۔ انشاء اللہ! اللہ کی مدد ان کے شامل حال ہوگی۔ واللہ اعلم

(ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور اپریل ۱۹۸۸ء صفحہ: ۹۵۷)



ایک پیغام

ریڈیو سے چاند کا اعلان کرنے والوں کے نام

حضرت فقیہ عصر شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمۃ والرضوان نے رویت ہلال کے سلسلہ میں عوامی بے احتیاطیوں اور دیابنہ و وہابیہ کی ریشہ دوانیوں پر تحریری طور سے علامہ مسلمین کو متعدد بار متنبہ فرمایا اور حکم شرعی سے آگاہ کیا۔ آپ کی یہ قابل قدر تحریری کوششیں اپنے اپنے موقع سے منظر عام پر آتی رہیں۔ اب انہیں سن اشاعت کی ترتیب سے یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس میں بعض مباحث مکرر بھی ملیں گے۔ لیکن ان میں چوں کہ ایک خاص ترتیب اور اپنے محل کی مخصوص افادیت تھی، اس لیے انہیں جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ اب یہ چار مقالے نذر قارئین ہیں۔ کاش مسلمان احکام شرع پر کار بند ہو جائیں۔ (مرتب)

یہ حقیقت ہے کہ عید کے چاند کا مسئلہ اب بہت سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ ریڈیو سنتے ہی عوام بے قابو ہو جاتے ہیں، اور مسجدوں اور مدرسوں میں ایسے لوگوں کی یلغار شروع ہو جاتی ہے، جنہیں نماز و روزہ سے کوئی مطلب نہیں وہ ہڑتال کرانے والے سیاسی ورکروں کی طرح زبردستی عید کی نماز پڑھوانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ عید کی نماز اور چاند کا مسئلہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں جسے عوامی دباؤ کی بنیاد پر طے کیا جائے۔ یہ مسئلہ شریعت کے ضابطوں کی روشنی میں صرف علما کے طے کرنے کا ہے۔ لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خالص مذہبی مسئلہ سوسائٹی کے ہنگامہ پسند اور غیر ذمہ دار لوگوں کی ہلٹر بازی کا نشانہ بنتا جا رہا ہے۔ لوگوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ یہاں حکومت کی طرف سے چاند کے اعلانات کا کوئی بندوبست نہیں ہے، جو شریعت کے مقرر کردہ ضابطوں کی پابندی کرتا ہو، لہذا مقامی علما اور ائمہ مساجد کو جب تک اپنے طور پر چاند کے شرعی ثبوت کا

اطمینان نہ ہو جائے وہ صرف عوام کے دباؤ پر لاکھوں مسلمانوں کے روزے توڑ ڈالنے کی ذمہ داری کیوں کر قبول کر سکتے ہیں؟

کچھ لوگ اپنی بات منوانے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ پہلے شرعی طور پر وہ عید کا دن بھی تو ثابت ہو۔ اس مقام پر یہ نکتہ نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ آنے والے دن کا رمضان ہونا یقین کی منزل میں ہے کہ رمضان کا سلسلہ پہلے ہی سے قائم ہے اور شرعی اصول کے مطابق یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔ لہذا جب تک عید کے چاند کی شہادت شرعی یقین کے اجالے میں نہیں آ جاتی، فرض روزے کا توڑنا کیسے جائز ہوگا۔

اس بحران کا حل تلاش کرنے کے لیے ۱۱، ۱۲، جولائی ۱۹۸۶ء کو علمائے اہل سنت کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں طے کیا گیا کہ چاند کے مسئلے کو عوام کی بے جا مداخلت سے کیوں کر بچایا جائے۔ اس اہم مقصد کے لیے دوسرے ان علما سے بھی رابطہ قائم کیا گیا جو بالعموم اس معاملے میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ تاکہ اس مسئلے کا کوئی بہتر حل سامنے آسکے۔ ذیل میں ان کے نام پیش کیے جا رہے ہیں، جن کے نام آل انڈیا شرعی بورڈ کے معتمد فقہ عصر حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی نے یکے بعد دیگرے دو خطوط روانہ کیے۔

۱۔ مولانا عبداللہ بخاری امام جامع مسجد، دہلی

۲۔ مولانا مفتی مکرم احمد امام جامع مسجد فتح پوری، دہلی

۳۔ مولانا منت اللہ رحمانی، مونگیر

۴۔ مولانا حبیب الحلیم قرنگی محلی، لکھنؤ

۵۔ مولانا عون احمد، پھلواڑی شریف

۶۔ مولانا ضیاء الدین بخاری، ممبئی

۷۔ حافظ محمد صابر امام ناخدا مسجد، کلکتہ

اب خطوط کی نقل ملاحظہ ہو جن کے جوابات کا انتظار ہے۔

پہلا خط

باسمہ تعالیٰ

۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء مکرئی زید کرمہ..... بعد ماہوا لمسنون!

سب سے پہلے آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ نئے حوادث اور اہم مسائل میں شرعی نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ۱۹۸۵ء میں ملک کے مشاہیر علمائے اہل سنت کے نمائندہ اجتماع میں ”کل ہند شرعی بورڈ“ کے نام سے ایک مجلس کی تشکیل عمل میں لائی گئی، جس کا مرکزی دفتر ملک کی شہرہ آفاق درس گاہ الجامعہ الاشرافیہ میں قائم کیا گیا۔

اس تعارفی تمہید کے بعد گزارش ہے کہ آپ حالات کی اس سنگینی سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ ہلال عید کے مسئلے میں ہر سال مسلمانان ہند بحران کا شکار ہوتے ہیں، عید منانے اور نہ منانے کے سلسلے میں عوام کے درمیان اتنی سخت قسم کھینچا گیا کہ آرائی ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ عوامی بے چینیوں کا یہ سارا مظاہرہ ریڈیو کے اعلان کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

انہیں حالات کے پیش نظر متفقہ طور پر عید منانے کے لیے کل ہند شرعی بورڈ کی ایک میٹنگ ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء کو مبارک پور منعقد ہوئی، جس میں طے کیا گیا کہ ملک کے وہ چند مذہبی مشاہیر جو اپنے شہر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے چاند کا اعلان نشر کرتے ہیں ان سے رابطہ قائم کر کے شرعی ضابطوں کی روشنی میں ان سے اس مسئلے میں صحیح معلومات حاصل کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ عوام کو ہلال عید کے مسئلے میں انتشار سے بچانے کے لیے افہام و تفہیم کا موقع نکالنا از بس ضروری ہے۔ آپ کا جواب موصول ہونے کے بعد ہم ان نکات کی فہرست آپ کو ارسال کریں گے جن پر تبادلہ خیال کی ضرورت ہم محسوس کرتے ہیں۔

ازراہ کرم پہلی فرصت میں امید افزا جواب سے مندرجہ ذیل پتے پر ممنون فرمائیں۔

محمد شریف الحق امجدی

معمد: کل ہند شرعی بورڈ۔ الجامعہ الاشرافیہ، مبارک پور اعظم گڑھ (یوپی)

دوسرا خط

۱۵ اگست ۱۹۸۶ء

مکرمی..... بعد ماہوا لکھنؤن!

۳۱ جولائی ۱۹۸۶ء کے مکتوب میں اعلان رویت ہلال عید کے سلسلے میں جن نکات پر آپ سے معلومات حاصل کرنے کا ہم نے ذکر کیا تھا۔ آج وہ نکات آپ کو ارسال کر رہا ہوں، از راہ کرم شرعی اصولوں کی روشنی میں ہر نکتے کا اطمینان بخش جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

وضاحت طلب نکات

(۱) ریڈیو کے ذریعہ آپ اپنے فیصلے کا اعلان پورے ملک کے لیے کرتے ہیں، یا صرف اسی خطے کے لیے جہاں سے اعلان نشر ہوتا ہے۔ اگر آپ کا اعلان پورے ملک کے لیے ہوتا ہے تو از راہ کرم کوئی ایسی شرعی دلیل پیش کیجئے جس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہو کہ رویت ہلال کے سلسلے میں کسی قاضی کا فیصلہ بیک وقت پورے ملک میں نافذ ہو سکتا ہے۔

(۲) آپ اپنے فیصلے کا اعلان اپنی ذاتی حیثیت میں کراتے ہیں یا قاضی کی حیثیت سے۔ اگر ذاتی حیثیت میں کراتے ہیں تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر قاضی کی حیثیت سے اعلان کراتے ہیں تو اپنی حدود قضا متعین فرمائیے۔ اور یہ بھی بتائیے کہ سلطان اسلام کی غیر موجودگی میں کسی ملک کے یا کسی خطے کے لیے قاضی مقرر کرنے کا شرعی ضابطہ کیا ہے؟ نیز اگر آپ کی حدود قضا میں پورا ملک شامل ہے تو اس بات کی وضاحت فرمائیے کہ آپ کو پورے ملک کے لیے قاضی کن لوگوں نے نامزد کیا۔

(۳) رویت کا شرعی ثبوت مل جانے کے بعد آپ اپنے فیصلے کا اعلان کس طرح کرتے ہیں، ریڈیو پر خود جا کر بولتے ہیں یا ریڈیو کے اناؤنسر کو اعلان لکھ کر دے دیتے ہیں۔

اگر اناؤنسر کے ذریعہ اعلان کرتے ہیں تو اعلان کے الفاظ سے مطلع فرمائیے۔

(۴) کسی غیر مسلم اناؤنسر کے ذریعہ ہلال عید کا اعلان کیا شرعاً قابل اعتماد ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو اس کے ثبوت میں کوئی شرعی دلیل پیش فرمائیے۔

(۵) یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہلال عید سے متعلق آپ اپنے فیصلے کا اعلان ریڈیو کے ذریعہ اسی لیے نشر کرتے ہیں کہ باہر کے لوگ آپ کے اعلان پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا روزہ توڑ دیں، اور عید منائیں۔ لیکن تجربات شاہد ہیں کہ ریڈیو والے غلط اعلان بھی کرتے ہیں۔ جیسا کہ آج سے چند سال پیشتر آنجنہانی بے پرکاش نارائن کی موت کی خبر ریڈیو والوں نے غلط نشر کر دی تھی، جس کی بعد میں انہیں تصحیح کرنی پڑی، اور یہ واقعہ بالکل تازہ ہے کہ ریڈیو والوں نے ۴ جولائی ۱۹۸۶ء کو آنجنہانی جگ جیون رام کی موت کی خبر بھی غلط نشر کر دی تھی، جیسا کہ یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں بھی زیر بحث آچکا ہے، اور اس کی انکوائری ہو رہی ہے کہ غلط خبر کیسے نشر ہو گئی۔ جب ملک اور حکومت کی مرکزی شخصیتوں کے معاملے میں ریڈیو والے اتنی فاش غلطیاں کرتے ہیں تو مسلمانوں کے معاملے میں بالخصوص مذہبی امور میں ان کی خبروں پر کیوں کرا اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

ان حالات میں ریڈیو کے ذریعہ اپنے اعلان کو قابل اعتماد بنانے کے لیے آپ نے سرکاری سطح پر کیا انتظام کیا ہے؟ اس کی تفصیلات سے مطلع فرمائیے۔ نیز فتوے کی زبان میں اس کی بھی وضاحت فرمائیے کہ ان حالات میں جب کہ ریڈیو کا سارا محکمہ اہل کفر و فسق کے ہاتھوں میں ہے، ان کے اعلانات پر اعتماد کر کے روزہ توڑنا اور عید منانا از روئے شرع کہاں تک درست ہے؟

(۶) کیا رویت ہلال کی شہادت آپ ٹیلیفون کے ذریعہ بھی قبول فرماتے ہیں، اگر قبول کرتے ہیں تو اس بات کی کوئی شرعی دلیل پیش کیجئے کہ غائب کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے۔

(۷) کیا ٹیلیفون کے ذریعے بھی آپ فیصلے کی خبر اپنی حدود قضا سے باہر کے علاقوں تک پہنچاتے ہیں، اگر پہنچاتے ہیں تو اس بات کے لیے شرعی دلیل پیش کیجئے کہ اپنی حدود قضا

سے باہر بھی کسی قاضی کا فیصلہ نافذ ہو سکتا ہے؟

(۸) اگر کسی دوسرے شہر کا قاضی ٹیلیفون کے ذریعہ اپنے فیصلے کی خبر آپ کو دے تو آپ اپنے شہر میں اس خبر پر عمل کرنا جائز سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر جائز سمجھتے ہیں تو اس پر کوئی دلیل قائم فرمائیں۔

(۹) آپ کے نزدیک اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟ اگر اعتبار نہیں ہے تو سعودی عرب، پاکستان، اور بنگلہ دیش اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے قاضی کے اعلان پر ہندوستان کے مسلمانوں کو از روئے شرع روزہ توڑنا اور عید منانا جائز ہے یا نہیں؟

محمد شریف الحق امجدی

معمد: کل ہند شرعی بورڈ

الجامعۃ الاشرافیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی) ۹

(ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، ستمبر ۱۹۸۶ء صفحہ: ۳۱۵۲۸)

اس تحریر کے وضاحت کا طلب نکات ماہنامہ ”سنی دنیا“ بریلی شریف ستمبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں بھی ”کل ہند شرعی بورڈ کی معروضات“ کے عنوان سے شائع ہوئے۔



شرعی عید اور عرفی عید

(امسال ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۹ء) بھی عید کے معاملے میں اختلافات ہو گیا اور وہ بھی ایک اہم خط فاصل کے ساتھ دیوبندی مذہب کے افراد نے ۲۹/۱۹ کا چاند مان کر ۱۹ جنوری منگل کو عید کی۔ حتیٰ کہ افریقہ وغیرہ میں بھی یہی ہوا، اور اقل قلیل اہل سنت نے بھی رو میں آ کر ایسا ہی کیا۔ لیکن اہل سنت و جماعت کی اکثریت نے پورے ملک میں بلکہ پوری دنیا میں ۲۰ جنوری بدھ کو ۳۰ کے حساب سے عید کی۔ ہمارے یوپی کے کچھ بڑے بڑے شہروں میں بھی ۲۹ کے حساب ہی سے عید ہوئی لیکن سب کا مدار لکھنؤ یا دلی کے ریڈیو کی خبر پر تھا۔ امسال ایک خاص بات یہ رہی کہ یوپی میں کچھ جگہوں پر مطلع بالکل صاف تھا مگر اکثر جگہوں پر چاند نظر آیا، یا وہاں چند دیکھنے کی خبر مشہور ہوئی تو دیکھنے والے اکثر دیوبندی ہی تھے البتہ ہمارے ضلع میں دو ایک دیوبندی نے اپنی روحانی قوت سے تہ بہ تہ بادلوں کے پیچھے سے بھی چاند دیکھ لیا۔ جس پر پورے ضلع کے دیوبندیوں نے عید کر لی۔ بہر حال! ہمیں دیوبندی مذہب سے غرض نہیں ہمارا مذہب الگ، ان کا مذہب الگ۔ وہ جب چاہیں جیسے چاہیں عید کر لیں۔ ہمارا مقصود اس میں مضمون سے اہل سنت و جماعت کے افراد کو یہ بتانا ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آخر ہم لوگ شاہی امام دہلی جیسے شہرت یافتہ شاہی امام کا فیصلہ کیوں نہیں مانتے۔ ہمارے گریجویٹ طبقہ اسکولوں کالجوں یونیورسٹی کے ماسٹران، پروفیسران، پیرسٹران، ڈاکٹران اس سلسلے میں علما پر سخت تنقیدیں کرتے ہیں کہ موت وزیست آمد و رفت وغیرہ ہر معاملے میں ریڈیو ٹیلی فون کی خبر معتبر ہے پھر چاند کے معاملے میں کیوں معتبر نہیں۔ ان کے لہجے میں اس کا جواب یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کو ناتھورام گوڈ سے قتل کیا اور اس وقت ملک کی سب سے بڑی شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم نے ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کیا کہ ہمارے باپ کو ناتھورام گوڈ سے قتل کر دیا لیکن حیرت ہے کہ صرف ان کے اعلان پر گوڈ سے کوسزا نہیں دی گئی جب تک کہ وزیر اعظم سے بہت کمتر درجے کے جج کی کچھری میں قانونی طور پر گواہوں نے آ کر چشم دید گواہی نہیں دی۔ آخر بات کیا ہے؟ اس پر نہایت ہی طنز آمیز لہجے میں گریجویٹ حضرات

فرماتے ہیں کہ قتل کے کیس اور چاند کے ہونے نہ ہونے میں کیا علاقہ؟۔

ہمیں افسوس ہے کہ ایسی بات وہ لوگ کہتے ہیں جو اپنے آپ کو معزز مسلمان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک روزہ و نماز آلو ٹماٹر کے برابر ہے کہ فون پر بھاؤ آگیا تسلیم کر لیا گیا۔ کاش! وہ لوگ مذہب کی روح سمجھتے، نماز روزے کی اہمیت جانتے، تو نماز روزے کو آلو ٹماٹر کے برابر نہیں جانتے۔ اب آئیے ہم سے سنیے۔ سوال کے چاند کا معاملہ بہت اہم ہے۔ ایک طرف یہ ہے کہ عید کے دن روزہ رکھنا گناہ ہے مگر یہ ایک گناہ ہے دوسری طرف یہ ہے کہ اگر ۲۹ کا چاند ثابت نہیں اور کسی نے دوسرے دن روزہ نہیں رکھا اور عید کر لی تو چار چار گناہ کا مرتکب ہوا۔

(۱) غیر شرعی طریقہ کو معتبر مان کر اس پر عمل کیا یہ ایک گناہ ہوا۔

(۲) دوسرے دن روزہ فرض تھا، اسے چھوڑا یہ دوسرا گناہ ہوا۔

(۳) اس دن ۳۰ رمضان تھی اور نماز عید پڑھ لی، جس کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا تو یہ

نماز عید نہ ہوئی نفل ہوئی، اور جس طرح نماز عید پڑھی جاتی ہے اس طرح کوئی نفل نماز شروع نہیں تو جو چیز حقیقت میں صحیح نہیں اسے عبادت سمجھ کر کیا یہ تیسرا گناہ ہوا۔

(۴) یکم سوال کو نماز عید واجب تھی اسے پڑھا نہیں، یہ چوتھا گناہ ہوا۔

دیوبندی مذہب کے افراد اپنے مذہب کے مطابق چاند کی اعلان کر کے یہ چلاتے

چلاتے گلا پھاڑ لیتے ہیں کہ آج عید ہے، عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اہل سنت کو چاہیے

کہ ان کے جواب میں یہ بھی اعلان کریں کی کہ آج ۳۰ رمضان ہے۔ آج روزہ رکھنا فرض

ہے۔ آج کے دن روزہ چھوڑنا نماز عید پڑھنا، چار چار گناہوں کا مجموعہ ہے۔

آگے بڑھے اہل سنت بغور ملاحظہ فرمائیں! نماز و روزہ آلو ٹماٹر کے مثل نہیں۔ یہ

دونوں عبادت ہیں اور ان دونوں کے لیے من جانب اللہ وقت مقرر ہے، اور اس وقت کے

جاننے کا طریقہ بھی شریعت نے چاند کے ثبوت کے لیے جب کہ مطلع صاف ہو یہ ضروری

قرار دیا ہے کہ اتنی بڑی جماعت چاند دیکھے جن کی خبر پر یقین حاصل ہو جائے کہ واقعی چاند

ہوا ہے، اکٹھے اتنی آدمی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ دو چار آدمیوں کے کہنے سے کہ ہم نے چاند

دیکھا ہے ثبوت نہیں ہوگا۔ جیسا کہ امسال بہت سی جگہوں پر ہوا ہے اگر مطلع نا صاف ہو تو رمضان کے علاوہ ارمینے کے چاند کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں قاضی کے پاس آکر گواہی دیں کہ ہم نے اس سال فلاں وقت فلاں دن فلاں مہینے کا چاند دیکھا ہے۔ مثلاً اس سال کے بارے میں یہ کہے میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس سال کے شوال کا چاند کل، یا آج مغرب سے قبل یا مغرب کے بعد دیکھا ہے۔ وہ بھی قاضی کے سامنے آکر اس میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ اول: خاص یہ لفظ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں اور اگر خاص یہ لفظ نہ کہے اور اس کی جگہ کچھ اور کہے میں قسم کھاتا ہوں، میں حلف اٹھاتا ہوں میں حلفیہ بیان دیتا ہوں معتبر نہیں۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ بیان حلفی الگ چیز ہے اور گواہی الگ چیز۔ دوسرے یہ کہ ایسا لفظ ضرور کہے جس سے متعین ہو جائے کہ جس مہینے کے چاند کے بارے میں نزاع ہے اسی کے بارے میں یہ گواہی دے رہا ہے۔ مثلاً اگر کہا کہ میں نے شوال کا چاند دیکھا ہے تو بے کار۔ جب تک تعین نہ کرے الفاظ کے ذریعہ سے کہ اس سال کے شوال کے متنازع چاند کی گواہی دے رہا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جب تک وہ بات معین نہ ہو جس کے بارے میں گواہی دی جا رہی ہے گواہی بے کار ہے۔ گواہی میں قیاس اور غلبہ ظن سے استخراج مفید نہیں۔

رہ گئی یہ بات کہ اس صورت خاص میں گواہی کی ضرورت ہے، ایسا کیوں ہے، اس خصوص میں فقہائے کرام کے عقلی استدلالات سے قطع نظر کرتے ہوئے حدیث پیش کرتا ہوں:

امام ابو داؤد اور امام ابو عبد اللہ یزید بن ماجہ قزوینی نے اپنے اپنے سنن میں اور امام ابو جعفر طحاوی نے شرح معانی الآثار میں یہ حدیث روایت کی، واللفظ للطحاوی:

ان الهلال خفي على الناس في آخر شهر من رمضان في زمن النبي ﷺ فاصبحوا صياما فشهدوا عند النبي ﷺ بعد زوال الشمس انهم رأوا الهلال الليلة الماضية فأمر رسوا لله ﷺ الناس بالفطروا الفطروا تلك الساعة و خرج بهم من الغد صلاة العيد. (جلد اول: ص ۱۸۸)

رمضان کے مہینے کے اخیر دن چاند لوگوں سے چھپ گیا دوسرے دن سب لوگوں نے روزہ رکھا اس کے بعد کچھ لوگوں نے زوال کے بعد نبی ﷺ کی خدمت میں گواہی دی کہ ان لوگوں نے گزشتہ رات چاند دیکھا ہے اس پر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ روزہ توڑ دیں، سب لوگوں نے اسی وقت روزہ توڑ دیا، دوسرے دن صبح کو عید کی نماز پڑھائی۔ ابو داؤد میں ہے جہاں رجب کچھ سوار آئے۔ جو یہ گواہی دے رہے تھے ابن ماجہ میں بعد زوال القمیس کے بعد ہے آخر النہار۔ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ یہ چاند کی خبر لانے والے صحابہ کرام تھے اور وہ بھی ایک نہیں کم از کم تین مگر حضور اقدس ﷺ نے صرف ان کی خبر پر اکتفا نہیں فرمایا۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ صحابہ کرام جھوٹ بولیں گے وہ بھی حضور ﷺ کے سامنے جب کہ صحابہ کا عالم یہ تھا کہ عہد رسالت میں کھل کر اپنی عورتوں سے بات چیت نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے صرف خبر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب ان لوگوں نے گواہی دی تو قبول فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عید کے چاند کی رویت کے ثبوت کے لیے جب مطلع نا صاف ہو بقدر نصاب چاند دیکھنے والوں کی گواہی ضروری ہے، اور اسی کے حکم میں دوسرے مہینے بھی ہیں۔ البتہ رمضان کا چاند مستثنیٰ ہے جب کہ مطلع نا صاف ہو تو صرف ایک مسلمان کی خبر کافی ہے، جب کہ یہ ظاہر نہ ہو کہ یہ فاسق ہے جیسا کہ دوسری حدیث سے ثابت ہے۔

جب عید کے چاند کے ثبوت کے لیے شہادت شرط ہوئی تو محض خبر کا اعتبار ساقط، خواہ وہ خبر دینے والے کوئی بھی ہو، خواہ وہ خبر کسی شخص کی ہو، حتیٰ کہ اگر دو چار آدمی کسی شہر سے آکر یہ خبر دیں بلکہ یہ شہادت بھی دیں کہ فلاں جگہ کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے بلکہ تعین بھی کر دیں فلاں فلاں لوگوں نے چاند دیکھا ہے تو معتبر نہیں۔

ردالمحتار میں حموی سے ہے:

بخلاف ما اذا اخبر ان اهل بلدة كذا راوه لاله حكاية.

اگر دو شخصوں نے یہ خبر دی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے دیکھا تو معتبر نہیں اس لیے کہ

یہ حکایت ہے۔ (شہادت نہیں۔)

در مختار میں ہے:

لا لو شهدوا بروية خيرہ لانه حکایة.

دوسرے لوگوں کے چاند دیکھنے کی بہت سے لوگوں نے گواہی دی تو معتبر نہیں اس لئے کہ یہ حکایت ہے۔ (شہادت نہیں)

تو جب کہ دو چار ثقہ متدین افراد کی یہ شہادت وہ بھی قاضی کے سامنے حاضر ہو کر معتبر نہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ فلاں فلاں لوگوں نے ۲۹/۱ کا چاند دیکھا ہے تو ریڈیو ٹیلی فون کی خبر کیا معتبر ہوگی؟ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ ریڈیو سے غلط خبر شائع ہوگئی۔ ایک سال ریڈیو سے خبر نشر ہوئی کہ ممبئی میں ۲۹/۱ کا چاند ہو گیا ہے، اور یہاں کل عید ہے لیکن واقع میں اس سال ممبئی میں ۳۰/۱ کے اعتبار سے عید ہوئی۔

چند سال پہلے کی بات ہے آل انڈیا ریڈیو سے ۲۸/۱ رمضان گزار کر رات میں یہ خبر نشر ہوئی کہ امام شاہی مسجد دہلی نے اعلان کر دیا ہے کہ آج شوال کا چاند ہو گیا ہے کل عید ہے اور ان کے ماننے والوں نے عید کر ڈالی۔ جب کہ اس تاریخ کو چاند کی رویت ممکن ہی نہیں۔ اور عید بالکل ہی غلط۔ باطل اور حرام ہوئی۔ مگر جہالت اور روزہ گھٹانے کے شوق کا کیا علاج؟ بہر حال! یہ تو عارضی باتیں ہیں بنیادی بات وہی ہے جو میں نے پہلے تحریر کی کہ اس بارے میں محض خبر جنس حدیث معتبر نہیں۔ اگرچہ خبر دینے والے ثقہ متدین ہوں یا ریڈیو یا ٹیلی فون سے کوئی بہت بھاری بھرم شخصیت اعلان کرنے، اور یہی فقہائے کرام کی تصریحات سے ثابت ہے اس لیے جن لوگوں نے ریڈیو ٹیلی فون کی خبر سے ۱۹/۱ فروری منگل کے دن روزہ نہیں رکھا یا رکھ کر توڑ دیا اور اسی دن نماز عید پڑھ لی وہ ایک نہیں چار، چار گناہ کے مرتکب ہوئے۔ مطلع صاف ہونے یا رویت سے کوئی مانع ہونے کی صورت میں دوسری جگہ کے چاند

کے معتبر ہونے کے لیے پانچ طریقے ہیں:-

اول: جن لوگوں نے چاند دیکھا ہے وہ خود قاضی کے سامنے حاضر ہو کر گواہی دیں اور سب کے سب لائق قبول شہادت ہوں اور کم از کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔

دوم: شہادت علی القضا: دو شخص قاضی کے اجلاس میں موجود تھے، ان کے سامنے بقدر نصاب گواہوں نے آکر قاضی کے سامنے گواہی دی کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے اس کے مطابق قاضی نے حکم دے دیا پھر یہ دونوں شخص دوسرے شہر کے قاضی کے پاس آئیں اور قاضی کے اجلاس میں گواہی دیں کہ فلاں شہر کے قاضی کے یہاں ہماری موجودگی میں گواہان بقدر نصاب نے یہ گواہی دی کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے اور قاضی نے ان کی گواہی قبول کر کے اس کے مطابق حکم دے دیا ہے۔

سوم: شہادت علی الشہادت: کسی شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ان دیکھنے والوں میں سے کم از کم دو مردوں نے، دو مردوں کو اپنی شہادت کا شاہد بنایا۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ ان دو مردوں کے سامنے چاند دیکھنے والوں میں سے ہر ایک یوں کہے میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے امسال کے شوال کا چاند کل یا فلاں روز دیکھا ہے، اور میں تم دونوں کو اپنی اس گواہی پر گواہ بناتا ہوں۔ پھر دوسرے شاہد دوسرے شہر میں آکر قاضی کے اجلاس میں یوں گواہی دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں بن فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں بن فلاں ساکن فلاں محلہ فلاں نے ہمارے سامنے یہ گواہی دی کہ امسال شوال کا چاند میں نے کل یا فلاں تاریخ کو دیکھا ہے۔ میں تم دونوں کو اپنی اس گواہی پر گواہ بناتا ہوں۔ اس کے معتبر ہونے کی لیے چند شرطیں ہیں:

(۱) اصل گواہ اتنی دور ہوں کہ اس شہر میں آکر گواہی دے کر شام تک گھر نہ پہنچ سکیں اور اس میں اعتبار اوسط چال سے پیدل چلنے کا ہے۔ علمائے میلوں سے اس کی کوئی مقدار نہیں معین کی ہے۔ آج کے پرفتن دور میں یہ ضروری ہے کہ اس کی تعین میلوں سے کر دی جائے۔ میرا اپنا استنباط یہ ہے کہ یہ فاصلہ ۱۵ کلومیٹر ۳۳۳ میٹر ہونا چاہئے۔ یہ استنباط اس پر مبنی ہے کہ مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے جد الممتار میں دلائل قاطعہ سے ثابت فرمایا ہے کہ

مدت مسافت ساڑھے ستاون میل ہے جو موجودہ اعشاریہ میل سے ۹۲ کلومیٹر ہوتا ہے تو یہ ایک دن کی مسافت ۳۰ کلومیٹر ۶۶۶ میٹر ہوگی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایک آدمی ایک دن میں پیدل اوسط رفتار سے اتنا چل سکتا ہے جس سے نہ تھک کر چور ہوگا نہ اس کی صحت پر اثر پڑے گا، اور شریعت میں اس کا اعتبار ہے تو اصل گواہ کو کم از کم اتنی دور رہنا چاہئے کہ آمد و رفت مل کر ۳۰ کلومیٹر ۶۶۶ میٹر سے کچھ زائد ہو۔

(۲) گواہان فرغ یہ ضرور کہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں۔

(۳) اصل گواہوں کے والد اور ان کے دادا کا بھی نام لیں۔ جائے سکونت و تعیین

محلہ بھی بیان کریں۔ یعنی ان کا نام اس طرح لیں کہ وہ بالکل معین شخص ہو جائیں جس میں کوئی شک و شبہ یا التباس نہ رہے۔

چہارم: کتاب القاضی: یعنی قاضی شرع کے سامنے شرعی گواہی گزری اس نے دوسرے شہر کے قاضی کے نام خط لکھا کہ میرے سامنے اس مضمون پر شہادت شرعیہ قائم ہوئی، اور اس خط میں اپنا اور مکتوب الیہ کا نام و نشان پورا لکھا جس سے کافی امتیاز واقع ہو اور وہ خط دو گواہان عادل کے سپرد کیا کہ میرا خط فلاں شہر کے قاضی کے نام ہے۔ آپ لوگ اسے با احتیاط بعینہ ان تک پہنچادیں اس کے بعد وہ گواہان با احتیاط اس خط کو مکتوب الیہ کے پاس لائیں اور ان الفاظ میں شہادت دیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ خط آپ کے نام فلاں شہر کے قاضی نے ہم کو دیا اور ہم کو گواہ کیا کہ یہ خط اس کا ہے تو دوسرے شہر کے قاضی کو اس کی اجازت ہے کہ اس خط کے مطابق فیصلہ کر دیں اور بہتر یہ ہے کہ پہلا قاضی خط لکھ کر ان گواہوں کو سنادے اور خط بند کر کے ان کے سامنے سر بمہر کر دے اور اولیٰ یہ کہ اس کا مضمون ایک کھلے ہوئے پرچے پر الگ لکھ کر بھی اس کو دے دے کہ اسے یاد کرتے رہیں اور دوسرے قاضی کے سامنے گواہی دیں کہ اس خط میں یہ مضمون ہے۔

فتاویٰ خیر یہ میں ہے کہ یہ ضروری ہے کہ قاضی اول گواہوں کے سامنے خط لکھے۔

پنجم: کسی شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور سب بیک زبان اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن چاند دیکھ کر روزہ شروع ہوا یا عید کی گئی۔ محض بازاری افواہ کی خبر اڑ گئی

اور قائل کا پتا نہیں پوچھے تو یہی جواب ملتا ہے کہ سنا ہے یا لوگ کہتے ہیں، یا بڑی کوشش کی گئی تو کسی نامعلوم مجہول کا پتا بتایا گیا محض بازاری افواہ نامعتبر۔ علما نے اس کے لیے جماعت متعددہ کا لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ اس لیے دو چار آدمیوں کا کہنا معتبر نہیں۔ باری باری ایک ایک دو دو آدمیوں کا کہنا بھی معتبر نہیں۔ جماعت کم از کم تین افراد سے پوری ہوگی اور متعدد اس وقت ہوگی جب کہ کم از کم تین جماعتیں ہوں اس کا حاصل یہ نکلا کہ کم از کم تین آدمیوں کی تین جماعتیں آکر یہ خبر دیں کہ ہم فلاں شہر سے آرہے ہیں وہاں کے لوگوں نے ۲۹ رکا چاند دیکھ کر فلاں دن سے روزہ رکھنا شروع کیا ہے، یا فلاں دن عید کی ہے۔

استفاضہ میں جب یہ شرط ہے کہ اس شہر سے متعدد جماعتیں آکر خبر دیں تو معلوم ہوا کہ ٹیلی فون کی خبریں غیر معتبر اور اسی طرح ریڈیو کی بھی۔

پھر اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ جس شہر سے یہ جماعتیں خبر لائیں وہاں کوئی ایسا قاضی و مفتی مرجع خلائق موجود ہو جس کے حکم سے لوگ روزہ رکھتے ہوں اور عید کرتے ہوں وہ خود پابند شرع خدا ترس صاحب استقامت ہو جو دنیا دار رؤسا کے دباؤ میں نہ آئے ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرے۔ اور لوگ روزہ و عید کے عمل میں اس کے احکام کے پابند ہوں۔

مذکورہ بالا طریقوں کو مجدد اعظم اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے فتاویٰ رضویہ جلد چہارم میں مطبوع رسالہ مبارکہ ”طرق اثبات ہلال“ میں بیان فرمایا ہے، اور ہر مسئلے کو کتب فقہ کے حوالے سے مدلل فرمایا ہے، اگر کسی صاحب کو اس پر اطمینان نہ ہو تو کتب فقہ کے رویت ہلال کا باب اور کتاب الشہادۃ کا مطالعہ کر لیں۔ ہم نے ان مضامین کو بالاختصار اپنے ماہنامے میں اس لیے دیا ہے کہ ہر سال شوال کے مہینے میں پوری دنیا سے اس سلسلے میں بے شمار استفتے آتے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد انتہائی افسوس ہوتا ہے۔

ناظرین کی تسکین کے لیے میں صرف ایک مفتی صاحب کی کارکردگی اور قضا کا حال تحریر کر دیتا ہوں۔

امسال ہمارے اطراف ضلع مو اور اعظم گڑھ کے مطلع پر بہت گہرا بادل تھا،

دیوبندیوں نے تو ۲۹ کے اعتبار سے عید کر لی کیوں کہ ہمارے دیار کے دیوبندیوں نے اپنے مذہب کا جز بنا لیا ہے کہ ہم ۲۹ ہی کی عید کریں گے۔ اس لیے سارے دیوبندیوں نے ۲۹ کی عید کر لی۔ اور ایک کوردہ برآمد پور مضافات محمد آباد گوہنہ سے چاند برآمد کر لیا۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے دفتر میں اطلاع ملی کہ غازی پور میں چاند دیکھا گیا ہے جانشین حافظ ملت حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب مدظلہ سربراہ اعلیٰ الجامعہ الاشرفیہ مبارک پور نے دو افراد کو غازی پور مدرسہ چشمہ رحمت میں بھیجا وہاں کے مفتی صاحب نے جو تحریر ان لوگوں کو دی اس کی نقل لفظ بہ لفظ یہ ہے:

میں تصدیق کرتا ہوں کہ غازی پور میں کئی افراد نے جو متشرع اور دین دار ہیں عینی شہادت دی ہے کہ ہم لوگوں نے شوال کا چاند دیکھا ہے لہذا ان معتبر حضرات کی گواہی سے یہاں رویت کا اعلان کر دیا گیا ہے میں اپنی تحریر مولانا محبوب صاحب اور ماسٹر فیاض صاحب کو پانچ افراد کے سامنے دے رہا ہوں۔ یہاں میرے گھر پر مہر نہ ہونے کے سبب مہر نہیں لگایا ہے۔ دو بجے رات میں تحریر کر رہا ہوں۔

الفقیر

جمیل احمد غفرلہ

خادم دارالافتاء مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور

۱۸ جنوری ۱۹۹۹ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

اب ناظرین اس تحریر کے عجائبات کو ملاحظہ کریں۔

اول: اس تحریر کو اگر رویت ہلال کے شرعی طریقوں میں سے کسی میں داخل کیا جاسکتا ہے تو وہ کتاب القاضی الی القاضی ہے۔ کتاب القاضی الی القاضی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ قاضی اپنے نام اور پتے کے ساتھ مکتوب الیہ کا نام اور پتا لکھے اور اس عجوبہ روزگار تحریر میں کسی مکتوب الیہ کا نام نہیں۔

دوم: قاضی صاحب نے یہ نہیں ظاہر کیا کہ مطلع صاف تھا یا نا صاف۔ مطلع اگر صاف تھا تو اتنی بڑی جماعت کا دیکھنا ثبوت کے لیے ضروری تھا جن کی خبر پر غلبہ ظن ملحق بہ

یقین حاصل ہو جائے۔ کئی افراد کا صدق دو تین پر بھی ہو سکتا ہے جب مطلع صاف ہو تو دو تین پانچ دس کی بھی گواہی نامعتبر۔ میں نے بعد میں پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ غازی پور میں مطلع صاف تھا اس لیے کئی افراد کی گواہی مسترد۔

سوم: گواہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے سوال کا چاند دیکھا ہے۔ کس دن، کس تاریخ میں دیکھا ہے غائب۔

چہارم: کس سن کے شول کا چاند دیکھا ہے غائب۔

پنجم: آگے قاضی صاحب لکھتے ہیں: یہاں رویت کا اعلان کر دیا گیا۔ کس وقت کی

رویت کا اعلان ہے غائب۔

ششم: کس مہینے کی رویت کا اعلان کر دیا گیا ہے غائب۔

ہفتم: عجب العجاب تحریر لکھنے کا وقت لکھا ہے۔ دو بجے رات۔ تاریخ لکھی ہے

۱۸ جنوری ۱۹۹۹ء مطابق ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ۔

ناظرین نوٹ کر لیں انگریزی تاریخ ۱۲ بجے شب سے بدل جاتی ہے اور ہماری تاریخ سورج ڈوبنے کے بعد بدلتی ہے تو قبلہ مفتی صاحب نے عیسوی اور ہجری جو تاریخیں لکھی ہیں اس کے حساب سے لازم آتا ہے کہ انہوں نے یہ تحریر اتوار کا دن گزار کر دو شنبہ کی رات میں دو بجے رات کو لکھی ہے تو لازم آیا کہ ان کی تحریر کے مطابق ان کے سامنے اتوار کا دن گزار کر شام کو جب کہ ۲۸ رمضان المبارک تھی، مغرب سے پہلے یا مغرب کے بعد غازی پور میں چاند ہوا ہے۔ لیکن قبلہ مفتی صاحب نے یہ تحریر دو شنبہ ۱۸ جنوری کا دن گزار کر رات میں ۲ بجے لکھی ہے۔ جب کہ ۱۹ جنوری شروع ہو چکی تھی۔ اگر واقعی ان کے یہاں اس وقت سے پہلے گزشتہ شام میں چاند ہونے کی شہادت شرعیہ گزری ہوتی تو یہ رات ۲۹ رمضان المبارک کی نہیں ہوتی بلکہ یکم شوال کی ہوتی۔ اور اگر گزشتہ شام کو چاند نظر نہیں آیا تھا تو اس رات کو ۳۰ رمضان المبارک ہوتی نہ کہ ۲۹ رمضان المبارک۔ ہوش و حواس کا یہ عالم اور بیٹھے ہوئے ہیں غازی پور کے منصب افتاد قضا پر۔ اسی کو حدیث میں فرمایا:

واتخذ الناس رؤسا جهالا فافتوا بغير علم فضلوا واضلوا
لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے جو بغیر علم کے فتویٰ دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے
اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اسی کو حافظ سعدی شیرازی نے فرمایا:

طوق زریں ہمہ در گردن خرمی پنم

اس قسم کی ایک اور تحریر دارالافتاء میں آئی ہے۔ طوالت کے خوف سے اسے چھوڑ
دیتا ہوں۔ عوام بھائیوں سے گزارش ہے کہ میں نے ان کو ایک نمونہ دکھایا، اسی قسم کی تحریروں
اور خبروں پر آپ علما کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ روزہ توڑنے اور عید منانے کا اعلان کریں۔ سمجھ
میں نہیں آتا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ ۲۹ روزہ گراں نہیں ہوا اور ایک روزہ چھوڑنے کے شوق
میں لوگ خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور علما کو بھی پریشان کرتے ہیں اور بلا ضرورت ٹیلی فون
اور پٹرول پھونک کر پیسے برباد کرتے ہیں۔ اس سال جامعہ اشرفیہ کے دفتر میں اتنے ٹیلی فون
آئے جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ مغرب بعد سے لے کر صبح ۶ بجے تک ایک منٹ کے لیے
فون بند نہیں ہوا، اور یہی حال گھوسی مدرسہ شمس العلوم کے دفتر کا تھا خود میرے نجی ٹیلی فون پر
سیکڑوں فون آئے۔ سیدھا سادہ حکم حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہے:

صوموا لرویتہ وافطروا لرویتہ فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین

چاند دیکھ کر روزہ رکھو چاند دیکھ کر روزہ چھوڑو۔ اگر ۲۹ کو چاند نظر نہ آئے تو تیس کی
گنتی پوری کرو۔

ہمارے سنی بھائی یہ نوٹ کر لیں۔ دیوبندی مذہب ہم سے الگ دوسرا مذہب ہے،
ان کے عقائد الگ، ان کے اعمال الگ، جیسے رافضیوں اور قادیانیوں کا مذہب ہے۔ ان کے
مذہب کی پیروی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اب دیوبندی مذہب نے طے کر رکھا ہے کہ ۲۹ ہی
کو ہمیشہ عید کیا کریں گے۔ تمیں کی کبھی نہیں کریں گے۔ لہذا ان کی نہ سنو جن کا تم کلمہ پڑھتے
ہو ان کی سنو، مانو اور عمل کرو، ہر مہینہ کی طرح شوال کا چاند بھی کبھی ۲۹ کو نظر آئے گا، کبھی تیس
کو۔ ۲۹ کو چاند نظر آجائے یا شرعی ثبوت مل جائے فیہا۔ ورنہ تمیں کی گنتی پوری کیا کرو۔

لاؤڈ اسپیکر پر اقتدا

جب حضرت شارح بخاری دام ظلہ جامعہ عربیہ انوار القرآن بلراپور میں تھے تو لائوڈ اسپیکر کے مسئلہ پر یہ جامع تحریر پیش فرمائی تھی جو ماہنامہ پاسبان مئی ۱۹۷۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ پھر ۱۹۷۸ء میں ایک جامع حکم شرعی تحریر فرمایا جو ماہنامہ اشرفیہ اکتوبر ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ دونوں تحریریں یکجا کر کے شائع کی جارہی ہیں۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ لائوڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا کرنے والوں کی نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟ یہاں پر ایک صاحب امام ہو کر آئے ہیں، انہوں نے کہا کہ لائوڈ اسپیکر پر نماز بلا کسی کراہت کے درست ہے۔ یہ بھی کہا کہ بریلی شریف میں اس مسئلہ کے تصفیہ کے واسطے ایک بار علما کی کانفرنس ہوئی جس میں شریک علما میں سے کوئی بھی لائوڈ اسپیکر پر نماز کے فاسد ہونے کا ثبوت نہ دے سکے۔ حتیٰ کہ مفتی اعظم ہند نے یہ کہا کہ مجھ بڑھے کی بات بلا دلیل مان لو۔ مع ثبوت اس مسئلہ کا جواب لکھیں اور یہ کہ اس شخص کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں؟ کیا بریلی شریف میں ایسی کوئی کانفرنس ہوئی ہے، اور کیا آپ کے علم و دانش میں حضور مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسہ نے یہ فرمایا ہے۔ بیواتو جروا

الجواب:- نماز جمعہ و عیدین ہو یا پنج گانہ، کوئی بھی نماز ہو لائوڈ اسپیکر کے ذریعہ سنی ہوئی آواز پر صحیح نہیں کہ یہ تلقین من الخارج ہے جو بالاتفاق مفسد نماز ہے۔ اور یہ باسناد و ایک تمام علمائے اہل سنت کا متفقہ فتویٰ ہے، اس لیے کہ لائوڈ اسپیکر کی آواز کے بارے میں اب تک تین نظریے سامنے آئے ہیں۔ ایک یہ کہ مشکلم کی اصل آواز کے مماثل مشینوں سے پیدا شدہ دوسری آواز ہے، مگر چون کہ مشکلم کی آواز کی لہروں سے مشینوں پر پڑنے ہی سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے وہ مشکلم کی آواز کے بالکل مشابہ ہوتی ہے اور سننے والا مختلف بولنے والوں کی آواز میں امتیاز کر لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ صدا یعنی آواز بازگشت ہے اور یہی ان دو

ایک علما کی بھی تحقیق ہے جو لائوڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا کو جائز کہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ بعینہ آواز متکلم ہے مگر لائوڈ اسپیکر کی مشعری اس پر اثر انداز ہو کر اسے کافی حد تک زور دار اور بلند کر دیتی ہے، ان تینوں نظریے میں سے جو بھی صحیح ہو، بہر صورت لائوڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا کرنی تلقن من الخارج ہے جو بالاتفاق مفسد نماز ہے۔

ہند یہ میں ہے:

لو سمعه المؤتم ممن ليس في الصلوة ففتحه على امامه يجب ان تبطل
صلوة الكل لان التلقن من خارج كذا في البحر الرائق ناقلا عن القنية .
شامی میں ہے:

لان المؤتم لما تلقن من خارج بطلت صلوته .

لائوڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا تلقن من الخارج کیسے ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے نظریہ کی بنا پر جب کہ لائوڈ اسپیکر کی آواز کو متکلم کی آواز کے مماثل دوسری آواز مانا جائے تو تلقن من الخارج ہونا ظاہر ہے، اس لیے اس صورت میں مقتدی امام کی اقتدا نہیں کر رہا ہے بلکہ لائوڈ اسپیکر کی کر رہا ہے جو نہ امام ہے نہ امام کا مقتدی بلکہ ایک بے جان مشین ہے، دوسری صورت میں جب کہ اسے صدا یعنی آواز بازگشت مانیں تو تلقن من الخارج اس لیے ہے کہ صدا کو فقہا چڑیوں کی آواز کے ساتھ لاحق کرتے ہوئے تصریح کرتے ہیں کہ صدا سے آیت سجدہ سننے والے پر سجدہ تلاوت نہیں اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ قراءت نہیں محاکات ہے۔

عالمگیری میں ہے:

وان سمعها من الصدى لا يجب عليه كذا في الخلاصة .

در مختار میں ہے:

لا تجب بسماعه من الصدى والطير .

مراقی الفلاح میں ہے:

ولا تجب بسماعها من الصدى .

غیہ میں ہے:

ولو سمعها من الطائر والصدی لا تجب لانه كحكاكة وليس بقراءة.
طحطاوی علی المراتی میں ہے:

لا اجابة في الصدی وانما هو محاكات .

ان سب عبارتوں کا ما حاصل یہ ہے کہ اگر کسی نے چڑیا یا صدا سے آیت سجدہ سنی تو سجدہ تلاوت واجب نہیں۔ اس لیے کہ یہ محاکات ہے قراءت نہیں، تو جب کہ ان معتمد فقہائے کرام نے یہ تصریح کر دی کہ صدائے محاکات ہے قراءت نہیں، اور مجوزین لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو صدا مان رہے ہیں تو انہیں کے تسلیم پر لازم کہ لاؤڈ اسپیکر پر اقتدا یقیناً تلقن من الخارج ہو اور بلاشبہ لاؤڈ اسپیکر پر اقتدا کرنے والوں کی نماز فاسد ہے۔ یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے ”الکشف شافی“ میں صدا کو عین آواز متکلم مانتا ہے۔ اس لیے لاؤڈ اسپیکر کی آواز کو جب صدی مانیں گے تو اس کی اقتدا عین امام کی اقتدا ہے، تلقن من الخارج نہیں، اس لیے کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے اگرچہ تصریح کی ہے کہ صدا عین آواز متکلم ہے مگر پھر بھی فقہاء کے اس حکم سے اتفاق فرمایا ہے کہ صدا سے مسوع آیت سجدہ پر سجدہ تلاوت واجب نہیں۔ کیا اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے یہاں تضاد بیانی کی ہے۔ اس کی جرات وہی بے ادب کر سکتا ہے جس نے علم علمائے وقت، حرمت حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ کو جب کوئی دلیل نہیں ملی تو یہ فرمادیا کہ مجھ بڑھے کی بات بلا دلیل مان لو۔ یا وہ جاہل کہہ سکتا ہے تفقہ جس کے دماغ سے ایسا ہی غائب رہا جیسے گدھے کے سر سے سینگ، تفقہ خاص نعمت خداوندی ہے، یہ اس کو ملتی ہے جو با ادب ہو۔ ع

بے ادب محروم شد از فضل رب

اس حتمی کو سلجھانے کے لئے یہ چند امور ذہن میں رکھیں۔ صدا سے سجدہ تلاوت واجب نہ ہونے کی گفتگو اس صورت میں ہے کہ دیگر موانع مرتفع ہوں ورنہ صدا کی کیا خصوصیت، قاری کی آواز ہی کوئی سن رہا ہو اور دیگر موانع ہوں تو سجدہ تلاوت واجب نہ ہوگا۔ جب سجدہ تلاوت واجب ہونے کے تمام عوامل مرتفع ہیں اور یہ عین واجب نہیں مانتے، اس کا

صاف و صریح مطلب یہ ہے کہ بلا توسط صدا قاری کی آواز میں اور بتوسط صدا قاری کی آواز میں باعتبار حکم کے فرق ہے، صدا حکما عین آواز قاری نہیں بلکہ حکماً محاکات ہے۔ اور اعلیٰ حضرت قدس سرہ کس اس ارشاد میں کہ عین آواز متکلم ہے کوئی مناقات نہیں۔ اور خود اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے ارشاد پر وارد شدہ شبہہ دفع ہو جاتا ہے۔ اس میں سر یہ ہے کہ خود اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے یہ تصریح کی ہے کہ صدی اگر چہ عین آواز متکلم ہے مگر پہاڑ وغیرہ کے ٹکرانے کی وجہ سے بر بنائے اختلاف مذہب، آواز کی لہروں کا پہلا سلسلہ ٹوٹ کر دوسرا سلسلہ پیدا ہوتا ہے یا وہی سلسلہ قدرے توقف کے بعد واپس آتا ہے، درمیان میں صوتی لہروں کا انقطاع وہ علت ہے جو اسے عین آواز متکلم کے حکم سے نکال کر محاکات کے مرتبے میں پہنچا دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے بھی صدا کو عین آواز کے حکم میں نہیں مانا ورنہ ضرور یہ فتویٰ دیتے کہ اس سے سجدہ تلاوت واجب ہے، اس کا استماع واجب ہے۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے صدا کے ذریعہ سموع آیت سجدہ پر سجدہ تلاوت واجب نہ ہونے اور اس کا استماع واجب نہ ہونے کا فتویٰ ارشاد فرما کر نص کر دی کہ صدا حکما محاکات ہی ہے، قراءت نہیں، اور جب صدی حکما محاکات ہے، قراءت نہیں تو اس کی اقتدا کرنی یقیناً تلقن من الخارج اور مفسد نماز ہے، لائوڈ اسپیکر کی آواز کا صدی ہونا آپ کو بھی تسلیم، اب خود آنجناب کی تسلیم پر ہی لائوڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا کا مفسد نماز ہونا لازم۔ لطف کی بات یہ ہے کہ لائوڈ اسپیکر کی اقتدا میں نماز صحیح کہنے والے بھی صدا پر سجدہ تلاوت نہیں مانتے اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کیوں؟ تو آج تک اس کا جواب نہ دے سکے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر اصل وجہ بتادیں تو لائوڈ اسپیکر پر نماز کے جواز کا سارا تار پود بکھر جائے گا۔

رہ گئی تیسری صورت کہ لائوڈ اسپیکر کی آواز صدا نہیں عین آواز متکلم ہے جسے لائوڈ اسپیکر کی مشینری طاقت در اور بلند کر کے پھیلتی ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریے کی بنا پر لائوڈ اسپیکر کی آواز پر اقتدا صحیح ہونا چاہئے۔ اس لیے کہ جب یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ بعینہ متکلم کی آواز ہے تو اس کی اقتدا امام ہی کی اقتدا ہے، تلقن من الخارج نہیں، اس لیے نماز فاسد ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن ہر نکتہ رس ذہن رکھنے والا اول نظر میں یہ

جان لے گا کہ اس صورت میں بھی تلقن من الخارج موجود ہے اور نماز کا فساد اپنی جگہ، اس لیے کہ مقتدی تک اگرچہ امام ہی کی آواز پہنچ رہی ہے مگر اس آواز کو پہنچانے مشین نہ امام ہے نہ امام کے مقتدی، بلکہ خارجی چیز ہے۔ اس لیے لائوڈ اسپیکر پر اقتدا تلقن من الخارج سے خارج نہیں۔ اس لیے اس کی اقتدا سے نماز کے فاسد ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ان نظریات کے اختلاف سے قطع نظر کرتے ہوئے لائوڈ اسپیکر کی مسافت اور اس کے آلات کی آواز کی اثر اندازی پر جو بھی غور کرے گا اسے ماننا پڑے گا کہ اگر صدا قرأت نہیں محاکات ہے تو لائوڈ اسپیکر کی آواز بدرجہ اولیٰ قرأت نہیں محاکات کے حکم میں ہے۔ اس لیے کہ صدا کی بہ نسبت لائوڈ اسپیکر میں آواز پر خارج کا اثر زیادہ ہے کیوں کہ صدا میں تو صرف خارج کا اثر اتنا ہے کہ متکلم کے منہ سے نکل کر مثلاً کسی پہاڑ سے ٹکرائی، اور قوت تصادم کی وجہ سے پلٹ پڑی، اور یہاں تو متکلم کے منہ سے نکل کر مائک میں گئی، مائک سے بجلی کے تار میں پہنچی، بجلی کے تار سے ایمپلی فائر میں پہنچی، ایمپلی فائر نے اپنے آلات کی قید میں لے کر اس پر اپنا پوری طرح اثر ڈالا، ایمپلی فائر سے پھر بجلی کے تار میں گئی، وہاں سے ہارن میں پہنچی، ہارن نے اسے بقوت ہوا میں پھینکا تو کہیں جا کر سامعین کے کان میں آئی۔ صدا میں صرف مثلاً پہاڑ کا تصادم حائل ہو گیا تو اس کی آواز قرأت نہ رہی حکماً محاکات ہوگی، تو لائوڈ اسپیکر میں ایک نہیں پانچ پانچ خارجی اشیا کے پورے حائل ہونے اور ان سب کے آواز کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لینے اور اس پر اپنی پوری قوت اثر انداز کر لینے کے بعد اس کی آواز ہرگز ہرگز قرأت نہیں رہ سکتی اور ضرور ضرور حکماً محاکات ہو جائے گی۔ اور اس کی اقتدا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی، اور نماز یقیناً فاسد اور کالعدم ہوگی۔ معلوم نہیں کون کذاب اثر آپ کے یہاں پہنچ گیا ہے جو جھوٹ اور افترا کے پھنکے اڑا رہا ہے اور علم علمائے وقت حرامت حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدسیہ کی ارفع واعلیٰ شان میں اتنی دریدہ ڈھنی کر رہا ہے۔

بریلی شریف میں اس مسئلے کے لیے کوئی کانفرنس نہیں ہوئی۔ جب ایک مرتبہ دارالعلوم منظر اسلام کے دو مدرسین نے اس مسئلہ پر بہت آفت مچائی اور رسالہ "نوری کرن" کے ذریعہ لائوڈ اسپیکر پر نماز کے جواز کا بہت پروپیگنڈا کیا تو عرس رضوی کے موقع پر

چند علمائے کرام نے جن میں مجاہد ملت، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب قبلہ مدظلہ العالی بھی تھے، یہ تجویز رکھی کہ ان لوگوں کو حضرت مفتی اعظم ہند کی خدمت میں پیش کر کے ان کے شبہات کا ازالہ کر دیا جائے تاکہ ان لوگوں کی خود رانی ختم ہو جائے۔

اختتام عرس کے بعد یہ مجلس ہوئی۔ یہ دونوں استاد و شاگرد آئے۔ حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم القدیسیہ نے ان دونوں کے شبہات کا پوری تحقیق کے ساتھ ازالہ فرمایا، جواز کے دلائل کی دجیاں بکھیر دیں، لائوڈ اسپیکر پر عدم جواز کو آفتاب کی طرح روشن فرمادیا۔ کچھ دیر تو یہ لوگ بولتے رہے مگر پھر ایسا چپ ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا کہ منہ میں زبان نہیں۔ سارے علماء کو یقین ہو گیا کہ اب ان لوگوں کی سمجھ میں آ گیا اور یہ اختلاف پسندی کی بنا پر سارے علمائے اہل سنت کے خلاف ہی کہتے رہے کہ لائوڈ اسپیکر پر نماز جائز ہے۔

لیکن ایک کے کہنے سے کیا ہوتا ہے جب کہ باسٹنا ان کے تمام علمائے اہل سنت متفقہ طور پر فتویٰ دے چکے، اور دے رہے ہیں کہ لائوڈ اسپیکر پر نماز جائز نہیں۔ تو عوام اہل سنت کو اسی پر عمل کرنا لازم ہے۔

الغرض! دلائل شرعیہ کی روشنی میں یہی محقق ہے کہ لائوڈ اسپیکر کی آواز قرأت نہیں، بلکہ محاکات کے حکم میں ہے، اس کی اقتدا بلا کسی ادنیٰ شبہ کے تلقین من الخارج ہے جو باتفاق مفسد نماز ہے۔ یہی فتویٰ حضرت صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی، حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب قبلہ مصنف بہار شریعت، حضرت محدث اعظم ہند مولانا سید محمد صاحب کچھوچھوی، حضرت تاج العلماء مولانا سید محمد میاں صاحب مارہروی، حضرت شیر پیچہ اہل سنت مولانا حشمت علی خان صاحب لکنوی، محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد صاحب قبلہ، حضرت مولانا اجمل صاحب سنبھلی، مولانا محمد محبوب علی صاحب لکنوی رحمہم اللہ کا ہے اور علمائے موجودین میں سے سوائے دو ایک سب کا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (ماہنامہ پاسبان الہ آباد مئی ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۳ تا ۲۵)

ادھر چند دنوں سے کچھ گنہگار خطوط بصورت سوالات ممبئی سے آرہے ہیں۔ بعض پر کچھ نام لکھے ہوتے ہیں مگر پتہ غائب ہوتا ہے۔ اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ سوالات کے

جوابات دینا میں مناسب نہیں جانتا تھا، لیکن اخیر میں ایک خط ایسا آیا جس کے پیش نظر یہ ضروری ہوا کہ مسئلے کی توضیح کر دی جائے۔ اللہ جسے چاہے ہدایت دے۔

ان سارے خطوط میں ایک ہی بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ لائوڈ اسپیکر پر جب تقریر جائز، نکاح خوانی جائز، خطبہ جائز، تو پھر نماز کیوں صحیح نہیں۔ اخیر میں ایک صاحب نے قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بزعم خویش سائنس کے اسپیشلسٹ (خصوصی ماہر) بنتے ہوئے مجھے یہ سبق پڑھایا ہے کہ لائوڈ اسپیکر کے ذریعہ جو آواز سنائی دیتی ہے، وہ متکلم ہی کی آواز ہے سارے دعوے کے باوجود اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنا پتہ لکھتے۔ اگر انہوں نے اپنا پتہ لکھا ہوتا تو ان سے چند سوالات کرتا تا کہ یہ ان پر واضح ہو جاتا کہ حق کیا ہے۔

مسئلے کی توضیح:

(۱) کسی قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے سے آیت سجدہ سن کر سجدہ تلاوت واجب ہے۔ (۲) اس کے باوجود سارے فقہاء یہ لکھتے ہیں کہ صدائے بازگشت سے اگر کوئی آیت سجدہ سنے تو سجدہ تلاوت واجب نہیں۔ فقہ کی ساری کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس کی علت یہ بتاتے ہیں کہ یہ محاکات ہے قرأت نہیں جیسا کہ غدیہ میں اس کی تصریح ہے۔ (۳) آواز کے ماہرین نے تحقیق کی ہے کہ صدائے بازگشت متکلم ہی کی آواز ہے جو کسی چیز سے ٹکرا کر دوبارہ سنائی دیتی ہے۔

(۴) اب یہاں غور طلب یہ بات ہے کہ جب ان فقہاء کی بھی تسلیم ہے کہ تلاوت کرنے والے سے آیت سجدہ سن کر سجدہ تلاوت واجب، اور صدائے بازگشت بھی تالی ہی کی آواز ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر صدائے بازگشت سے سنی ہوئی آیت سجدہ پر سجدہ تلاوت کیوں نہیں واجب۔ اس کا سبب سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ صدائے بازگشت میں اور تالی کی اصلی آواز میں تھوڑا سا سکون، ٹھہراؤ پیدا ہو گیا، اور خارج کے اثر سے وہ متاثر ہوئی، متکلم کی اصل آواز کسی پہاڑ یا اونچی دیوار سے ٹکرائی، ٹکرا کر واپس ہوئی، چوں کہ ہر دو حرکت کے مابین سکون لازم ہے۔ مثلاً کوئی چیز پچھم جارہی تھی، اب وہ پورب اسی وقت لوٹے گی، جب کہ پورب اور پچھم والی حرکتوں کے مابین قدرے سکون اور ٹھہراؤ ہو۔ نیز صدائے

بازگشت اسی وقت ہوگی جب پہاڑ یا دیوار سے ٹکرانے کے بعد ٹکر کی وجہ سے پیچھے پلٹے جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ تیزی سے چلنے والا کوئی انسان جب کسی چیز سے ٹکراتا ہے تو پیچھے گر پڑتا ہے۔ اسی طرح آواز جب پہاڑ یا دیوار سے ٹکرائی تو ٹکر کھانے کے بعد تیزی سے پیچھے پلٹی، یہی صدائے بازگشت ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ اصل آواز متکلم اور بازگشت کے درمیان تھوڑا سا سکون پیدا ہو گیا، اور ٹکر کی وجہ سے اس میں تالی کے علاوہ دوسری چیز اثر انداز ہو گئی تو فقہانے فرمایا کہ یہ محاکات ہے۔ قرأت نہیں اس پر سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

(۵) اب لائوڈ اسپیکر کی آواز پر غور کیجئے۔ اس پر کسی کو انکار نہیں کہ لائوڈ اسپیکر متکلم کی اصل آواز پر پورے طور سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اسی حد تک کہ متکلم کی آواز کو بہت زیادہ بلند کر دیتا ہے۔ غور کیجئے کہ متکلم کے منہ سے نکلی ہوئی آواز مانگ پر پڑی، مانگ کے مقناطیسی اجزائے اسے پورے طور سے جذب کیا، اور جذب کر کے برقی قوت میں تبدیل کر دیا یہ برقی قوت ایمپلی فائر تک پہنچی، ایمپلی فائر نے اس کو بہت قوی اور بلند کیا، پھر اسے بجلی کے حوالے کیا اور بجلی نے ہارن تک پہنچایا، ہارن نے بہ قوت اس کو ڈھکیلا، اب وہ سنائی دے رہی ہے۔ ایمپلی فائر سے ہارن تک جتنے زمانے تک آواز جتنی مسافت طے کرتی رہی اس لائق نہیں تھی کہ کوئی سن سکے وہ بالکل محبوس اور بند تھی جب ہارن سے باہر نکلی تو سنائی دی۔

اسی لیے اگر کوئی ایسی جگہ کھڑا ہو کہ متکلم کی اصل آواز بھی سن رہا ہو اور ہارن کی آواز بھی سن رہا ہو اور وہ بغور سنے تو اسے دو آوازیں سنائی دیں گی۔ اگرچہ دونوں میں فرق سب کا کام نہیں۔ لیکن میں نے خود اس کا بارہا تجربہ کیا کہ مقرر اخیر لفظ جب بولتا ہے وہ دو بارہ سنائی دیتا ہے چونکہ بجلی کی رفتار آواز سے کئی گنا زیادہ ہے اس لیے بہت تیزی سے آواز ہارن تک پہنچ کر فضا میں آجاتی ہے۔ اس لیے صرف اخیر کا حصہ جب سنائی دیتا ہے تو دو آوازیں محسوس ہوتی ہیں۔ یہ ایک الگ بات تھی۔ مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ متکلم کی آواز پر لائوڈ اسپیکر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ صدائے بازگشت میں صرف پہاڑ یا دیوار کی ٹکر اثر انداز تھی، اور لائوڈ اسپیکر میں مانگ پھر ایمپلی فائر پھر ہارن تینوں کے تینوں اپنی اپنی قوت بھر پورے طور سے اثر انداز ہیں۔ تو جب کہ صدائے بازگشت میں صرف ایک خارجی اثر نے اسے محاکات اور لا

قراءت بنا دیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ لائوڈ اسپیکر کے اتنے بڑے اثر کے باوجود لائوڈ اسپیکر کے ذریعہ سنی ہوئی آواز محاکات اور لا قراءت نہ ہو۔ اسی طرح تکبیر لائیکبیر نہ ہو۔ معمولی سی عقل والا بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ جب صدائے بازگشت میں پہاڑ یا دیوار کی ٹکر نے اس کی آواز کو محاکات اور اس کی قراءت کو لا قراءت بنا دیا، تو لائوڈ اسپیکر کے آلات نے جب آواز پر تین بار تین قسم کا اثر ڈالا تو ضرور لائوڈ اسپیکر کی آواز محاکات ہو گئی۔ اور اس کے ذریعہ سنی ہوئی قراءت لا قراءت، تکبیر لائیکبیر۔

(۶) جب نماز باجماعت پڑھی جائے تو ہمیں امام کی اقتدا کا حکم ہے، اور ہمیں حکم ہے کہ امام کی تکبیر پر تکبیر کہیں، رکوع سجدہ کریں امام کے علاوہ نماز سے جو چیز بھی خارج ہو اس کی اقتدا سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ فقہائے کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ تلقن من الخارج نماز کو فاسد کر دیتی ہے۔

(۷) جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ لائوڈ اسپیکر سے سنی ہوئی تکبیر تکبیر نہیں تو جو شخص لائوڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع و سجدہ کرے گا وہ یقیناً تلقن من الخارج کر رہا ہے۔ اس لیے اس کی نماز ضرور فاسد ہوگی۔

اسی بنا پر ہمارے سارے اکابر حضرت صدر الشریعہ، حضرت مفتی اعظم ہند، حضرت محدث اعظم ہند، حافظ ملت مجاہد ملت، شیر پشہ اہل سنت، برہان ملت، غازی ملت، رحمہم اللہ تعالیٰ نے نماز میں لائوڈ اسپیکر کے استعمال کو منع فرمایا۔ اور یہ حکم دیا کہ جو لوگ لائوڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع و سجدہ کریں گے ان کی نماز فاسد ہوگی، جو شخص مہینے کا حال جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ مہینے کی مساجد میں نماز کے لیے جو لائوڈ اسپیکر استعمال ہو رہے ہیں وہ علما کی رضامندی سے نہیں بلکہ علما کے علی الرغم ان کی ممانعت کے باوجود اپنی برتری اور اختیار جتانے کے لیے لگائے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ مدین پورہ کی بڑی سنی مسجد میں لائوڈ اسپیکر لگوانے کے لیے لوگوں نے ہنگامے تک کیے۔ ایسی صورت میں مہینے کی مساجد میں لائوڈ اسپیکر لگ جانا جواز کی دلیل نہیں بن سکتا۔

رہ گئے ائمہ مساجد تو امام کی ہر نماز بہر حال ہو جاتی ہے۔ اگرچہ لائوڈ اسپیکر لگا ہو، بشرطیکہ وہ بالقصد مانگ میں آواز ڈالنے کی نیت نہ کرے۔ وہ اپنے طور پر نماز پڑھ رہا

ہے۔ مانگ لگا ہوا ہے وہ آواز کھینچ رہا ہے۔ اس لیے ائمہ پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ مسئلہ ممبئی میں اتنا عام ہے کہ کم از کم تمام نمازی ضرور جانتے ہیں اس کے باوجود وہ نمازیں پڑھتے ہیں تو علماء پر کیا الزام؟...

اذان، خطبہ، تقریر، نکاح سے معارضہ کرنا نماز کی حقیقت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے ہے۔ تقریر، نکاح، خطبہ، اذان میں سامعین مقتدی نہیں ہوتے۔ صرف سامع ہوتے ہیں، اور نماز میں نمازی امام کا مقتدی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اذان نہ سنے، تقریر نہ سنے، خطبہ نہ سنے تو بھی کوئی حرج نہیں اس کی نماز بہر حال ہو جائے گی اور نماز باجماعت کا معاملہ ہے کہ اگر مقتدی نے کسی ایسی شخص کی یاد دہانی یا تعلیم قبول کر لی جو نماز سے باہر ہو تو فاسد ہو جائے گی۔ اس لیے نکاح و اذان وغیرہ سے معارضہ کرنا درست نہیں۔

ایک صاحب نے ایک بہت ہی دل خراش بات لکھی ہے کہ ہمارے علماء صرف اس لیے لائوڈ اسپیکر پر نماز کی اجازت نہیں دیتے کہ اکابر نے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ دوسرے صاحب نے لکھا ہے کہ دیوبندیوں کی ضد کہ وجہ سے ایسا فتویٰ دیتے ہیں۔ کسی کی زبان نہیں بند کی جاسکتی اور نہ کسی کے سوچنے پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ اگر دیوبندیوں کی ضد کی بنا پر ایسا ہوتا تو جب کہ دیوبندیوں کے وہ مولوی جو موجودہ دیوبندیوں کے استاذ و پیر تھے انہوں نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ لائوڈ اسپیکر پر نماز تو نماز خطبہ بھی جائز نہیں۔ اس وقت ہمارے علماء جواز کو فتویٰ دیتے۔

بات اصلی یہ ہے کہ دیوبندی جماعت کا یہ حال ہے کہ عوام خصوصاً پونجی پتی اور حکومت کی خوشنودی کی خاطر اپنے فتوے بدلتے رہتے ہیں۔ کیا آپ لوگوں کو نہیں معلوم کہ قاری طیب صاحب آنجہانی اندرا گاندھی کے دور میں دیوبند کے مفتیوں نے یہ فتویٰ دیا کہ نس بندی ناجائز ہے۔ لیکن امیر جنسی کے زمانے میں قاری طیب صاحب نے خود یہ بیان دیا کہ اب تک ہمارے علماء نے نس بندی کے منفی پہلو پر غور کیا نہیں چاہیے کہ اس کے مثبت پہلو (یعنی جائز ہونے) پر بھی غور کریں۔

یہی قصہ اس مسئلے میں بھی ہوا۔ مولوی اشرف علی تھانوی، مولوی حسین احمد

ٹائڈ وی، اور خود دیوبند کے مفتیوں نے پہلے یہ فتویٰ دیا کہ لائوڈ اسپیکر پر نماز صحیح نہیں بلکہ خطبہ بھی درست نہیں، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کے مطبوعہ فتاویٰ میں موجود ہے۔ مگر جب دیکھا کہ عوام کو شوق ہے کہ وہ لائوڈ اسپیکر پر نماز پڑھیں اور ان کے مالدار لوگوں نے اپنی مسجدوں میں لائوڈ اسپیکر لگا دیا ہے تو ان کی رضا جوئی کے لیے فتویٰ بدل دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اکابر نے جن نکات پر عدم جواز کا فتویٰ دیا تھا وہ نکات موجودہ دور کے علمائے دیوبند نہ سمجھ پائے ہوں۔

علمائے اہل سنت بجمہ تبارک و تعالیٰ جب تک مسئلے کی پوری تحقیق نہیں کر لیتے اس وقت تک کوئی فتویٰ نہیں دیتے۔ اور بجمہ تبارک و تعالیٰ اکابر اہل سنت کے تلامذہ ان کی باتوں کو سمجھتے ہیں، اور انہیں بنیادوں پر ان کا فتویٰ جوں کا توں برقرار ہے۔ یہاں نہ ضد کا سوال ہے، اور نہ عوام کے دباؤ کا۔ فقہائے کرام کے ارشادات کی روشنی میں جو بات حق ہے، اس پر قائم ہیں اب خواہ عوام خوش ہوں یا ناخوش۔ ہمارے علمائے کرام اس کی پروا نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

ہم نے ابتدا میں لکھا ہے کہ لائوڈ اسپیکر کی آواز متکلم ہی کی آواز ہے پھر بعد میں ہم نے اسے محاکات قرار دے کر احکام متفرع کیے۔ اس کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ جیسے صدائے بازگشت بھی اصل میں متکلم ہی کی آواز ہے، مگر فقہانے اسے محاکات اور عدم قرأت قرار دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صدائے بازگشت اپنی اصل میں اپنی ماہیت کے اعتبار سے متکلم ہی کی آواز ہے، مگر خارج سے متاثر ہونے کی وجہ سے حکم میں محاکات اور عدم قرأت کے ہے۔ اسی طرح لائوڈ اسپیکر کی آواز بھی اپنی اصل اور حقیقت کے اعتبار سے متکلم ہی کی آواز ہے مگر لائوڈ اسپیکر سے طرح بہ طرح متاثر ہونے کی وجہ سے محاکات اور عدم قرأت کے حکم میں ہے اور اسکی صدہا نظیریں موجود ہیں کہ ادنیٰ تغیر کے بعد کسی شئی کا حکم بدل جاتا ہے۔

محمد شریف الحق امجدی

(ماہنامہ اشرفیہ: اکتوبر ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۳ تا ۲۶)

مسائل حج و زیارت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لولیه والصلوة والسلام علی حبیبہ وعلی آلہ وصحبہ
سفر کے لیے لباس پہننے کے بعد گھر میں جا کر چار رکعت نماز پڑھے، جس میں سورۃ
فاتحہ کے بعد چاروں قل پڑھے۔ یہ نماز اس کی واپسی تک اس کے اہل و عیال اور مال کی
نگہبانی کرے گی۔

دروازے سے باہر نکلتے وقت یہ دعا پڑھے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَتَوَكَّلْتُ عَلٰی اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اِنَّا
نَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ نَزَلَ اَوْ نُزَلَ اَوْ نَضِلَّ اَوْ نُضِلَّ اَوْ نَظْلِمَ اَوْ نُظْلَمَ اَوْ نَجْهَلَ اَوْ
يَجْهَلَ عَلَيْنَا اَحَدًا.

اللہ کے نام سے اور اس کی مدد سے سفر شروع کرتا ہوں۔ میں نے اللہ پر بھروسہ کیا،
گناہوں سے بچنا اور نیکیوں کی طاقت اللہ کی توفیق ہی سے ہے۔ اے اللہ! ہم تیری پناہ
چاہتے ہیں، اس سے کہ ہم خود لغزش کریں یا کوئی اور ہمیں لغزش دے، یا ہم خود بہکیں یا کوئی
دوسرا ہمیں بہکائے، یا ہم کسی پر ظلم کریں یا کوئی ہم پر ظلم کرے، یا ہم خود جہالت کریں یا
ہمارے ساتھ کوئی دوسرا جہالت کرے۔

سب سے رخصت ہو کر اپنی مسجد کو رخصت کرے، اگر وقت مکروہ نہ ہو تو دو رکعت نفل
پڑھے۔ چلتے وقت یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَكَآبَةِ الْمُنْقَلِبِ وَسُوْءِ الْمُنْظَرِ فِي
الْمَالِ وَالْاَهْلِ وَالْوَالِدِ.

ترجمہ: اے اللہ! ہم تیری پناہ مانگتے ہیں، سفر کی مشقت اور واپسی کی برائی سے اور

اہل و عیال اور مال میں کوئی بری صورت نظر آنے سے۔

نیز سورہ تبت یدا کو چھوڑ کر یا ایہا الکفرون سے لے کر قل اعوذ برب الناس تک، ہر سورہ مع بسم اللہ ایک بار پڑھے، اخیر میں بھی بسم اللہ پڑھے۔ اور یہ بھی پڑھے:

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَأْدُكَ إِلَىٰ مَعَادٍ مِّنْهُ.

ترجمہ: وہ جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا، وہ ضرور تجھے واپسی کی جگہ لائے گا۔

ریل یا کسی سواری پر سوار ہو تو پہلے بسم اللہ پڑھے، اس کے بعد اللہ اکبر اور الحمد لله اور سبحان اللہ تین بار، لا الہ الا اللہ ایک بار کہے پھر ”سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ“ ایک بار۔

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات! جس نے ہمارے لیے اسے مسخر فرمایا، اور ہم اسے تابع نہیں بنا سکتے تھے، اور ہم اپنے پروردگار ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

جب کسی دریا کی سواری پر چڑھے تو یہ پڑھے:

بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِيهَا وَمُرْسِيهَا إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمَاوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ سُبْحَانَكَ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ.

ترجمہ: اللہ کے نام سے اس کا چلنا، اور ٹھہرنا ہے۔ بے شک میرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے، اور انہوں نے جیسی چاہے اللہ کی قدر نہ کی، اور قیامت کے دن پوری زمین اس کے قبضے میں ہے، اور آسمان اس کے ہاتھوں میں لپٹے ہوئے ہیں، وہ پاک ہے، اور اس سے بڑے جسے اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

احرام

میقات اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے بغیر احرام باندھے آگے بڑھنا منع ہے۔ ہندوستان کی میقات کوہِ یلملم کی محاذات ہے۔ یعنی جب جہاز سمندر میں اس جگہ کو پہنچ جائے جو یلملم کے برابر ہے، تو احرام باندھ لینا چاہئے۔ یہ جگہ کامران کے بعد جدہ سے پہلے ہے۔

پہلے احرام کا سامان ٹھیک رکھیں، احرام سے پہلے خط اور حجامت بنوائیں۔ خوب مل دھل کر نہالیں، نہا کر خوشبو لگالیں، یا کم از کم وضو کر لیں۔

جب وہ جگہ آجائے دو رکعت بہ نیت احرام پڑھیں پہلی میں سورہ فاتحہ کے بعد قل یا ایہا الکفرون اور دوسری میں قل هو اللہ احد پڑھیں۔ عام طور پر ہندوستان کے لوگ تمتع کرتے ہیں، یعنی پہلے عمرہ بعد میں حج، ایسے لوگ احرام کی نماز کے بعد یہ دعا پڑھیں۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ الْعُمْرَةَ فَيَسِّرْهَا لِي وَتَقَبَّلْهَا مِنِّي نَوَيْتُ الْعُمْرَةَ مُخْلِصًا

لِلَّهِ تَعَالَى .

اور اگر کوئی صرف حج کرنا چاہتا ہو، تو یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ فَيَسِّرْهُ لِي وَتَقَبَّلْهُ مِنِّي نَوَيْتُ الْحَجَّ مُخْلِصًا لِلَّهِ

تَعَالَى اسے افراد کہتے ہیں۔

اور اگر حج قرآن کرے تو یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَيَسِّرْهُمَا لِي وَتَقَبَّلْهُمَا مِنِّي نَوَيْتُ الْحَجَّ

وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ تَعَالَى . یہ سب سے افضل ہے۔

اور تینوں صورتوں میں اس نیت کے بعد باواز بلند بیک کہے، بیک یہ ہے:

لَيْتَكَ اللَّهُمَّ لَيْتَكَ ط لَيْتَكَ لَا شَرِيكَ لَهُ لَيْتَكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنُّعْمَةَ

لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ .

جب مدعی پر پہنچے، جہاں سے کعبہ شریف نظر آتا ہے تو یہ دعا پڑھے۔

اللَّهُمَّ هَذَا بَيْتُكَ وَأَنَا عَبْدُكَ أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ .

ترجمہ: اے اللہ! یہ تیرا گھر ہے، اور میں تیرا بندہ ہوں، میں تجھ سے معافی اور عافیت

کا سوال کرتا ہوں۔

مسجد حرام کی دو منزلہ عمارت بن جانے کی وجہ سے مدعی سے کعبہ نظر نہیں آتا۔ مکہ

معظمہ میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ وَالْبَلَدُ بَلَدُكَ جِئْتُكَ هَارِبًا مِنْكَ

إِلَيْكَ لَا وَدَىٰ فَرَايَضُكَ أَطْلُبُ رَحْمَتَكَ وَالْتِمِسُ رِضْوَانَكَ أَسْئَلُكَ
مَسْئَلَةَ الْمُضْطَرِّينَ إِلَيْكَ الْخَائِفِينَ عُقُوبَتَكَ أَسْئَلُكَ أَنْ تَقْبَلَنِي الْيَوْمَ
بِعَفْوِكَ وَتَدْخِلَنِي فِي رَحْمَتِكَ وَتَتَجَاوَزَ عَنِّي بِمَغْفِرَتِكَ وَتُعِينَنِي عَلَىٰ آدَاءِ
فَرَايَضِكَ اللَّهُمَّ نَجِّنِي مِنْ عَذَابِكَ وَافْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَأَدْخِلْنِي فِيهَا
وَأَعِزَّنِي مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ .

ترجمہ: اے اللہ! تو میرا پروردگار ہے، اور میں تیرا بندہ ہوں، اور یہ شہر تیرا شہر ہے۔
میں تیرے پاس تیرے عذاب سے بھاگ کر حاضر ہوا ہوں تاکہ تیرے فرانس کو ادا کروں،
اور تیری رحمت کو طلب کروں اور تیری رضا کو تلاش کروں۔ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں جیسے
مضطرب اور تیرے عذاب سے ڈرنے والے کرتے ہیں یقیناً تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اپنے
عفو کے ساتھ مجھ کو قبول فرما۔ اور اپنی رحمت میں داخل فرما کر اپنی مغفرت کے ساتھ مجھ سے
درگزر فرما، اور فرانس کے ادا کرنے پر میری مدد فرما۔ اے اللہ! مجھ کو اپنے عذاب سے نجات
دے، اور میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے، اور اس میں مجھے داخل کر،
اور مردود شیطان سے مجھے پناہ میں رکھ۔

جب مکہ معظمہ پہنچ جائے تو کوشش یہ کرے کہ سب سے پہلے مسجد حرام شریف میں
حاضر ہو لیکن اگر کوئی عذر ہو مجبوری ہو تو جاتے وقت اللہ عزوجل اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کا ذکر کرتا رہے، اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال و متعلقین کے لیے اور تمام مسلمانوں
کے لیے فلاح دارین کی دعا کرتا ہوا لبیک کہتا رہے، اور جب مسجد حرام کی دہلیز پر پہنچے تو
چوکھٹ کو بوسہ دے، اور یہ دعا پڑھتے ہوئے داہنا قدم پہلے اندر رکھے۔

أَعُوذُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ بِوَجْهِهِ الْكَرِيمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ،
بِسْمِ اللَّهِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ رَسُولِ اللَّهِ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي وَافْتَحْ لِي
أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ .

یہ دعا خوب اچھی طرح یاد کر لے، جب بھی کبھی مسجد الحرام شریف یا کسی اور مسجد میں
داخل ہو یہ دعا پڑھ لیا کرے۔

جب مسجد حرام سے باہر آئے یا کسی بھی مسجد سے باہر نکلے تو پہلے بایاں پاؤں نکالے اور پہلی والی دعا پڑھے البتہ رحمک کی جگہ فصلک بدل دے اور اتنا بڑھا دے۔ وَسَهِّلْ لِيْ أَبْوَابَ رِزْقِكَ.

جب کعبہ معظمہ پر نظر پڑے تین بار کہے: لا اله الا الله والله اکبر، درود شریف پڑھے اور یہ دعا پڑھے۔

اللَّهُمَّ زِدْ بَيْتَكَ هَذَا تَعْظِيمًا وَتَشْرِيفًا وَتَكْرِيمًا وَبِرًّا وَمَهَابَةً اللَّهُمَّ ادْخِلْنَا الْجَنَّةَ بِإِحْسَابٍ . اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ أَنْ تَغْفِرَ لِيْ وَتَرْحَمَنِيْ وَتَقِلَّ عِشْرَتِيْ وَتَضَعَ وِزْرِيْ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ اللَّهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ وَزَائِرُكَ وَعَلَى كُلِّ مَزُورٍ حَقٌّ وَأَنْتَ خَيْرُ مَزُورٍ فَاسْأَلُكَ أَنْ تَرْحَمَنِيْ وَتَقِلَّ رَقَبَتِيْ مِنَ النَّارِ .

ترجمہ: اے اللہ! تو اپنے اس گھر کی عظمت و شرافت، بزرگی خوبی ہیبت زیادہ کر۔ اے اللہ! ہم کو جنت میں بلا حساب داخل فرما۔ اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے، مجھ پر رحم کر، میری غلطی معاف کر، اپنی رحمت سے میرے گناہ دور فرما۔ اے سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان۔ اے اللہ! میں تیرا بندہ اور تیرا زائر ہوں، جس کی زیارت کی جائے اس پر حق ہوتا ہے، تو سب سے بہتر زیارت کیا ہوا ہے۔ میں یہ سوال کرتا ہوں کہ مجھ پر رحم کر، اور میری گردن جہنم سے آزاد کر۔

جس طواف کے بعد سعی ہے، اس میں مرد اضطباع کرے، یعنی چادر داہنی بغل کے نیچے سے نکالے کہ داہنا موٹھا کھلا رہے، اور دونوں کنارے بائیں موٹھے سے ڈال دے۔ طواف کی ابتدا یوں کرے رکن یمانی یعنی کعبے کے دکھن جا کر کعبہ کی جانب منہ کر کے اور جتنا ہو سکے کعبے سے قریب ہو کر حجر اسود کے قریب اس طرح کھڑا ہو کہ پورا حجر اسود اس کی داہنے طرف رہے۔ پھر طواف کی نیت کر کے یہ پڑھے:

اللَّهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ طَوَافَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ فَيَسِّرْهُ لِيْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّي .
مسجد حرام میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے طواف کرے۔ ہاں! اگر

جماعت قائم ہو یا فرض یا وتر یا سنت مؤکدہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو پہلے انہیں ادا کرے۔
پھر طواف کرے، طواف کے لیے جب حجر اسود کے قریب پہنچے تو یہ دعا پڑھے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ صَدَقَ وَعْدُهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ لَا
إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.
ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا
وعدہ سچا کیا، اور اپنے بندے کی مدد کی۔ اس نے اکیلے کفار کی جماعتوں کو شکست دی۔ اللہ
کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کے لیے ملک ہے، اور اسی
کے لیے حمد ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

طواف کی نیت کرنے کے بعد کعبہ کی طرف منہ کیے ہوئے اپنی داہنی طرف چلے۔
جب سنگ اسود کے مقابل ہو جائے تو کانوں تک ہاتھ اس طرح اٹھائے کہ ہتھیلیاں حجر اسود
کی طرف رہیں، اور یہ پڑھے:

بِسْمِ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ.
اگر بغیر کسی کو ایذا دیئے ہوئے اور خود کسی خطرے میں پڑے ہوئے بغیر میسر ہو تو حجر
اسود پر اپنی دونوں ہتھیلیاں اور ان کے بیچ میں منہ رکھ کر یوں بوسہ دو کہ آواز نہ پیدا ہو، تین بار
ایسا ہی کرے۔ اور اگر ہجوم کی وجہ سے یہ میسر نہ ہو سکے تو ہاتھ سے چھو کر ہاتھ چوم لو، اور اگر
ہاتھ بھی نہ پہنچ سکے، تو لکڑی سے چھو کر چوم لو یہ بھی نہ ہو سکے، تو ہاتھوں سے اس کی طرف
اشارہ کر کے چوم لے (اسے استلام کہتے ہیں) استلام کے وقت یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي وَطَهِّرْ لِي قَلْبِي وَأَشْرِحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي
أَمْرِي وَعَافِيْنِي فِيمَنْ عَافَيْتَهُ.

ترجمہ: اے اللہ! تو میرے گناہ بخش دے اور میرے دل کو پاک کر دے اور میرے
سینے کو کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے، جن کو تو نے عافیت دی ان لوگوں میں مجھے
عافیت دے۔

یہ دعا پڑھتے وقت کعبہ کے دروازے کی طرف بڑھو۔

اللَّهُمَّ إِيْمَانًا بِكِتَابِكَ وَتَصَدِيقًا بِكَ وَوَفَاءً بِعَهْدِكَ وَاتِّبَاعًا لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ آمَنْتُ بِاللَّهِ وَكَفَرْتُ بِالْحَبِيبِ وَالطَّاغُوتِ .

ترجمہ: اے اللہ! تجھ پر ایمان لاتے ہوئے اور تیری کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے اور تیرے عہد کو پورا کرتے ہوئے اور تیرے نبی محمد ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو اکیلا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں اللہ پر ایمان لایا، بت اور شیطان سے انکار کیا۔

جب تک حجر اسود کے سامنے رہو منہ اس کی طرف رہے، جب اس سے گزر جاؤ خانہ کعبہ کو اپنے بائیں ہاتھ پر لے کر یوں چلو کہ کسی کو ایذا نہ ہو۔

جس طواف کے بعد سعی ہے، اس کے تین پھیروں میں مرد رمل کرے۔ یعنی جلد جلد قریب قدم رکھنا شانے ہلاتا چلے۔ البتہ نہ کودے نہ دوڑے، جہاں ہجوم زیادہ ہو جائے اپنے یا کسی دوسرے کو ایذا کا اندیشہ ہو اتنی دیر رمل چھوڑ دے مگر رکنے نہیں، بلکہ طواف کرتا رہے پھر جب موقع مل جائے تو جتنی دیر تک موقع ملے رمل کرے۔

رمل اور اضطباع صرف اسی طواف میں ہے جس کے بعد سعی ہے۔ اور رمل پہلے کے تین پھیروں میں ہے، بعد کے پھیروں میں نہیں۔ البتہ اضطباع پورے طواف میں ہے۔ طواف کے بعد اضطباع ختم کر دے۔

جب ملتزم کے سامنے آئے، یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ هَذَا الْبَيْتُ وَالْحَرَمُ حَرَمُكَ وَالْأَمْنُ أَمْنُكَ وَهَذَا مَقَامُ الْعَائِدِ بِكَ مِنَ النَّارِ فَأَجِرْنِي مِنَ النَّارِ. اللَّهُمَّ أَلْتَعْنِي بِمَا رَزَقْتَ لِي وَبَارِكْ لِي فِيهِ وَاخْلُفْ عَلَيَّ كُلَّ غَائِبٍ بِخَيْرٍ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.

ترجمہ: اے اللہ! یہ گھر تیرا گھر ہے اور یہ حرم تیرا حرم ہے، اور امن تیرا ہی امن ہے اور یہ جہنم سے تیری پناہ مانگنے کی جگہ ہے، تو مجھ کو جہنم سے بچا، اے اللہ! جو تو نے مجھ کو دیا اس پر مجھے قناعت بخش اور میرے لیے اس میں برکت دے، اور ہر غائب پر خیر کے ساتھ تو خلیفہ ہو جا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا ملک ہے، اسی کے لیے حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جب رکن عراقی کے سامنے آئے تو یہ دعا پڑھے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الشُّكِّ وَالشَّرْكِ وَالشَّقَاقِ وَالنَّفَاقِ وَ سُوءِ الْأَخْلَاقِ وَ سُوءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَالْأَهْلِ وَالْوَالِدِ.

ترجمہ: اے اللہ! میں شک اور شرک اور اختلاف اور نفاق، برے اخلاق اور مال، اہل و اولاد میں واپس ہو کر بری بات دیکھنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ جب میزاب رحمت کے سامنے آئے تو یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ أَظْلِنِي تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِكَ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّكَ وَلَا بَاقِيَ إِلَّا وَجْهُكَ وَأَسْقِنِي مِنْ حَوْضِ نَبِيِّكَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ ﷺ شَرَابًا هَنِيئًا لَا أَظْمَأُ بَعْدَهُ أَبَدًا.

ترجمہ: اے اللہ! مجھے اپنے عرش کے نیچے سایہ عطا فرما، جس دن تیرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، اور تیری ذات کے سوا کچھ باقی نہیں۔ اور مجھے اپنے نبی محمد ﷺ کے حوض سے اتنا پلا کہ اس کے بعد پھر کبھی میں پیاسا نہ ہوں۔

رکن شامی کے سامنے جب آئے تو یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُورًا وَسَعْيًا مُشْكُورًا وَ ذَنْبًا مَغْفُورًا وَ بَعَارَةً لَنْ تَبُورَ يَا عَالِمَ مَا فِي الصُّدُورِ أَخْرِجْنِي مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ.

اے اللہ! اس حج کو مقبول کر اور سعی مشکور کر، اور گناہ کو بخش دے اس کو ایسی تجارت کر دے جس میں خسارہ نہ ہو۔ اے سینوں کی باتیں جاننے والے! مجھ کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکال دے۔

جب رکن یمانی کے پاس پہنچے تو اسے دونوں ہاتھوں یا کم از کم داہنے ہاتھ سے تمرا کا چھوئے۔ ممکن نہ ہو تو یہاں لکڑی سے چھونا یا اشارہ کر کے ہاتھ چومنا نہیں۔ اور یہاں یہ دعا پڑھیں:

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدِّينِ وَالْدُنْيَا وَالْآخِرَةِ.

رکن یمانی سے پورب کی طرف مقام مستجاب ہے، یہاں ستر ہزار فرشتے دعا پر آمین کہتے ہیں، جو چاہو، دعا مانگو، یا دعاے جامع پڑھو، یعنی:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

یہ دعائیں لکھی گئی ہیں، انہیں چلا چلا کر نہ پڑھو آہستہ آہستہ اس طرح پڑھو کہ خود تم سنو دوسرا نہ سنے۔ دعا پڑھنے کے لئے کہیں رکے نہیں۔ طواف کرتے کرتے پڑھتا جائے۔ حجر اسود کے پاس پہنچے تو طواف کا ایک پھیرا ہو گیا پھر استلام کرے، اور حسب تفصیل بالا طواف کے سات پھیرے کرے۔

طواف کے بعد مقام ابراہیم میں آکر یہ آیت کریمہ: **وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلِّئِي** پڑھ کر دو رکعت نماز طواف پڑھے۔ پہلی میں سورہ فاتحہ کے بعد قل یا ایہا الکافرون اور دوسری میں قل هو اللہ احد یہ نماز واجب ہے۔ اگر وقت مکروہ ہے تو بعد میں پڑھے، نماز طواف پڑھ کر یہ دعا مانگے:

اللَّهُمَّ إِنَّكَ تَعْلَمُ مِرِّي وَعَلَانِيَتِي فَأَقْبَلْ مَعْدِرَتِي وَتَعْلَمُ حَاجَتِي فَأَعْطِنِي سُؤْلِي وَتَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي فَأَغْفِرْ لِي ذُنُوبِي اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيمَانًا يُبَاهِرُ قَلْبِي وَيَقِينًا صَادِقًا حَتَّى أَعْلَمَ أَنَّهُ لَا يُصِيبُنِي إِلَّا مَا كَتَبْتَ لِي وَرِضَىٰ مِنَ الْمَعِيشَةِ بِمَا قَسَمْتَ لِي يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ.

اے اللہ! تو میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے تو میرے عذر کو قبول فرما اور تو میری حاجت کو جانتا ہے تو میرے سوال مجھ کو عطا کر اور جو میرے جی میں ہے تو اسے جانتا ہے۔ تو میرے گناہوں کو بخش دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے اس ایمان کا سوال کرتا ہوں جو میرے دل میں بیٹھ جائے اور سچا یقین ماننا ہوں تاکہ میں جان لوں کہ مجھے وہی پہنچے گا جو

تو نے میرے لیے لکھا ہے اور جو تو نے میری قسمت میں کیا ہے، اس پر راضی رہوں، اے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان۔

نماز و دعا سے فارغ ہو کر ملتزم کے پاس آئے اور حجر اسود کے قریب اس سے لپٹے، اپنا سینہ اور پیٹ اور کبھی داہنار خسار اور کبھی پورا چہرہ اس پر رکھے۔ اور دونوں ہاتھ سر سے اونچا کر کے دیوار پر پھیلائے یا داہنا ہاتھ کعبہ کے دروازے کی طرف اور بائیں حجر اسود کی طرف پھیلائے اور یہ دعا پڑھے:

يَا وَاجِدُ يَا مَاجِدُ لَا تَزِلْ عَنِّي نِعْمَةَ أَنْعَمْتَهَا عَلَيَّ .

اے قدرت والے عظمت والے! تو نے جو مجھے نعمت دی ہے، اس کو مجھ سے دور

مت کرنا۔

ملتزم سے لپٹنے سے پہلے نماز طواف، اس طواف کے بعد ہے جس طواف کے بعد سعی ہے اور جس کے بعد سعی نہیں، اس میں نماز سے پہلے ملتزم سے لپٹے پھر جا کر مقام ابراہیم پر نماز طواف پڑھے۔ سعی صرف عمرہ اور حج کے طواف کے بعد ہے۔

اس کے بعد زمزم پر آؤ۔ اگر ہو سکے تو خود ایک ڈول کھینچو ورنہ بھرنے والوں سے لے لو اور کعبہ کی طرف منہ کر کے تین سائوں میں جتنا پی سکو خوب پیٹ بھر کر کھڑے کھڑے پیو۔ بسم اللہ سے شروع کرو، الحمد للہ پر ختم کرو۔ ہر بار کعبہ کی طرف نظر کرو۔ باقی پانی بدن پر ڈال لو یا منہ بدن سب پر، ہر بار کم از کم کچھ پانی ملو، پیتے وقت دعا کرو قبول ہوگی۔ اس وقت کی دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا وَاسِعًا وَعَمَلًا مُتَقَبَلًا وَشِفَاءً مِّنْ

كُلِّ دَاءٍ .

یا وہی جامع دعا:

رَبَّنَا اِنَّا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةٌ اٰخِرَتِكَ پڑھو۔

جب تک وہاں حاضر رہو جتنا ہو سکے زمزم پیو اور ہر بار پیٹ بھر کر پیو۔ اب حکومت نے بیر زمزم تہ خانے میں کر دیا ہے، اور تل لگا دیئے ہیں۔ انہیں تلوں سے پانی چسے، اور کنویں

پر دورعی سے نگاہ ڈال لے۔ اس کے بعد سعی کے لیے پھر حجر اسود کے پاس آؤ اور اس طرح تکبیر وغیرہ کے ساتھ استلام کرو یا اس کی طرف منہ کر کے اللہ اکبر لا الہ الا اللہ والحمد لله اور درود شریف پڑھتے ہوئے باب صفا سے نکل کر صفا کی طرف چلو۔ صفا کی پہلی سیڑھی پر چڑھو، اس سے آگے ہرگز نہ بڑھو۔ سیڑھی پر چڑھنے سے پہلے یہ پڑھو:

أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ .

اس سے شروع جس سے اللہ نے شروع فرمایا۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کے دین کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس لیے جو حج یا عمرہ کرے اس پر ان دونوں کے طواف میں کوئی گناہ نہیں، اب جو شخص نیک کام زیادہ کرے تو اللہ عزوجل بلاشبہ بدلہ دینے والا جاننے والا ہے۔

پہلی سیڑھی پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ موٹوں تک دعا کی طرح پھیلاؤ۔ اتنی دیر تک جتنی دیر میں مفصل کی سورہ یا سورہ بقرہ کی پچیس آیتیں تلاوت کی جائیں، ٹھہرو۔ تسبیح، تہلیل، تکبیر اور درود پڑھو، اپنے لیے اپنے دوستوں، اور دوسرے مسلمانوں کے لیے دعائے خیر کرو، یا دعائے جامع ”ربنا آتنا فی الدنیا حسنة“ پڑھو۔

دعا میں ہتھیلیاں آسمان کی طرف ہوں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو جب تک دعا مانگتا رہے، اٹھائے رہے، جب پوری دعا ختم ہو جائے تو ہاتھ چھوڑ دے پھر سعی کی اس طرح نیت کرے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ السَّعْيَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ فَيَسِّرْهُ لِي وَتَقَبَّلْهُ مِنِّي .

اے اللہ! میں سعی کا ارادہ کرتا ہوں صفا و مروہ کے درمیان، اسے میرے لیے آسان فرما اور میری طرف سے قبول فرما۔

نیت کرتے ہی صفا سے اتر کر مروہ کی طرف چلے۔ درود و ذکر جاری رکھے۔ جب پہلا سبز میل آئے تو وہاں سے دوڑنا شروع کر دے، دوسرے میل تک دوڑنا ہو جائے اس وقت یہ دعا پڑھے:

رَبِّ اغْفِرْ وَاَرْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعَلَّمَ وَتَعَلَّمَ مَا لَا تَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ
 الْاَكْرَمُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مُّبْرُورًا وَسَعْيًا مُشْكُورًا وَذَنْبًا مَغْفُورًا اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ
 وَلِوَالِدِيْ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَا مُجِيبَ الدَّعَوَاتِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ
 السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً
 وَفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

اے پروردگار! بخش اور رحم کر اور درگزر کر اس سے جسے تو جانتا ہے اور تو اسے
 جانتا ہے جسے ہم نہیں جانتے۔ بے شک تو عزت و کرم والا ہے۔ اے اللہ! تو اسے حج مبرور
 کر، اور سعی مشکور کر، اور گناہ بخش۔ اے اللہ! مجھ کو اور میرے والدین اور جمیع مومنین
 و مومنات کو بخش دے۔ اے دعاؤں کے قبول فرمانے والے! اے پروردگار! ہم سے توبہ قبول
 کر بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے، اور ہماری توبہ قبول کر بے شک تو توبہ قبول کرنے
 والا مہربان ہے۔ اے پروردگار! تو ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے
 اور ہم کو عذاب جہنم سے بچا۔

دوسرے میل سے آگے نکل کر یہ دعا پڑھتے ہوئے مروہ تک جاؤ:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ
 وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.

مروہ کی پہلی سیڑھی تک چڑھو۔ اس سے آگے نہ بڑھو، پھر کعبہ کی طرف منہ کر کے
 جیسا صفا پہ کیا تھا کرو، یعنی تسبیح، تکبیر، حمد و ثنا، درود و دعا یہ ایک پھیرا ہوا۔ اسی طرح سات
 پھیرے کرو۔

عمرہ صرف اتنے ہی کا نام ہے۔ یعنی طواف اور سعی اگر وہ ملرد ہو تو اس کے لیے یہ
 طواف قدوم ہوا، وہ حجامت نہ بنوائے، بدستور احرام میں رہے۔ قرآن والا بھی احرام میں
 رہے۔ متمتع حجامت بنوا کر عمرہ کے احرام سے باہر ہو جائے پھر متمتع آٹھویں تاریخ کو حج کا
 احرام باندھے پھر دو رکعت نفل احرام کی نیت سے پڑھے، اس کے بعد حج کی نیت کرے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُرِيْدُ الْحَجَّ فَيَسِّرْهُ لِيْ وَتَقَبَّلْهُ مِنِّيْ نَوِيْتُ الْحَجَّ وَاَحْرَمْتُ بِهٖ

مُخْلِصًا لِلَّهِ تَعَالَى .

پھر لبیک پڑھے، آسانی اسی میں ہے کہ اضطباع کے ساتھ ایک نقل طواف کر لے جس میں رمل بھی کرے۔ طواف کے بعد سعی بھی کرے اب طواف زیارت کے بعد رمل اور سعی نہیں کرنی پڑے گی۔ طواف زیارت کے وقت بھیڑ بہت ہوتی ہے، رمل اور سعی میں دشواری ہوگی۔ آفتاب نکلنے کے بعد منیٰ کو چلے۔ یہ ضروری ہے کہ ظہر کی نماز منیٰ میں پڑھے، جب منیٰ نظر آئے تو یہ دعا پڑھے:

اللَّهُمَّ هَذِهِ مِنِّي فَأَمِّنْ عَلَيَّ بِمَا مَنَنْتَ بِهِ عَلَيَّ أَوْلِيَايَا نِكَ .

الہی! یہ منیٰ ہے مجھ پر وہ احسان فرما جو اپنے اولیا پر تو نے کیا۔

آٹھویں کی ظہر سے لے کر نویں کی صبح تک پانچ نمازیں یہیں پڑھو۔ رات منیٰ میں گزارو، اور اگر اللہ عزوجل توفیق دے تو پوری رات ذکر و عبادت میں گزارے، اس رات میں خاص پڑھنے کی دعا یہ ہے:

سُبْحَانَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ عَرْشُهُ سُبْحَانَ الَّذِي فِي الْأَرْضِ مَوْطِنُهُ
سُبْحَانَ الَّذِي فِي الْبَحْرِ سَبِيلُهُ سُبْحَانَ الَّذِي فِي النَّارِ مُلْطَانُهُ سُبْحَانَ الَّذِي فِي
الْجَنَّةِ رَحْمَتُهُ سُبْحَانَ الَّذِي فِي الْقَبْرِ قَضَاءُهُ سُبْحَانَ الَّذِي فِي الْهَوَاءِ رُوحُهُ
سُبْحَانَ الَّذِي رَفَعَ السَّمَاءَ سُبْحَانَ الَّذِي وَضَعَ الْأَرْضَ سُبْحَانَ الَّذِي لَا مَلْجَأَ
وَمَنْجَأَ مِنْهُ إِلَّا إِلَيْهِ .

پاک ہے وہ جس کا عرش بلندی میں پاک ہے وہ جس کی حکومت زمین میں ہے
پاک ہے وہ کہ جس کا قبضہ سمندر پر ہے پاک ہے وہ کہ آگ میں اس کی سلطنت ہے۔ پاک
ہے وہ کہ جنت میں اس کی رحمت ہے۔ پاک ہے وہ کہ قبر میں اس کا حکم ہے۔ پاک ہے وہ
کہ ہوا میں جو روحیں ہیں اس کی ملک میں ہیں۔ پاک ہے وہ جس نے آسمان کو بلند کیا۔ پاک
ہے وہ جس نے زمین کو پست کیا۔ پاک ہے وہ کہ اس کے عذاب سے پناہ اور نجات کی کوئی
جگہ نہیں، مگر اسی کی طرف۔

اس دعا کو ہزار بار پڑھے۔ اللہ تعالیٰ سے جو مانگے گا پائے گا۔ صبح مستحب وقت میں

نماز فجر پڑھ کر لبیک ذکر اور درود شریف میں مشغول رہو، یہاں تک سورج کوہِ شمیر پر چمکے۔ اس کے بعد عرفات چلو۔ دل کو اللہ عزوجل کی طرف متوجہ رکھو۔ یہ تصور کرو کہ ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ یہ نہ ہو سکے تو یہ تصور باندھ لو کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ کوشش کرو کہ غیر کا خیال دل میں نہ آئے۔ منیٰ سے نکل کر یہ دعا پڑھو۔

اللَّهُمَّ إِلَيْكَ تَوَجَّهْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَلَوْ جِهَكَ الْكَرِيمِ أَرَدْتُ
فَاَجْعَلْ ذَنْبِي مَغْفُورًا وَحُجَّتِي مَبْرُورًا وَارْحَمْنِي وَلَا تَخِينِنِي وَبَارِكْ لِي فِي
مَسْفَرِي وَأَقْضِ بَعْرَفَاتِ حَاجَتِي إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا أَقْرَبُ
غَدْوَةٍ غَدَوْتُهَا مِنْ رِضْوَانِكَ وَأَبْعَدَهَا مِنْ سَخَطِكَ اللَّهُ إِلَيْكَ غَدَوْتُ
وَعَلَيْكَ اعْتَمَدْتُ وَوَجَّهَكَ أَرَدْتُ فَاَجْعَلْنِي بِمَنْ تَبَاهَى بِهِ الْيَوْمَ مَنْ هُوَ خَيْرٌ
مِنِّي وَأَفْضَلُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ وَالْمُعَافَاةَ الدَّائِمَةَ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ.

اے اللہ! میں تیری طرف متوجہ ہوا، اور میں نے تجھ پر بھروسہ کیا، اور تیرے وجہ کریم کا ارادہ کیا۔ میرے گناہ بخش اور میرے حج کو مبرور کر۔ اور مجھ پر رحم کر اور مجھے نقصان میں نہ ڈال اور میرے لیے میرے سفر میں برکت دے، اور عرفات میں میری حاجت پوری کر۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ! میرا چلنا اپنی خوشنودی سے قریب کر اور اپنی ناخوشی سے دور کر، اے اللہ! میں تیری طرف چلا اور تجھی پر بھروسہ کیا اور تیری ذات کا ارادہ کیا تو مجھے ان میں سے کرجن کے ساتھ آج تو مجھ سے مہابات کرے گا، جو مجھ سے بہتر اور افضل ہیں۔ اے اللہ! میں تجھ سے عفو و عافیت کا سوال کرتا ہوں، جو دنیا و آخرت میں ہمیشہ رہنے والی ہے، اور اے اللہ! رحمت نازل فرما بہترین مخلوق محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کی آل و اصحاب پر۔

راستے بھر ذکر و عبادت و دعا کرتا جائے۔ جب جبلِ رحمت پر نظر پڑے اور زیادہ خشوع و خضوع حضور قلب اور ذکر و دعا میں کوشش کرے۔ عرفات میں پہنچ کر اس پہاڑ کے پاس اگر جگہ ملے تو بہتر ورنہ جہاں جگہ ملے ٹھہرے، البتہ بیٹنِ عرنہ میں نہ ٹھہرے۔ دوپہر تک جو وقت ملے جہاں تک ہو سکے رب العالمین کے حضور گریہ و زاری کرے۔ ذکر لبیک، دعا،

استغفار، کلمہ توحید، درود شریف کی کثرت کرے، حسب طاقت صدقات خیرات کرے، اس وقت کی خاص دعا یہ ہے:

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيتُ
وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ .

دوپہر سے پہلے کھانے پینے دیگر ضروریات سے فارغ ہولے۔ دوپہر ڈھلتے ہی مسجد
نمرہ جائے، سنتیں پڑھ کر خطبہ سنے، امام کے ساتھ ظہر پڑھے۔ ظہر کے بعد فوراً عصر کی امامت
ہوگی۔ جماعت سے عصر پڑھے۔ بیچ میں سلام و کلام تو بڑی بات ہے۔ سنتیں بھی نہ پڑھے،
ظہر اور عصر ملا کر پڑھنا اسی وقت جائز ہے کہ نماز امیر الحجاج کے پیچھے جماعت سے پڑھے،
جو ظہر اکیلے پڑھے یا خاص جماعت سے پڑھے اسے وقت سے پہلے عصر پڑھنا جائز نہیں۔
موجودہ امام مقیم ہوتے ہوئے قصر کرتا ہے۔ اس کے پیچھے ہرگز نماز نہ پڑھے۔ نماز
نہ ہوگی، اگرچہ خود یہ مسافر ہو۔

اس کے بعد سارے خیالوں سے دل ہٹا کر صدق دل سے اپنے کریم مہربان رب
کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ میدان قیامت میں حساب اعمال کے لیے اس کے حضور میں
حاضری کا تصور کریں۔ پورے خشوع و خضوع، عاجزی انکساری کے ساتھ لرزتے کانپتے،
ڈرتے، امید کرتے آنکھیں بند کیے گردن جھکائے دست دعا آسمان کی طرف سے اونچا
پھیلائے۔ تکبیر، تہلیل، تسبیح، لبیک، حمد، ذکر، دعا، توبہ و استغفار میں ڈوب جائے، رونے کی
کوشش کرے، جتنا رو سکے، ایک قطرہ آنسو کا نکل گیا تو دلیل قبول ہے، اٹھائے ذکر و دعا لبیک
کی بار بار تکرار کرے۔ آج کے دن کی دعائیں بہت منقول ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ دعائے
جامع: ”ربنا آتنا فی الدنیا حسنة“ بار بار پڑھو۔ اور سب سے آسان اور سب سے بہتر یہ
ہے کہ سارا وقت درود ذکر اور تلاوت قرآن میں گزارو۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
وسیلہ اور حضور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے توسل سے جو جائز بات چاہو مانگو۔

یہ وقوف عرفہ حج کی جان اور اس کا سب سے بڑا رکن ہے۔ وقوف کے لیے کھڑا
رہنا افضل ہے۔ وقوف میں نیت اور رو بہ قبلہ ہونا بھی افضل ہے۔ وقوف سے پہلے غسل کرنا،

حالت وقوف میں باصور ہونا، روزہ نہ رکھنا سنت ہے۔ جب سورج ڈوبنے کا یقین ہو جائے اور رات کا تھوڑا حصہ آجائے تو مزدلفہ چلو، راستہ بھر ذکر، درود شریف، لبیک، زاری و بکا میں مصروف رہو۔ مغرب کی نماز ابھی نہ پڑھو۔ مزدلفہ میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھو:

اللَّهُمَّ هَذَا جَمْعٌ. أَسْأَلُكَ أَنْ تَرْزُقَنِي جَوَامِعَ الْخَيْرِ كُلِّهِ. اللَّهُمَّ رَبَّ
الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ. وَرَبَّ الرُّكْنِ وَالْمَقَامِ. وَرَبَّ الْبَلَدِ الْحَرَامِ. وَرَبَّ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ. أَسْأَلُكَ بِنُورِ وَجْهِكَ الْكَرِيمِ أَنْ تَغْفِرَ لِي ذُنُوبِي. وَتَرْحَمَنِي وَتَجْمَعُ
عَلَيَّ الْهُدَى أَمْرِي. وَتَجْعَلَ لِي زَادِي وَذَخْرِي. وَالْآخِرَةَ مَالِي. وَهَبْ لِي
رِضَاكَ عَنِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. يَا مَنْ بِيَدِهِ الْخَيْرُ كُلُّهُ. أَعْطِنِي الْخَيْرَ كُلَّهُ.
وَاصْرِفْ عَنَّا الشَّرَّ كُلَّهُ. اللَّهُمَّ حَرِّمْ لِحَمِيَّ وَعَظْمِيَّ وَشَحْمِيَّ وَشَعْرِيَّ وَسَائِرَ
جَوَارِحِي عَلَى النَّارِ. يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ.

ترجمہ: اے اللہ! یہ جمع (مزدلفہ) ہے میں تجھ سے تمام خیر کے مجموعہ کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! مشعر الحرام کے رب رکن و مقام کے رب اور عزت والے شہر کے رب اور عزت والی مسجد کے رب! میں تجھ سے بوسیلہ تیرے وجہ کریم کے سوال کرتا ہوں کہ میرے گناہ بخش دے اور مجھ پر رحم کر اور ہدایت پر میرے کام کو جمع کر دے اور تقویٰ کو میرا توشہ اور ذخیرہ کر اور آخرت میرا مرجع کر۔ دنیا اور آخرت میں مجھ سے راضی رہ۔ اے وہ ذات! جس کے قبضہ میں تمام بھلائی ہے، مجھ کو ہر قسم کی بھلائی عطا کر اور ہر طرح کی برائی سے بچا۔ اے اللہ! میرے گوشت اور ہڈی اور چربی اور بال اور تمام اعضا کو جہنم پر حرام کر دے۔ اے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان۔

حتی الامکان جبل قزح کے پاس اترو۔ وہاں جگہ نہ ملے تو جہاں جگہ ملے اترو۔ جب عشا کا وقت ہو جائے تو مغرب اور عشا ایک ساتھ پڑھو خواہ امام کے ساتھ پڑھو یا اپنی خاص جماعت کرو یا اکیلے پڑھو ہر صورت میں یہی حکم ہے۔ (کہ وقت عشا میں مغرب بہ نیت ادا پڑھیں پھر عشا پڑھیں، یہاں دونوں نماز کو ایک ساتھ پڑھنے کے لیے مسجد یا امام کی کوئی شرط نہیں آپ تنہا پڑھیں یا جماعت سے بہر حال دونوں نمازیں عشا کے وقت ایک ساتھ

پڑھیں) مغرب اور عشا کے درمیان سنت اور نوافل نہ پڑھو۔ عشا کے فرض کے بعد مغرب اور عشا کی سنتیں اور وتر پڑھو۔

کوشش کرو کہ پوری رات عبادت میں بسر ہو اور اگر سونا ہے تو با وضو سوؤ۔ صبح صادق سے اتنے پہلے اٹھو کہ ضروریات وغیرہ سے فارغ ہو کر وضو کر لو۔ بہت اندھیرے میں فجر کی نماز پڑھو۔

اب اس کے بعد دربار اعظم کی حاضری کا دوسرا وقت آیا۔ اگر مشعر حرام (یہ ایک پہاڑ ہے اسے جبل قزح بھی کہتے ہیں۔ اب وہاں اس نام کی ایک مسجد بھی بنا دی گئی ہے۔ ”مسجد مشعر الحرام“) میں جگہ ملے فیہا نہیں تو اس کے دامن میں۔ وہاں بھی جگہ نہ ملے تو وادیٰ محسر (وادیٰ محسر منیٰ اور مزدلفہ کے بیچ میں واقع ہے اور یہ ان دونوں کی حدود سے خارج ہے۔ یہاں اصحاب فیل پر عذاب نازل ہوا تھا یہاں ٹھہرنا جائز نہیں) چھوڑ کر اسی طرح جیسے عرفات میں کیا تھا یہاں بھی کرو یہیں سے چھوٹی چھوٹی کھجور کی کھٹلی کے برابر کم از کم ۴۹ کنکریاں پاک جگہ سے لے کر تین بار دھولو (مزدلفہ میں وقوف کا اصلی وقت صبح صادق سے لے کر اجالا ہونے تک ہے لہذا جو اس وقت کے بعد پہنچا یا بغیر عذر کے صبح صادق سے پہلے مزدلفہ چھوڑ کر چلا گیا تو کفارہ کی قربانی لازم ہوگی۔ بیمار، ضعیف مجبوراً وقت سے پہلے منیٰ چلے گئے تو دم واجب نہیں مگر کچھ صدقہ و خیرات کر دینا چاہئے)

جب آفتاب نکلنے میں دو رکعت پڑھنے کا وقت باقی رہ جائے تو منیٰ کی طرف کوچ کرو۔ راستے میں بدستور ذکر، دعا، درود شریف، لبیک کی کثرت کرو، اور یہ دعا پڑھو۔

اللَّهُمَّ إِلَيْكَ الْفُضْتُ وَمِنْ عَذَابِكَ أَسْفَقْتُ وَإِلَيْكَ رَجَعْتُ وَمِنْكَ رَهْبْتُ فَاقْبَلْ نُسُكِي وَعَظْمِ اجْرِي وَارْحَمْ تَضْرِعِي وَاقْبَلْ تَوْبَتِي وَاسْتَجِبْ دُعَائِي.

اے اللہ! تیری طرف واپس ہوا، اور تیرے عذاب سے ڈرا، تیری طرف رجوع کی، اور تجھ سے خوف کیا، میری عاجزی پر رحم کر، اور میری توبہ قبول کر، اور میری دعا قبول کر۔

مزدلفہ سے کم از کم ۴۹ کنکریاں لے، اور اگر تیرہویں ذوالحجہ کو بھی منیٰ میں قیام کا ارادہ ہو تو ستر (۷۰) کنکریاں لے۔ احتیاطاً کچھ زیادہ لے لے۔ مزدلفہ سے منیٰ پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی تو اسی وقت رمی کرے۔ دسویں کی رمی کا وقت طلوع فجر سے گیارہویں کی فجر تک ہے مگر سنت یہ ہے کہ طلوع آفتاب سے زوال تک ہو۔ اور زوال سے غروب تک مباح اور غروب سے فجر تک مکروہ۔ یوں ہی دسویں کی فجر سے طلوع آفتاب تک مکروہ۔ لیکن اگر کسی عذر کی وجہ سے دن میں رمی نہ کر سکا، رات میں کر لی تو مکروہ نہیں۔ مریض یا اتنا کمزور جو جمرہ تک نہ جاسکتا ہو وہ کسی دوسرے کو حکم دے سکتا ہے کہ اس کی طرف سے رمی کر دے۔ یہ دوسرا شخص پہلے اپنی طرف سے رمی کرے پھر اس کی طرف سے کرے۔ اگر کوئی خواہ مرد ہو یا عورت رمی چھوڑے دے گا تو اس پر کفارہ کے طور پر ایک بکری یا بھیڑ یا دنبہ کی قربانی واجب ہے۔

جب منیٰ پہنچے، سب سے پہلے جمرۃ العقبہ پر جا کر کنکری مارے۔ کنکری مارتے وقت یوں کھڑا ہو کہ منیٰ داہنے ہاتھ پر اور کعبہ بائیں ہاتھ پر اور جمرہ کی طرف منہ ہو۔ سات کنکری الگ الگ چٹکی میں لے کر داہنا ہاتھ خوب اٹھا کر کہ بغل کی رنگت ظاہر ہو رہی ہو رمی کرے۔ ہر کنکری مارتے وقت یہ پڑھے:

بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَرَغْمًا لِلشَّيْطَانِ وَرِضَىٰ لِلرَّحْمٰنِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَّبْرُورًا وَسَعْيًا مَّشْكُورًا وَذَنْبًا مَّغْفُورًا۔

اللہ کے نام سے مارتا ہوں اللہ بہت بڑا ہے۔ شیطان کو ذلیل کرنے کے لیے، رحمن کو راضی کرنے کے لیے۔ اے اللہ! اس کو حج مبرور کر اور سعی مشکور کر اور گناہ بخش دے۔ یہ دعا نہ یاد ہو تو صرف بسم اللہ اکبر کہہ کر مارے پہلی ہی کنکری مارتے بیک بند کر دے اور کنکری مارتے وقت ہی وہاں سے چل دے۔

اس کے بعد قربانی کرے۔ قربانی کے بعد قبلہ رو ہو کر مرد سر منڈوائیں، اور عورتیں بال کتروائیں۔

افضل یہ ہے کہ دسویں ہی کو ورنہ گیارہویں یا بارہویں کو طواف زیارت کے لیے مکہ حاضر ہو، یہ فرض ہے۔

اگر حج کے احرام کے بعد طواف نفل میں جو رمل اور سعی یا صرف سعی کر چکا ہے تو اس طواف میں رمل و سعی کچھ نہیں، ورنہ ہے۔

گیارہویں تاریخ کو بعد نماز ظہر پھر کنکری مارنے چلو۔ آج تینوں جمروں پر کنکری ماری جائے گی۔

اسی طرح بارہویں کو بھی۔ افضل یہ ہے کہ تیرہویں کو بھی دوپہر بعد رمل کرے۔ لیکن اگر حج بارہویں کو چلے گئے تو کوئی حرج نہیں۔ واپسی کے وقت طواف و داع کرے۔ اس میں نہ اضطباع ہے، نہ رمل نہ سعی۔ اس طواف کے بعد دروازہ کعبہ کے سامنے کھڑا ہو کر چوکھٹ کو بوسہ دے۔ اور حج و زیارت قبول ہونے اور بار بار حاضری کی توفیق کی دعا مانگے۔

السَّائِلُ بِبَابِكَ يُسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ وَمَعْرُوفِكَ وَيَرْجُو رَحْمَتَكَ.

تیرے دروازے پر سائل تیرے فضل و احسان کو مانگتا ہے، اور تیری رحمت کا امیدوار ہے۔ یا دعائے جامع پڑھے۔

پھر ملتزم پر آ کر غلاف کعبہ تمام کر اسی طرح لپٹو ڈکرا اور دعا کی کثرت کرو، اس وقت یہ دعا پڑھو۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ . اللَّهُمَّ
كَمَا هَدَيْتَنَا لِهَذَا فَتَقَبَّلْهُ مِنَّا وَلَا تَجْعَلْ هَذَا آخِرَ الْعَهْدِ مِنْ بَيْتِكَ الْحَرَامِ
وَارْزُقْنِي الْعَوْدَ إِلَيْهِ حَتَّى تَرْضَى بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ
الْعَالَمِينَ وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ
أَجْمَعِينَ.

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں ہدایت دی۔ اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت نہ پاتے۔ اے اللہ! جس طرح تو نے اس کی ہدایت دی، اسی طرح تو اسے قبول فرما، اور بیت اللہ شریف کی یہ ہماری آخری حاضری نہ کر اور اس کی طرف لوٹنا ہمیں نصیب کر حتیٰ کہ اپنی رحمت کے سبب ہم سے راضی ہو جا۔ اے سب مہربانوں سے زیادہ مہربان، اور سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اور اے اللہ! درود

بھیج ہمارے سردار محمد اور ان کی آل و اصحاب پر۔

پھر حجر اسود کو بوسہ دو، اور جو آنسو رکھتے ہو گراؤ، اور یہ پڑھو:

يَا اَمِيْنَ اللّٰهُ فِى اَرْضِهِ اِنِّى اُشْهِدُكَ وَ كَفَى بِاللّٰهِ شَهِيدًا اِنِّى اُشْهِدُ اَنْ لَا
اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنْ سَيِّدِنَا مُحَمَّدًا رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَاَنَا اُوْدَعُكَ هَذِهِ الشَّهَادَةَ لِتَشْهَدَنِي
بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَفِى يَوْمِ الْقِيَامَةِ يَوْمَ الْفُرْعِ الْاَكْبَرِ اَللّٰهُمَّ اِنِّى اُشْهِدُكَ عَلَى
ذٰلِكَ وَاُشْهِدُ مَلَائِكَتِكَ الْكِرَامَ . وصى الله تعالى على سيدنا محمد وآله
وصحبه اجمعين .

اے زمین میں اللہ کے امین! میں تجھے گواہ بناتا ہوں اور اللہ کی گواہی کافی ہے کہ
میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ کے
رسول ہیں۔ اور میں تیرے پاس اس شہادت کو امانت رکھتا ہوں کہ اللہ کے حضور قیامت کے
جس دن بڑی گھبراہٹ ہوگی، تو میرے لیے اس کی شہادت دے گا۔ اے اللہ! میں تجھے
اور تیرے عزت والے فرشتوں کو گواہ بناتا ہوں، اے اللہ! درود بھیج ہمارے سردار محمد اور ان کی
آل و اصحاب پر۔

پھر اٹنے قدم کعبہ کی طرف منہ کر کے مسجد سے باہر آؤ اور اگر اٹنے قدم چلنے
میں دشواری ہو تو بار بار مڑ کر کعبہ کو حسرت سے دیکھتے رہو۔ اس کی جدائی پر روتے یا کم از
کم رونے والے جیسا حال بناتے ہوئے مسجد کریم کے دروازے سے بائیں پاؤں پہلے بڑھا
کر نکلو اور اس وقت کی دعا پڑھو۔ اس وقت نکلنے کے لیے سب سے بہتر باب الحزورہ ہے۔

ہندوستان و پاکستان کی میقات

جب سے ہندوستانی حج کر رہے ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک اسی پر فتویٰ
دیا جاتا ہے کہ ”کوہ یلملم“ ہندوستانیوں کی میقات ہے، اسی پر ہمیشہ سے عمل در آمد ہوتا چلا
آ رہا ہے۔ اسی کے مطابق جہاز والے اعلان بھی کرتے ہیں۔ مگر اب چند سالوں سے کچھ
لوگوں نے اپنے ذہن سے یہ نکال لیا ہے کہ ہندوستانیوں کی میقات ”بحرہ“ ہے، جو جدہ

اور مکہ معظمہ کے درمیان ہے۔ اسی کے مطابق یہ لوگ جہاز میں احرام نہیں باندھتے بلکہ جدہ پہنچ کر باندھتے ہیں۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ جو شخص میقات سے نہ گزرے کچھ فاصلے سے گزرے تو اس کی میقات راستے کا وہ مقام ہے جو میقاتوں کے درمیان دونوں میقاتوں میں سے کسی ایک کی محاذ (سیدھ) میں ہو۔ جدہ دو میقاتوں یعنی جھہ اور یلملم کے درمیان ہے، جب یلملم سے جھہ تک خط کھینچتے ہیں تو یہ خط بحرہ پر گزرتا ہے، اس لیے ہندوستانیوں کی میقات ”بحرہ“ ہوئی۔ اتنی بات تو مسلم ہے کہ دو میقاتوں کے درمیان گزرنے والے کی میقات دونوں میں سے کسی ایک کی محاذات ہے۔

عالم گیری میں ہے:

كُلُّ مَنْ قَصَدَ مَكَّةَ مِنْ طَرِيقٍ غَيْرِ مَسْلُوكِ أَحْرَمَ إِذَا حَاضِيَ مِيقَاتًا مِنَ الْمَوَاقِيتِ وَإِنْ سَلَكَ بَيْنَ الْمِيقَاتَيْنِ فِي الْبَحْرِ أَوْ الْبَرِّ اجْتَهَدَ وَأَحْرَمَ إِذَا حَاضِيَ مِيقَاتًا مِنْهُمَا وَأَبْعَدَهُمَا أَوْلَى .

جو ایسے راستے سے مکہ جانا چاہے جو چالونہ ہو تو وہ کسی بھی میقات کی سیدھ میں پہنچے احرام باندھ لے جو دو میقاتوں کے درمیان چل رہا ہے، خواہ سمندر میں ہو خواہ خشکی میں تو وہ کوشش کر کے معلوم کرے اگر کسی میقات کی سیدھ میں پہنچ گیا تو احرام وہیں باندھ لے۔ اور ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ محاذات سے مراد حرم کی طرف جاتے ہوئے محاذات ہے۔ یعنی جانے والا جب کعبہ کا رخ کرے تو میقات اس کے داہنے ہاتھ یا بائیں ہاتھ پڑے، اور یہ بھی تسلیم ہے کہ یلملم سے جھہ تک جب خط مستقیم کھینچا جائے گا تو وہ ”بحرہ“ پر گزرے گا، مگر ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ بحرہ، یلملم جھہ کے محاذی ہے، جھہ کی بات کرنا تو یہاں خارج از بحث ہے۔ اعتباراً قریب ترین میقات کا ہے۔ بحرہ سے قریب یلملم ہے، اس کو سامنے رکھ کر بحث کرنی ہے۔ یلملم مکہ سے تقریباً سو کلومیٹر ہے اور جدہ تقریباً ۷۵ کلومیٹر، بحرہ جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان ہے، تو اس کا فاصلہ ۳۵-۴۰ کلومیٹر سے زائد نہ ہوگا۔ اب ہر شخص سوچے کہ جو مقام مکہ معظمہ سے سو کلومیٹر دور ہے، اس کے محاذی وہ مقام کیسے ہو سکتا ہے، جو مکہ معظمہ سے

صرف ۴۰ کلومیٹر دور ہو۔ اس کے محاذی وہ جگہ ہوگی جو مکہ معظمہ سے سو کلومیٹر کی دوری پر ہو۔ اس میں لم یہ ہے کہ زمین کروئی گیند کی شکل کی ہے۔ محاذات کے لیے اس پر جو خط کھینچا جائے گا وہ مستقیم نہیں کماندار ہوگا۔ اب جس کا جی چاہے نقشہ بنا کر کعبہ کو مرکز بن کر پرکار کے ایک سرے کو کعبہ پر اور دوسرے کو یلملم پر رکھ کر خط کھینچے تو اسے معلوم ہوگا کہ جدہ سے بھی ۲۵ کلومیٹر دور سمند میں یلملم کی سیدھ پڑے گی، جس کے آگے کوئی احرام باندھے بغیر آئے گا، تو اس پر دم لازم آئے گا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ جو شخص جدہ احرام باندھے بغیر اترے گا، خواہ وہ پانی کے جہاز سے خواہ ہوائی جہاز سے اس پر دم لازم آئے گا۔

رہ گئی یہ بات کہ پھر اس پر عمل درآمد کیوں ہے کہ جب جہاز یلملم کے سیدھے دھن جانب پہنچ جاتا ہے تو علماء احرام باندھنے کا حکم دیتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جہاز جب جدہ بندرگاہ کے قریب پہنچ جاتا ہے تو جہاز میں ایک ہفتہ سے مقید حجاج اترنے کے لیے اپنا بستر باندھنے سامان سمیٹنے میں مشغول ہو جاتے ہیں، اس وقت احرام باندھنے کا موقع کہاں رہتا ہے، اور میقات سے پہلے احرام باندھنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ بہتر ہے۔ اس لیے حجاج کی آسانی کے لیے کچھ پہلے ہی احرام باندھنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ حجاج پر لازم ہے کہ اس کا خیال رکھیں، اور جدہ پر ہرگز ہرگز احرام کے بغیر نہ اتریں۔ بلکہ عام حجاج کے ساتھ جب جہاز میں احرام کے لیے بیٹھی ہو، احرام باندھ لیں اور اس نئی ایچ پر دھیان نہ دیں ورنہ ان پر دم لازم ہوگا، گناہ الگ ہوگا، اور دم نہ دیں تو وہ ذمہ میں رہ جائے گا۔

نماز سفر

(۱) اگر آپ کے وطن سے دہلی یا جہاں سے آپ کو ہوائی جہاز یا بحری جہاز ملے وہ ۹۲ کلومیٹر کی دوری پر ہے، تو اپنی آبادی سے نکلنے کے بعد ظہر، عصر، عشا میں قصر کریں۔ یعنی فرائض بجائے ۴ رکعت کے صرف ۲ پڑھیں۔ فجر و مغرب میں قصر نہیں۔ ان کے فرائض پورے پڑھیں۔ اسی طرح سنتوں میں بھی قصر نہیں۔ اگر موقع ہو تو پوری پڑھیں ورنہ

معاف ہیں۔

(۲) بمبئی، دہلی، مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ، جہاں بھی جائیں، اگر وہاں مسلسل پندرہ دن یا زائد ٹھہرنے کی نیت ہو، پندرہ دن کے اندر اندر کہیں ۹۲ کلومیٹر کی دوری پر نہ جانا ہو تو قصر نہ کریں۔ پوری نمازی پڑھیں، اور اگر پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت ہو تو قصر کریں۔

(۲) کہیں بھی ٹھہرنے کے بعد اگر ۹۲ کلومیٹر کی دوری پر سفر کرنا ہو تو راستے میں قصر ہے خواہ پندرہ دن یا زائد رک کر سفر شروع کیا ہے، خواہ کم رکا ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر پندرہ دن ٹھہرنے کے بعد سفر شروع کیا ہے تو جب تک آبادی سے باہر نہ نکل جائے قصر جائز نہیں۔ اگر پندرہ دن سے کم میں سفر شروع کیا ہے تو آبادی میں بھی قصر ہے۔

(۳) مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد اگر ۸ روزی الحجہ پندرہ دن یا اس سے زائد ہے تو پوری نماز پڑھیں۔ مکہ میں بھی اور منیٰ عرفات مزدلفہ میں بھی، اور اگر پندرہ دن سے کم ہے تو مکہ معظمہ میں بھی قصر کریں۔ اور منیٰ عرفات مزدلفہ ہر جگہ، اگر چہ بعد حج مکہ معظمہ پہنچنے سے وطن واپس ہونے کی تاریخ ۱۵ اردن بعد ہو۔

در مختار جلد اول ص: ۵۵۲ پر ہے:

فلو دخل الحاج مكة ايام العشر لم تصح نيته لانه يخرج منى وعرفة

فصار كنية الاقامة في غير موضعها وبعد عوده من منى تصح .

اگر حج کرنے والا مکہ میں ذوالحجہ کے پہلے عشرہ میں پہنچا تو اس کی اقامت کی نیت درست نہیں اس لیے کہ وہ منیٰ اور عرفات میں جائے گا، تو گویا نیت ایسی ہوئی جیسے کوئی ایسی جگہ اقامت کی نیت کرے جو اقامت کے لائق نہیں، منیٰ سے واپسی کے بعد اقامت کی نیت صحیح ہے۔

(۵) مکہ معظمہ ایسے وقت پہنچا کہ ذوالحجہ کی ۸ تاریخ ۱۵ اردن بعد تھی۔ اس لیے وہ

مکہ معظمہ پندرہ دن قیام کر کے منیٰ آیا۔ تو منیٰ، عرفات، مزدلفہ ہر جگہ پوری نماز پڑھے۔ پھر حج سے فراغت کے بعد مکہ معظمہ آیا، اور اب ۱۵ اردن سے کم رہنے کا ارادہ ہے تو بھی مقیم ہی ہے، قصر نہ کرے پوری نماز پڑھے۔

(۶) مسافر پر فرض ہے کہ قصر کرے اسے پوری پڑھنا جائز نہیں۔ اگر پوری پڑھے

گا تو گنہ گار ہوگا۔ (حدیث)

(۷) مسافر پر قصر اس وقت ہے کہ جب کہ وہ تنہا پڑھے۔ یا مسافر امام کے پیچھے پڑھے اور جب مقیم امام کے پیچھے پڑھے تو پوری پڑھے اور اگر مسافر نے ایسے مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھی جو قصر کرتا ہے تو مسافر کی نماز نہ ہوگی۔ جیسے منی، عرفات اور مزدلفہ میں موجودہ امام ہیں کہ مقیم ہوتے ہوئے قصر کرتے ہیں، ان کے پیچھے ہرگز نماز نہ پڑھیں۔ نماز نہیں ہوگی، نہ مسافر کی نہ مقیم کی۔

طواف کے مسائل

(۱) عازمین حج کو دیکھا گیا ہے کہ وہ احرام باندھتے ہی اضطباع کر لیتے ہیں۔ یعنی چادر اپنی بغل سے نکال کر اس کے دونوں کنارے بائیں مونڈھے پر ڈال لیتے ہیں، اور اسی طرح نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اضطباع کے ساتھ نماز پڑھنے سے نماز مکروہ تحریمی واجب الاعادہ ہوتی ہے۔ اضطباع صرف اس طواف میں مسنون ہے جس کے بعد سعی ہے۔ وہ بھی صرف اسی وقت تک جب تک طواف کر لے۔ طواف ختم ہوتے ہی اضطباع ختم کر کے چادر عادت کے مطابق دونوں شانوں پر ڈال لیں۔ سعی کی حالت میں اضطباع نہیں۔

(۲) بہت سے حجاج رکن شامی و عراقی کا بوسہ دیتے ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ رکن یمانی پر صرف دونوں ہاتھ یا داہنا ہاتھ رکھ کر بوسہ دیں۔ اور اگر بھینڑ کی وجہ سے میسر نہ آئے تو ہاتھ سے اشارہ کر کے ہاتھ چومنے کی بھی یہاں ضرورت نہیں۔

(۳) طواف کے لیے باب السلام سے داخل ہونا مسنون ہے۔ باب السلام کعبہ شریف کے پورب مظاف کے کنارے تھا۔ اب موجودہ حکومت نے اسے اٹھا دیا ہے۔ وہاں سیاہ پتھر کے نشان بنا دیئے ہیں۔ عام حجاج کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔ حجاج کو چاہیے کہ کعبہ کے پورب اس کو تلاش کر لیں۔

(۴) عام حجاج کو معلوم نہیں ہوتا کہ باب الصفا کہاں ہے؟ بعض ناواقف مردہ سے سعی شروع کر دیتے ہیں۔ اگر مردہ سے سعی شروع کی جائے گی تو یہ پھیرا لخوا ہوگا، شمار نہ ہوگا۔

محنت بھی رایگاں جائے گی۔ حجاج کو چاہیے کہ سعی کے لیے حجر اسود کا استلام کر کے سیدھے کونے پر مسجد حرام کے دِلان میں آئیں۔ حجر اسود کی سیدھ میں مسجد حرام سے باہر نکلنے کا جو دروازہ ہے وہی باب الصفا ہے، اس سے نکلنے ہی صفا ہے۔

(۵) چوں کہ حجامت کی بنوائی وہاں ان دنوں ۵ دریاں ہو جاتی ہے یعنی ہندوستانی روپے سے ۲۱ روپے۔ اس لیے بہت سے بخیل اپنے آپ قینچی سے چند بال کے کچھ حصے کاٹ لیتے ہیں، اور احرام کھول دیتے ہیں۔ اس لیے احرام سے باہر آنے کے لیے بہتر یہی ہے کہ پورا سر منڈوالیں، اور منڈوانا منظور نہ ہو تو پورے سر کے بالوں سے ایک انگلی کے پور کے برابر کتریں، یہ مستحب ہے۔ یا کم از کم چوتھائی بالوں کو انگلی کے پور کے برابر ضرور کاٹیں۔ اگر چوتھائی سر کے بال کتریں تو ایک پور سے زائد کتریں۔ بال چھوٹے بڑے ہوتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ چھوٹے بال ایک پور سے کم کر دیئے جائیں یہ واجب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اپنے ہاتھ سے سر موٹ لیں، یا اس کا وہ جس کی حجامت نہیں بنی ہے سر موٹ دے یا کتر دے۔ (بہار شریعت بحوالہ منک)

رمی کے مسائل

(۱) سب سے زیادہ حجاج کنکری مارنے میں غفلت کرتے ہیں۔ کچھ لوگ دور سے کنکری مارتے ہیں۔ جو ادھر ادھر چلی جاتی ہے، بہتر تو یہی ہے کہ کنکری (جرہ) ستون پر لگے، ورنہ یہ ضروری کہ زیادہ سے زیادہ جرہ سے تین ہاتھ کے فاصلے پر گرے۔ اگر تین ہاتھ سے زائد کے فاصلے پر گرے گی تو وہ شمار میں نہیں آئے گی۔

(۲) معمولی عذر کی وجہ سے دوسروں سے کہہ دیتے ہیں کہ ہماری طرف سے بھی کنکری مار آنا۔ جن کے ساتھ عورتیں ہوتی ہیں وہ از خود عورتوں کے وکیل بن جاتے ہیں۔ حالاں کہ یہی عورتیں مکے کے بازاروں میں گھنٹوں دھکے کھاتی پھرتی ہیں۔ صرف ایسے مریض اور کمزور کی طرف سے دوسرے کو کنکری مارنا درست ہے جو سواری پر بھی جرہ نہیں جاسکتا۔ فقہانے لکھا ہے کہ کوئی اتنا کمزور ہے کہ جرہ پر پہنچ گیا اور خود کنکری مارنے کی قوت

نہیں رکھتا تو اس کا ساتھی مریض کے ہاتھ پر کنکری رکھ کر رمی کرادے۔ ایسی صورت میں وہ مرد اور وہ عورتیں جو سامان خریدنے کے لیے مکہ معظمہ کے بازاروں میں دھکے کھانے کی قوت رکھتی ہیں، انہیں یہ کب درست ہوگا کہ وہ خود کنکری نہ ماریں، دوسروں کو وکیل کریں۔ ایسے لوگ ضرور رمی کے تارک ہوں گے اور ان پر دم واجب ہوگا۔ دسویں تاریخ کو ۹ بجے تک کوئی خاص بھیڑ نہیں ہوتی ہے۔ آسانی سے رمی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح بعد عصر بھی بھیڑ بہت کم ہوتی ہے اور رات میں جمرہ بالکل خالی رہتا ہے، بالفرض دن بھر بھیڑ میں دبنے کچلنے کا اندیشہ ہے تو کمزور مرد اور عورتیں رات میں کنکری ماریں۔ عذر کی بنا پر رات میں کنکری مارنے میں کوئی کراہت نہیں۔ اس سے یہی نہ ہوگا کہ دسویں کو قربانی نہ ہو سکے گی، احرام نہ کھل سکے گا، طواف زیارت نہ ہو سکے گا، مگر اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور بلا عذر شرعی خود کنکری نہ مارنا دوسرے سے رمی کرانا جرم ہے جس پر گناہ بھی ہے، اور دم بھی۔ یہی گیارہویں اور بارہویں کو کریں، بارہویں کو اگر مکہ معظمہ واپسی کا ارادہ ہے تو بعد عصر کنکری ماریں۔

(۳) بعض حجاج بارہویں کو قبل زوال کنکری مار کر مکہ معظمہ چل دیتے ہیں۔ یہ اصل

مذہب حنفی کے خلاف ہے۔ اور ایک ضعیف روایت ہے اس پر عمل جائز نہیں۔ (لہذا گیارہ بارہ ذی الحجہ کو زوال آفتاب سے پہلے رمی کر لی تو رمی نہ ہوئی اس کا اعادہ اسی دن ضروری ہے۔ اگر اس دن اعادہ نہ کریں گے تو دم واجب ہوگا)

(طواف زیارت فرض ہے اگر دسویں کو موقع نہ مل سکے تو بارہویں کی مغرب سے پہلے کر لیں ورنہ دم واجب ہوگا۔ عورتوں کے لیے بھی طواف زیارت فرض ہے لیکن اگر حیض و نفاس کی وجہ سے بارہویں تک نہ کر سکیں تو ان پر دم لازم نہیں آئے گا۔ جب بھی پاک ہوں طواف زیارت کر لیں۔ حیض و نفاس میں عورتیں نماز، تلاوت، طواف نہیں کر سکتیں ہاں منی، عرفات، مزدلفہ جانا اور رمی کرنا اسی حالت میں جائز ہے)

قرآن کا بیان

نیت کے بیان میں گزر چکا ہے کہ حج کی تین قسمیں ہیں۔ تمتع، قرآن، افراد، چوں

کہ عام طور پر لوگ تمتع ہی کرتے ہیں اس لیے ہم نے تمتع کے احکام مفصل بیان کر دیئے مگر ضرورت اس کی بھی ہے کہ دوسرے اقسام کے احکام بھی مختصر طور سے بیان کر دیئے جائیں۔ قرآن کے معنی ملانے کے ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ حج و عمرہ کے ساتھ ملا کر ادا کیا جائے۔ قرآن کرنے والا نماز احرام کے بعد یہ نیت کرے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَيَسِّرْهُمَا لِي وَتَقَبَّلْهُمَا مِنِّي نَوَيْتُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ تَعَالَى .

”اے اللہ! میں نے حج اور عمرہ دونوں کی نیت کی ان دونوں کو میری طرف سے قبول فرما۔ میں نے اللہ عزوجل کے لیے حج اور عمرے کی نیت کی۔“

قارن مکہ معظمہ پہنچ کر پہلے عمرہ کرے یعنی عمرے کا طواف اضطباع اور رمل کے ساتھ اور صفا و مردہ کی سعی کرے مگر حجامت نہ بنوائے نہ احرام کھولے اور وقوف عرفہ سے پہلے حج کے لیے ایک اور طواف کرے جسے طواف قدوم کہتے ہیں اگر طواف زیارت والی سعی اسی طواف کے ساتھ کرنا چاہے اور اسی میں آسانی ہے تو اس طواف میں اضطباع بھی کرے اور رمل بھی۔ اور اگر افضل پر عمل کرنا چاہے تو ابھی سعی نہ کرے اس صورت میں اس طواف میں نہ اضطباع ہے نہ رمل۔

جب طواف زیارت کرے تو اس میں اضطباع اور رمل کرے اس کے بعد سعی کرے۔ طواف قدوم کے بعد بھی حجامت نہ بنوائے نہ احرام کھولے۔ احرام باندھے ہوئے مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے نفل طواف جتنا چاہے کرے مگر عمرہ نہیں کر سکتا۔ آٹھویں تاریخ کو اسی احرام کے ساتھ منیٰ جائے اور تفصیل بالا کے مطابق حج کے تمام ارکان ادا کرے۔ دس کوری جمرہ کے بعد قربانی کرے اس پر بھی قربانی واجب ہے پھر حجامت بنا کر احرام کھولے پھر طواف زیارت کرے۔ جس جرم کی وجہ سے تمتع کرنے والے پر ایک دم ہے قارن پر دو۔

افراد کا بیان

افراد کے معنی ہیں تنہا کرنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ حج کے ساتھ عمرہ نہ کرے صرف حج

کرے۔ احرام کی نیت یوں کرے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أُرِيدُ الْحَجَّ فَبَسْرَةَ لِي وَتَقَبَّلُهُ مِنِّي فَوَيْتُ الْحَجَّ لِلَّهِ تَعَالَى
 ”اے اللہ! میں حج کا ارادہ کرتا ہوں تو میرے لیے اسے آسان فرما اور میری طرف سے قبول فرما میں نے اللہ کے لیے حج کی نیت کی۔“

صرف حج کرنے والے کو مفرد کہتے ہیں یہ مکہ معظمہ پہنچ کر حج کے لیے طواف قدوم کرے چاہے تو اسی کے بعد سعی بھی کرے اس صورت میں اس طواف میں اضطباع اور رمل کرے اور اگر طواف زیارت کے بعد سعی کرنا چاہتا ہے تو اس میں اضطباع ہے نہ رمل مگر طواف زیارت میں اضطباع اور رمل ضروری ہوگا اور اس کے بعد طواف قدوم سے فارغ ہو کر نہ حجامت بنوائے نہ احرام کھولے بدستور احرام باندھے رہے۔ آٹھویں ذوالحجہ کو اسی احرام کے ساتھ منیٰ جائے اور حج کرے۔ دسویں کو کنکری مار کر احرام کھول دے اور طواف زیارت کرے۔ اس پر قربانی واجب نہیں مگر مستحب ہے۔ اگر کرے گا بہت ثواب پائے گا نہیں کرے گا تو کوئی گناہ نہیں مفرد بھی حج سے فراغت کے پہلے عمرہ نہیں کر سکتا۔

مکہ معظمہ کے چند متبرک مقامات

غار حرا:

ان میں سب سے اہم غار حرا ہے جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل نبوت مدت دراز تک اور بعد نبوت بھی عبادت فرمائی ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اسی حالت میں اب بھی ہے اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے اس لیے اس کی زیارت کو ضرور حاضر ہو۔ وہاں حاضر ہو کر اس یقین کے ساتھ دو رکعت نفل ادا کرے کہ یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اقدس ضرور مس ہوا ہے بلکہ پیشانی بھی مس ہوئی ہے۔ یہ مبارک غار مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر منیٰ جاتے ہوئے بائیں ہاتھ جبل نور میں ہے۔ اسی جبل نور پر وہ متبرک جگہ بھی ہے جہاں شق صدر ہوا تھا۔

غار ثور:

یہ وہ مقدس غار ہے جس میں حضور اقدس ﷺ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہجرت کے موقع پر تین دن تین راتیں قیام فرمایا تھا اور اب بھی اسی حالت میں ہے اس لیے یقین ہے کہ اس کی زمین، اس کے درود پوار ضرور ان حضرات کے جسم مبارک سے مس ہوئے ہیں۔ یہ غار ثور مکہ معظمہ سے قریب قریب پانچ کلومیٹر دکن جانب ہے۔ اس کی بلندی بھی تقریباً ڈھائی کلومیٹر ہے۔

جنت المعالی:

یہ مکہ معظمہ کا قبرستان ہے۔ اس کی زیارت کو بھی ضرور جائے۔ اس میں ہزار ہا صحابہ کرام و تابعین و اولیاء اللہ کے مزارات ہیں۔ اس قبرستان کے دو حصے ہیں۔ ایک سڑک کے اتر جانب۔ اس میں اتر جانب ایک چھوٹے سے کمپاؤنڈ میں اسلام کی عظیم محسنہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد کے مزارات ہیں۔ یہیں حضرت عبدالمطلب کا بھی مزار ہے اس کی بھی زیارت کریں۔ اور ابو طالب کی بھی قبر ہے اس کی زیارت نہ کریں کہ انہیں ایمان نصیب نہیں ہوا تھا۔ دوسرا حصہ سڑک کے دکن ہے۔ اس میں حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور ان کی والدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہم کے مزارات ہیں۔

دیگر مساجد و آثار:

مولد النبی ﷺ جہاں حضور اقدس ﷺ کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ جگہ صفا سے پورب لب سڑک ہے۔ دو منزلہ عمارت بنی ہے نیچے کتب خانہ ہے اوپر تار، ٹیلیفون کا دفتر ہے اور بورڈ لگا ہے۔ "وزارة الحج والاعراف، مكتبة مكة المكرمة"

دار حمزہ:

سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جائے پیدائش، یہ جگہ مسفلہ میں ہے۔ باب البحرۃ کے بالکل سامنے والی گلی میں وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس گلی کا نام ہی

”شارع حمزہ“ ہے۔

مسجد ذی طوی:

تعمیر جاتے ہوئے راستے میں پڑتی ہے۔ یہاں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے احرام کی حالت میں قیام فرمایا تھا۔

مسجد جن:

اس جگہ جنوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا تھا۔ یہ مسجد جنت المعلیٰ کے قریب دکن جانب ہے۔

مسجد راہ:

اسی جگہ فتح مکہ کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا گاڑا تھا۔ یہ مسجد جن کے قریب ہی ہے۔

دار خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا:

اس مقدس گھر میں برسہا برس تک حضور اقدس ﷺ نے قیام فرمایا۔ یہیں تمام صاحب زادیاں اور حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ تمام صاحب زادے پیدا ہوئے۔ یہ جگہ شارع فیصل پر ایک گلی میں ہے۔ وہاں دارالحفاظ قائم ہے۔

جبل بوقبیس:

یہ صفا کے قریب بیت اللہ کے سامنے ہے۔ اسی پہاڑ پر حضور اقدس ﷺ نے چاند کو دو ٹکڑے فرمایا۔ اب وہاں ایک مسجد ہے جسے مسجد بلال کہتے ہیں۔
منیٰ میں جمرۃ العقبہ: (بڑے شیطان) کے قریب ہی وہ مبارک گھاٹی ہے جہاں انصار کرام نے ایمان قبول فرمایا، جہاں سے ہجرت کا منصوبہ بنا۔

غار مرسلات:

یہ بھی منیٰ ہی میں ہے اس جگہ سورہ مرسلات نازل ہوئی تھی۔ اس کی بڑی فضیلت

ہے۔

منیٰ ہی میں مسجد کعبہ بھی ہے جہاں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حج کیا تھا۔ وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ حضرت اسماعیل کو قربان کرنے لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اور کثیر مخصوص مبارک آثار ہیں۔ فرصت کے ایام میں پوچھ پوچھ کر ہو سکے تو سب جگہ حاضری دے۔ بغیر پوچھے ہوئے کتابوں میں دیکھ کر تلاش کرنا ناممکن ہے۔ ذکر اس لیے کر دیا کہ اس سے یہ معلوم ہو جائے کہ مخصوص آثار کیا کیا ہیں۔ اس کے علاوہ کتنے آثار دار ارقم، دار ام ہانی وغیرہ نجدی حکومت نے نیست و نابود کر دیئے۔

حاضری مدینہ طیبہ

فضائل:

اللہ عزوجل فرماتا ہے:

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ

الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا. (پ ۵ سور نساء)

اپنے اوپر ظلم کرنے والے اگر تمہارے پاس حاضر ہو کر اللہ سے مغفرت طلب کریں۔ اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کریں تو وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پائیں گے۔

حدیث (۱) حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے

لیے میری شفاعت واجب ہے (دار قطنی، بیہقی)

حدیث (۲) فرمایا جو میری زیارت کو آئے سوائے میری زیارت کے اور کسی حاجت

کے لیے نہ آئے تو مجھ پر حق ہے کہ قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں۔ (طبرانی کبیر)

حدیث (۳) فرمایا: جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی

تو ایسا ہے جیسے میری حیات میں میری زیارت سے مشرف ہوا۔ (طبرانی، دار قطنی)

حدیث (۴) فرمایا: جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی اس نے مجھ پر جفا کیا۔

(ابن عدی کا مل)

زیارت اقدس قریب قریب واجب ہے۔ جو اس سے محروم رہا بہت بڑا محروم ہے۔ جب مدینہ طیبہ کا سفر شروع کرے تو اپنی خوش بختی پر ناز کرے اور اللہ عزوجل کا شکر کرے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اپنے حبیب کے در پر لے جا رہا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کے تصور میں ڈوب جاؤ۔ سرکار کی اس عنایت بے غایت پر ناز کرو کہ اپنے دربار میں بلا رہے ہیں۔ راستے بھر جس قدر زیادہ ہو سکے درود شریف پڑھتے رہو۔ جب حرم مدینہ آئے تو بہتر یہ کہ پیدل ہو۔ روتے ہوئے آنکھیں نیچی کیے ہوئے سر جھکائے ہوئے جتنی ہو سکے درود شریف کی کثرت کرو۔ اگر ہو سکے تو ننگے پاؤں چلو۔ جب گنبد خضرا نظر آئے کھڑے ہو جاؤ۔ اس وقت خصوصیت سے جتنا زیادہ ہو سکے درود و سلام کی کثرت کرو۔ الصلاة والسلام علیک یا رسول اللہ۔ مسجد اقدس کی حاضری سے پہلے ایسی تمام ضروریات سے فارغ ہو لے جو دل بٹنے کا باعث ہوں۔ پھر ہو سکے تو غسل کر لے ورنہ وضو اور سواک کرے۔ سفید، صاف سترے عمدہ سے عمدہ جو کپڑے نصیب ہوں وہ پہنے۔ خوشبو لگالے مل سکے تو مشک افضل ہے۔

غرض کہ اچھی سے اچھی، عمدہ سے عمدہ بیت بطریق مسنون و مستحب بنا لو اس کے بعد آستانہ اقدس کی طرف تواضع و عاجزی کے ساتھ چلو۔ اگر اس وقت کچھ آنسو نکل آئے تو قسمت بن گئی۔ بہتر یہ ہے کہ باب جبریل سے داخل ہو۔ (یہ مشرق میں واقع ہے) جب مسجد اقدس کے دروازے پر حاضر ہو صلاۃ و سلام عرض کر کے تھوڑی دیر کے رہو گویا سرکار سے حاضری کی اجازت مانگ رہے ہو پھر بسم اللہ کہہ کر سیدھا پاؤں اندر رکھو اور یہ دعا پڑھو۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ
وَ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاَنْتَ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَ الصَّلَاةُ وَ السَّلَامُ عَلَيْكَ
يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ .

ہوش، گوش، قلب و دماغ، آنکھ زبان سب خیال غیر سے پاک کر کے محبوب رب

العلمین کے تصور میں ڈوب جاؤ حتیٰ کہ مسجد اقدس کے نقش و نگار زیبائش کو بھی نہ دیکھو۔ قدم بہت آہستہ آہستہ رکھو کہ آواز نہ ہونے پائے۔ خبردار! خبردار! دھیان رکھو کہ کوئی آواز بلند نہ نکلے۔

یقین جانو کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سچی، حقیقی، دنیاوی، جسمانی حیات کے ساتھ زندہ ہیں وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ نہ صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ تمہارے دل کے خطرات و خیالات پر بھی مطلع ہیں۔ اگر اس وقت جماعت صحیحہ قائم ہو تو جماعت میں شریک ہو جاؤ ورنہ اگر غلبہ شوق مہلت دے اور وقت مکروہ نہ ہو تو دو رکعت تحیۃ المسجد شکرانہ حاضری دربار اقدس سورہ فاتحہ اور قل یا اور قل ہو اللہ سے سنت کی رعایت کرتے ہوئے مختصر سے مختصر پڑھو۔ اگر محراب نبوی میں جگہ مل جائے تو کیا کہنا۔ ورنہ جہاں جگہ ملے وہاں پڑھو۔ پھر سجدہ شکر ادا کرو۔ اللہ عزوجل سے اس کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ادب کا سوال کرو اور یہ کہ حاضری کو قبول فرمائے اور حضور بھی قبول فرمائیں۔

حاضری بارگاہ

اس کے بعد گناہوں کی ندامت سے شرمندہ گردن جھکائے آنکھیں نیچی کیے لرزتے کانپتے کمال ادب میں ڈوبے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و کرم کی امید رکھتے ہوئے حضور والا کی پائنتی یعنی پورب کی طرف سے مواجہہ عالیہ میں حاضر ہو۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح جلوہ فرما ہیں کہ سر مبارک پچھتم ہے اور پائے اقدس پورب ہیں اور روئے انور دکھن۔ اس کے بعد یہ تصور کرے کہ اب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اقدس کے سامنے ہوں۔ پورے وقار و ادب، خوف و امید کے ساتھ قذیل کے نیچے، چاندی کی کیل کے سامنے جو حجرہ مبارکہ کی جنوبی دیوار میں چہرہ انور کے مقابل لگی ہے۔ (حجرہ مبارکہ کے ارد گرد جالیاں لگ جانے کی وجہ سے یہ چاندی کی کیل نظر نہیں آتی۔ اس کے مقابل جالیوں میں گول سوراخ ہیں وہیں کھڑا ہو) کم از کم چار ہاتھ کے فاصلے سے

قبلہ کی طرف پیٹھ کیے ہوئے مزار پر انوار کی طرف منہ کر کے جیسے نماز میں ہاتھ باندھتے ہیں اس طرح باندھ کر کھڑے ہو۔ اب نہایت ادب و وقار کے ساتھ غمگین و شرمندہ دل، معتدل آواز سے یہ سلام عرض کرو۔

السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ . السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَيْرَ خَلْقِ اللَّهِ . السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا شَفِيعَ الْمُذْنِبِينَ . السَّلَامُ عَلَيْكَ وَعَلَى آلِكَ وَأَصْحَابِكَ وَأُمَّتِكَ أَجْمَعِينَ أَسْأَلُكَ الشَّفَاعَةَ يَا رَسُولَ اللَّهِ .

پھر جن لوگوں نے سلام عرض کرنے کی درخواست کی ہو سب کا سلام عرض کرے اپنے لیے اور اپنے متعلقین کے لیے جو چاہے مانگے۔

اس رسالہ کے پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ جب کبھی ان کی حاضری ہو ان کے اس ناکارہ غلام شریف الحق کا سلام بھی عرض کر دیں۔ اسی طرح رسالہ کے شائع کرنے والے..... کا سلام بھی عرض کر دیں اور ہم سب کے لیے شفاعت کا سوال کریں۔

پھر اپنے داہنے ہاتھ یعنی پورب کی طرف ایک ہاتھ کی مقدار ہٹ کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرہ نورانی کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کرے۔ یہاں بھی جالیوں میں سوراخ بنا ہے۔

السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَلِيفَةَ رَسُولِ اللَّهِ . السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا وَزِيرَ رَسُولِ اللَّهِ . السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا صَاحِبَ رَسُولِ اللَّهِ فِي الْفَارِ وَفِي الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ .

پھر ایک ہاتھ اور پورب ہٹ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رو برو کھڑے ہو کر عرض کرو۔ یہاں بھی گول سوراخ بنا ہے۔

السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ . السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُتَمِّمَ الْأَرْبَعِينَ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا عِزَّ الْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِينَ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ .

پھر ایک بالشت پچھم کی طرف پلٹو اور حضرت صدیق و فاروق کے درمیان کھڑے

ہو کر عرض کرو۔

السَّلَامُ عَلَيْكُمَا يَا خَلِيفَتَي رَسُولِ اللَّهِ . السَّلَامُ عَلَيْكُمَا يَا وَزِيرَي رَسُولِ اللَّهِ . السَّلَامُ عَلَيْكُمَا يَا ضَجِيعَي رَسُولِ اللَّهِ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ
أَسْأَلُكُمَا الشَّفَاعَةَ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ .

یہ سب حضریاں قبولیت دعا کی جگہ ہیں۔ جتنی چاہو دعا مانگو اور درود و سلام پراکتفا کرو تو بہتر ہے اور جی چاہے تو یہ دعا مانگو۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَشْهَدُكَ وَأَشْهَدُ رَسُولَكَ وَأَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ وَأَشْهَدُ الْمَلَائِكَةَ النَّازِلِينَ عَلَيَّ هَذِهِ الرَّوْضَةِ الْكَرِيمَةِ الْعَاكِفِينَ عَلَيْهَا إِنِّي أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ وَحَدَّكَ لَا شَرِيكَ لَكَ وَأَنْ سَيِّدَنَا مُحَمَّدًا عَبْدَكَ وَرَسُولَكَ اللَّهُمَّ إِنِّي مُقِرٌّ بِجَنَائِي وَمَعْصِيَتِي فَأَغْفِرْ لِي وَأَمْنٌ عَلَيَّ بِالَّذِي مَنَنْتَ عَلَيَّ أَوْلِيَايَكَ فَإِنَّكَ الْمَنَّانُ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ . رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ .

اس کے بعد منبر اطہر کے قریب حاضر ہو کر دعا مانگو پھر منبر اور روضہ مبارک کے درمیان ریاض الجنۃ (جنت کی کیاریاں) میں حاضر ہو اور وقت اگر مکروہ نہ ہو دو رکعت نفل پڑھ کر دعا مانگو۔ مسجد شریف کے ہر ہر ستون کے پاس نماز پڑھو اور دعا مانگو۔ جب تک مدینہ طیبہ کی حضری نصیب ہو ایک سانس ضائع نہ ہونے دو۔ ضروریات کے سوا اکثر وقت مسجد اقدس میں باطہارت حاضر ہو۔ نماز تلاوت، درود میں وقت گزارو۔ کوشش کرو کہ کم از کم ایک ختم قرآن مجید وہاں ہو جائے۔ اگر قوت ہو تو دن روزے میں گزارو۔ کم از کم چالیس نمازیں مسجد اقدس میں ضرور پڑھو اس پر نفاق اور دوزخ سے آزادی کا وعدہ ہے۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھو کہ نماز یا کسی وقت بھی مزار اقدس کی طرف پیٹھ نہ ہو۔

جنت البقیع کی زیارت سنت ہے۔ سرکار اعظم کی حضری کے بعد وہاں حاضر ہو خصوصاً جمعہ کے دن۔ یہاں قریب قریب بیس ہزار صحابہ مدفون ہیں۔ یہاں جب حاضر ہو تو سارے آسودگان بقیع کو مخاطب کر کے یوں سلام عرض کرو۔

السَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ لِنَعْمَ لَنَا سَلَفٌ وَأَنَا أَنْشَاءَ اللَّهُ تَعَالَى بِكُمْ
لَا حَقَّوْنَ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِأَهْلِ الْبَقِيعِ بِقِيعِ الْفَرَقِدِ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلَهُمْ .
چاہے تو اتنا اور بڑھالے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِوَالِدِينَا وَلِأَسْتَاذِنَا وَ لِأَخْوَانِنَا وَ لِأَوْلَادِنَا وَ لِأَخْفَادِنَا
وَ لِأَصْحَابِنَا وَ لِأَخْبَابِنَا وَ لِمَنْ لَهٗ حَقٌّ عَلَيْنَا وَ لِمَنْ أَوْصَانَا وَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ
وَ الْمُسْلِمِينَ وَ الْمُسْلِمَاتِ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ .
پھر درود شریف، سورہ فاتحہ، آیت الکرسی، چاروں قل، یا جتنا قرآن شریف پڑھ سکو
سب کے لیے ایصالِ ثواب کرو۔ اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضر
ہو کر سلام عرض کرو۔

السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ . السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ثَلَاثَ الْخُلَفَاءِ
الرَّاهِدِينَ . السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ذَا الْهَجْرَتَيْنِ . السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ذَا النُّورَيْنِ
السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُجَهَّزَ جَيْشِ الْعُسْرَةِ بِالنَّقْدِ وَالْعَيْنِ . جَزَاكَ اللَّهُ عَنْ رَسُولِهِ
وَ عَنْ سَائِرِ الْمُسْلِمِينَ وَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْكَ وَ عَنِ الصَّحَابَةِ أَجْمَعِينَ .

حضور اقدس ﷺ کے صاحبزادے حضرت سیدنا ابراہیم اور صاحبزادی حضرت رقیہ
اور دیگر صحابہ کرام کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ حضرت عباس، حضرت امام حسن، سر مبارک حضرت
امام حسین کے مزارات پر حاضر ہو۔ ازواجِ مطہرات کے مزارات پر بھی حاضری دے۔ اب
حکومت گیٹ میں تالا بند کیے رہتی ہے۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ اس لیے گیٹ
کے باہر سے ہی کھڑے ہو کر سلام کرے اور فاتحہ پڑھے۔ (میں ۱۴۰۵ھ میں حاضر ہوا تھا۔
سنا ہے اب مخصوص اوقات میں کھول دیا جاتا ہے)

قبا شریف کی ضرور زیارت کرے۔ ہفتہ کا دن ہو تو بہتر اور پیدل جائے تو کیا کہنا۔
وہاں حاضر ہو کر دو رکعت نماز نفل پڑھے۔ حدیث میں ہے قبا میں نماز عمرہ کے مثل ہے۔
شہدائے احد شریف کی بھی زیارت کرے۔ حضور اقدس ﷺ ہر سال کے شروع میں یہاں
تشریف لے جاتے۔ کوہ احد کی بھی زیارت کرے، کوہ احد پر چڑھے بھی اور اس پر اُگی ہوئی

سبزپوں میں سے کچھ کھائے بھی۔ ہمیشہ پنج شنبہ کے دن صبح کو بہتر ہے۔ مسجد غمامہ، مسجد قبلتین، مساجد خمہ وغیرہ کی بھی زیارت سے مشرف ہو۔ مدینہ طیبہ کے وہ مبارک کنوئیں جو حضور کی طرف منسوب ہیں کسی سے حضور نے وضو فرمایا، کسی کا پانی پیا، کسی میں لعاب دہن ڈالا ان کی بھی زیارت کرے۔

اللَّهُمَّ ارْزُقْنَا زِيَارَةَ حَرَمِكَ وَحَرَمِ حَبِيبِكَ صَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ .

واپسی کے بعد

گھر واپس ہونے کے بعد حج و زیارت کی نعمت ملنے پر اللہ عزوجل کا شکر ادا کرے۔ اللہ کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے سچے ارشاد کے مطابق یہ اعتقاد رکھے کہ اب میں گناہوں سے پاک صاف ہو گیا ہوں اس لیے اب پوری کوشش کرے کہ اللہ عزوجل اور اس کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ نماز، حج گناہ باجماعت ادا کرے اور ہر گناہ سے بچے۔

حج مبرور مقبول کی یہی علامت ہے کہ حج کے بعد آدمی کا حال پہلے کی بہ نسبت بہتر ہو جائے یعنی دین کی پابندی اللہ عزوجل کا خوف، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے حیا بڑھ جائے۔ ایک بار یہ نعمت ملی ہے دوبارہ ملے یا نہ ملے کون جانے۔

مناسک حج ایک نظر میں

حج کا پہلا دن ۸ رزی الحجہ	حج کا دوسرا دن ۹ رزی الحجہ	حج کا تیسرا دن ۱۰ رزی الحجہ	حج کا چوتھا دن ۱۱ رزی الحجہ	حج کا پانچواں دن ۱۲ رزی الحجہ
مکہ سے منیٰ کو روانگی	نجر کی نماز منیٰ میں ادا کر کے عرفات کو روانگی	مزدلفہ میں اول وقت فجر کی نماز کے بعد واجب وقوف، ذکر و دعا۔ سورج نکلنے میں جب دو رکعت ادا کرنے کا وقت باقی رہے تو منیٰ کو روانگی	منیٰ میں ری کرنا زوال کے بعد	منیٰ میں ری کرنا زوال کے بعد
منیٰ میں آج کے دن	ظہر کی نماز عرفات میں پڑھنی ہے	وہاں پہلے بڑے شیطان کی ری	پہلے چھوٹے شیطان کی	پہلے چھوٹے شیطان کی
ظہر	وقوف عرفات	پھر قربانی کرنا	پھر درمیانے شیطان کی	پھر درمیانے شیطان کی
عصر	عصر کی نماز عرفات میں پڑھنی ہے	پھر سر کے بال موٹانا یا کترانا	پھر بڑے شیطان کی ری کرنا ہے	پھر بڑے شیطان کی ری کرنا ہے
مغرب	مغرب کے وقت مغرب کی نماز پڑھے بغیر مزدلفہ کو روانگی	پھر طواف زیارت کو مکہ جانا	طواف زیارت اگر کل نہیں کیا تھا تو آج کریں	طواف زیارت اگر نہیں کیا تھا تو آج کریں
عشا پڑھنی ہیں	مغرب اور عشا کی نمازیں عشا کے وقت مزدلفہ میں ادا کرنی ہیں	رات منیٰ میں قیام	رات منیٰ میں قیام	۱۳ رزی الحجہ کو اگر قیام کیا تو اس دن بھی تینوں جہروں پر ری واجب ہے اس کا وقت صبح تا غروب آفتاب ہے مگر قبل زوال مکروہ ہے
رات منیٰ میں قیام	رات مزدلفہ میں قیام کرنا ہے	☆☆☆	☆☆☆	☆☆☆

نوٹ: اس کے علاوہ حج کے بقیہ دنوں میں روزمرہ کی طرح نمازیں ادا کریں۔ طواف زیارت کا وقت ۱۰ ارذی الحجہ کی فجر سے ۱۲ ارذی الحجہ کے غروب آفتاب یعنی مغرب تک ہے۔ طواف زیارت سے رات کے کسی بھی حصہ میں فارغ ہوں تو بقیہ رات قیام کے لیے منی چلے جائیں۔

(یہ قیمتی مضمون ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور مئی ۱۹۹۱ء کے شماروں میں دو قسطوں میں شائع ہوا، اور الگ سے پاکٹ سائز کے کتابی شکل میں بھی اشاعت ہوئی۔ افادیت کے پیش نظر نذر قارئین ہے)

اسے پاکٹ سائز کتابی شکل میں سب سے پہلے حاجی غلام حسین خازن جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے شائع کیا۔ پھر مجمع الاسلامی مبارک پور نے شائع کیا۔ یہ رسالہ دونوں جگہوں سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔



رمی جمرات کے اوقات میں

تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں

روز نامہ ”انقلاب“ بمبئی کی ۱۴ یا ۱۵ اپریل کی اشاعت میں ایک مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے۔ ”رمی جمرات کے اوقات میں تبدیلی لانے پر غور“ جس کے اندر مکتوب تھا کہ جمرات پر کنکری مارنے پر جو حوادث ہر سال ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے سعودی مفتی صاحبان اس پر غور کر رہے ہیں کہ اس کے اوقات میں تبدیلی کر لی جائے۔ ۱۱/۱۲/۱۱ھ الحجہ کو کنکری مارنے کا وقت بعد ظہر شروع ہوتا ہے۔ اس کو بدل کر نماز فجر کے بعد سے شروع کر دیا جائے۔ نیز سعودی مفتی صاحبان کا خیال ہے کہ شیطان کو کنکری مارنے کے رکن پر ظہر سے پہلے عمل شروع کرنا اسلامی روایات کے خلاف نہیں ہوگا۔ توقع ہے کہ آئندہ سال حج سے قبل اس سلسلے میں فتویٰ جاری کر دیا جائے گا۔

نیز اسی میں لندن کے اخبار ”الحیات“ کے حوالے سے خبر دی ہے کہ اس قسم کے فتویٰ کی راہ ہموار کرنے کے لیے سعودی علماء جو وہابی مکتب فکر کے سخت پابند ہیں، پچھلے تیسویں صدی کے ابو حنیفہ النعمان کی پچک دار تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے غیر معمولی اقدام کریں گے۔ یہ پورا مضمون کئی وجہ سے قابل تنقید ہے۔ ہم اس وقت سردست اس بات پر روشنی ڈال رہے ہیں کہ کیا شرعاً اس کی گنجائش ہے کہ ۱۱/۱۲/۱۱ھ الحجہ کو کنکری مارنے کا وقت نماز فجر کے بعد مقرر کرنا درست ہے؟ اور کیا حنفی مذہب کے مطابق ایسا کرنا صحیح ہے؟

اول: ۱۱/۱۲/۱۱ھ الحجہ کو کنکری مارنے کے وقت کی ابتدا دوپہر ڈھلنے سے ہوتی ہے۔ اس کے پہلے کنکری مارنا کالعدم ہے۔ اس لیے کہ حج کے ارکان قیاسی نہیں کہ ہم اپنی عقل و منشا کے مطابق اس میں جو چاہیں رد و بدل کریں، حج کے سارے ارکان اور ان کے اوقات من جانب الشرع متعین اور مقرر ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اقدس ﷺ نے جس طرح جس ترتیب اور اوقات کی تعیین کے ساتھ حج فرمایا اسی طرح ہم پر حج کے افعال ادا

کرنا لازم ہے۔ اس کے خلاف کرنے سے حج میں نقص لازم آئے گا۔ اس سلسلے میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

بخاری جلد اول صفحہ ۲۳۵، مسلم جلد اول صفحہ ۲۲۰۔ ابوداؤد جلد اول صفحہ ۲۷۱ میں ہے:
عن جابر قال رمى رسول الله ﷺ الجمره يوم النحر ضحى واما بعد
فاذا زالت الشمس.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نحر (دسویں ذی الحجہ) کو چاشت کے وقت کنکری ماری اور اس کے بعد جب سورج ڈھل گیا تب ماری۔
نیز ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

فمكث بها ليلالي ايام التشريق يرمى الجمره اذا زالت الشمس. (ابو داؤد جلد اول صفحہ ۲۷۱)

حضور ﷺ نے ایام تشریق میں منیٰ میں قیام فرمایا اور جمرہ پر کنکری مارتے جب سورج ڈھل جاتا۔

اسی کے مطابق صحابہ کرام کا عمل یہ تھا کہ ۱۲/۱۱/۱۲ ذی الحجہ کو زوال کے بعد کنکری مارا کرتے تھے۔ ابوداؤد میں اسی صفحہ پر نیز بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول مذکور ہے:

كنا نتحين زوال الشمس فاذا زالت الشمس رمينا.

ہم سورج ڈھلنے کا انتظار کرتے رہتے، جب سورج ڈھل جاتا تو ہم کنکری مارتے۔
ان احادیث کی روشنی میں چاروں ائمہ مذاہب حضرت امام اعظم ابو حنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی، حضرت امام حنبلی رضی اللہ عنہم اجمعین کا متفقہ مذہب یہ ہے کہ ۱۲/۱۱/۱۲ ذی الحجہ کو کنکری مارنے کا وقت دو پہر بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے قبل وقت نہیں ہوتا۔ کچھ اسلاف کا یہ مذہب ضرور ہے کہ ان دنوں میں قبل زوال بھی رمی صحیح ہے۔ مگر ان حضرات کا قول مرجوح ہونے کی وجہ سے بالکل مٹا ہوا ہے۔

عہد رسالت سے آج تک پوری امت کا یہی مذہب ہے اور اسی پر عمل ہے ان دنوں میں رمی جمار کا وقت زوال سے پہلے نہیں ہوتا زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ کسی نے ان

تاریخوں میں زوال سے پہلے رمی نہیں کی۔

حضرت امام نووی شافعی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

واما ایام التشریق فمذہبنا و مذہب مالک و احمد و جماہیر العلماء

انہ لا یجوز الرمی فی الایام الثلاثة الا بعد الزوال لهذا الحدیث الصحیح دلیلنا

انہ صلی اللہ علیہ وسلم رمی کما ذکرنا و قال صلی اللہ علیہ وسلم لتأخذوا منا سککم. (جلد ۱ ص ۴۲)

ہمارا اور امام مالک اور امام احمد اور جمہور علما کا مذہب یہ ہے کہ ایام تشریق

(۱۱/۱۲/۱۳ ذی الحجہ) میں زوال سے پہلے رمی جائز نہیں۔ اس حدیث صحیح کی وجہ سے، ہماری

دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ویسے ہی رمی فرمائی جیسے ہم نے ذکر کیا، اور ارشاد فرمایا کہ تم

لوگ مجھ سے حج کے ارکان سیکھ لو۔

حتیٰ کہ علامہ ماوردی نے اس پر اجماع کا دعویٰ فرمایا جیسا کہ مرقاة شرح مشکوٰۃ

جلد ثالث صفحہ ۲۲۹ پر ہے، اور یہی دیوبندی جماعت کے ممتاز اور معتمد عالم خلیل احمد انیسٹھی

نے بذل المجہود میں لکھا:

فاما بعد ذالک الی یوم النحر فبعد زوال الشمس ای فرمی الجمار الثلاث بعد

زوال الشمس و هذه المسئلة مجمع علیها. (بذل المجہود جلد ۳ صفحہ ۱۷۹)

یوم نحر (دسویں تاریخ) کے بعد تینوں جمرات کی رمی سورج ڈھلنے کے بعد ہے۔ اور

اس پر اجماع ہے۔

قرن ثانی میں اس مسئلے میں کچھ اختلاف تھا مگر اس کے بعد احادیث صحیحہ کی بنا پر

پوری امت کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ ۱۱/۱۲ ذی الحجہ کو قبل زوال رمی جائز نہیں، اور حضرت علامہ

ماوردی کے دعویٰ اجماع کا حاصل یہی ہے۔

رہ گیا احناف کا مذہب وہ بھی صحیح، مختار، مفتی بہ یہی ہے کہ گیارہ ہویں بارہویں کو قبل

زوال رمی جائز نہیں۔ ان دنوں میں رمی کی وقت بعد زوال ہے سارے متون میں یہی مذکور ہے۔

قدوری میں ہے:

فاذا زالت الشمس من الیوم الثانی من ایام النحر رمی الجمار الثلاث (الیٰ)

ان قال (فاذا كان من الغلر مي الجمار الثلاث بعد زوال الشمس . (صفحة ۹۹)
یوم نحر کے دوسرے دن جب سورج ڈھل جائے تو تینوں جمار پر کنکری مارے ایسے
ہی اس کے دوسرے دن زوال شمس کے بعد کنکری مارے۔

اور یہی فتاویٰ خانیہ، ہدایہ، کنز، تنویر الابصار، نور الایضاح وغیرہ سارے متون میں ہے۔
ہمارا اصل مذہب وہی ہے جو متون میں مذکور ہے، اور یہی ہمارے علمائے احناف
کا مختار و مفتی ہے۔ جیسا کہ کتب فقہ سے ظاہر ہے۔ ہاں! ایک روایت ضعیف حضرت امام
حسن سے تو یہی ہے کہ ۱۲ تاریخ کو بعد زوال رمی کی جائے، لیکن اگر کسی نے قبل زوال کر لیا
تو کافی ہے۔

ہدایہ میں ہے:

فی المشہور من الروایة.

اس کے تحت عنایہ میں ہے:

احتراز عما روی الحسن عن ابی حنیفة رحمہ اللہ انہ ان کان من
قصده ان یتعجل فی النفر الاول فلا یاس بان یرمی فی الیوم الثالث قبل الزوال
وانما بعدہ فهو افضل. (جلد دوم صفحہ ۳۹۳)

(مشہور کی قید) اس سے احتراز ہے، جو امام حسن نے امام ابو حنیفہ سے روایت کی
کہ اگر اس کا قصد یہ ہے کہ نفر اول میں جلدی کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ تیسرے دن
زوال سے قبل رمی کر لے، اور اگر زوال کے بعد رمی کر لے تو افضل ہے۔

مگر اس روایت کو ہمارے علمائے دو طرح مرجوح قرار دیا، اول: جو متون میں ہے
وہ ظاہر مذہب ہے، اور یہ روایت نوادر میں سے ہے۔ روایت نوادر کے مقابل ظاہر مذہب کو
ترجیح ہوگی۔ ثانی: دلیل کے اعتبار سے بھی یہ مرجوح ہے۔ امام ابن ہمام نے اور صاحب عنایہ
وغیرہ نے فرمایا کہ حج کے ارکان کی ادائیگی کے وقت اور جگہ کے سلسلے میں حضور اقدس ﷺ کی
پیروی لازم ہے۔ جس طرح یہ جائز نہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے جو رکن جہاں ادا کیا اس جگہ
کو تبدیل کیا جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ وقت میں تبدیلی کی جائے۔

اور جب قبل زوال رمی کی اجازت مرجوح اور ضعیف ہے تو نہ اس پر فتویٰ دینا درست اور نہ اس پر عمل جائز۔ درمختار میں ہے:

فعلینا اتباع ما رجحوہ وصححوہ الفتی بالقول المرجوح جهل وخرق للاجماع .
ہم پر اسی کا اتباع واجب ہے، جس کی علمائے صحیح کی، جس کو ترجیح دیا، قول مرجوح پر فتویٰ دینا جہالت اور خرق اجماع ہے۔

اس کو آپ یوں سمجھئے جیسے کسی بارے میں حدیث صحیح اور ضعیف متعارض ہوں تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حدیث صحیح کو ترجیح ہوگی اس طرح اگر کسی امام سے دو روایتیں متعارض ہوں ایک صحیح دوسری ضعیف تو صحیح کو ترجیح دینا لازم ہے۔ تعجب ہے علمائے سعودیہ پر کہ وہ ادنیٰ ادنیٰ سی جرح پر احادیث حسنہ کو بھی ناقابل عمل قرار دیتے ہیں۔ اور یہاں صحیح حدیث کے خلاف اور سارے مذہب کے صحیح قول کے خلاف ایک ضعیف مرجوح روایت پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ نیز یہ لوگ اپنے آپ کو حنبلی کہتے ہیں، حنبلی مذہب بھی یہی ہے کہ ۱۲/۱۱۱ روڈی الحجہ کو بعد زوال رمی کی جائے۔ قبل زوال رمی جائز نہیں۔

مذہب حنبلی کی معتبر کتاب المغنی لابن قدامہ جلد ثالث صفحہ ۴۵۲ پر ہے:

ولا یومی فی ایام التشریق الا بعد الزوال فان رمی قبل الزوال اعدا۔

ایام تشریق میں رمی نہ کرے مگر بعد زوال۔ اگر قبل زوال رمی کرے تو لوٹائے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ سے ایسی کوئی روایت نہیں کہ ۱۲ کو قبل زوال رمی جائز ہے۔ اس سے ثابت کہ حنابلہ مگر اس پر اتفاق ہے کہ ۱۲ اور ۱۳ کو قبل زوال رمی درست نہیں بعد زوال ہی رمی ضروری ہے۔

وہ گئے حوادث کی وجہ سے ارکان حج کے اوقات میں تبدیلی کسی طرح مسلمان برداشت نہیں کر سکیں گے۔ یہ حوادث برسہا برس سے ہو رہے ہیں مگر سعودی حکومت نے اس کے سدباب کے لیے نہ کچھ سوچا نہ انتظام کیا مجھے حیرت ہے کہ سعودی حکومت ساڑھے چار سو ریال فی حاجی کس لیے وصول کرتی ہے؟

حوادث کے اسباب میں سب سے بڑا سبب حجاج کی عجلت ہے۔ نیز حکومت کی

لاپرواہی۔ یہ حوادث زیادہ تر دس کو ہوتے ہیں۔ یا ۱۲ کو۔ دس کو حجاج کو یہ جلدی رہتی ہے کہ جلد از جلد احرام کھول دیں حالاں کہ وہ اگر صبر کریں اور احرام کھولنے کے لیے بچپن نہ ہوں تو کوئی حادثہ نہ ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۰ کو زوال سے پہلے پہلے کنکری مار لینا سنت ہے۔ لیکن اس کا وقت غروب آفتاب تک بلا کراہت ہے۔ بلکہ رات میں بھی اگر عذر کی بنا پر کنکری ماریں تو کراہت نہیں۔

اسی طرح ۱۲ کو اگر وہ مکہ واپس ہوں تو جلدی نہ چائیں تو کوئی حادثہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں حکومت پر لازم ہے کہ وہ جمرہ پر بہت مستعد اور چاق چو بند فوجیوں یا شرطیوں کو متعین کریں اور ان کی مقدار بھی معتد بہ ہو، جو بھیڑ پر قابو پاسکیں۔ ایک اندازہ لگالیں کہ بیک وقت ایک جمرے پر کتنے آدمی کنکری مار سکتے ہیں اتنی ہی آدمیوں کو وقفے وقفے پر جمرہ پر جانے دیں تو کوئی حادثہ نہ ہوگا۔ اس طریقے پر مزید غور کر کے مناسب اقدام کیا جائے۔ پھر جب علما نے تصریح فرمادی کہ اگر دن میں کسی عذر کی وجہ سے ۱۲ کو کنکری نہیں ماسکا تو رات میں بلا کراہت جائز ہے، زیادہ سے زیادہ یہی نہ ہوگا کہ ۱۳ کو منیٰ میں پھر رہنا پڑے گا، تو اس میں کیا حرج ہے۔ ایک دن مزید رک جائیں۔ ۱۳ کو بعد زوال کنکری مار کر مکہ واپس آئیں۔ یہ عمل بلا شبہ سنت و شریعت کے مطابق ہوگا۔ لیکن اگر بالفرض سعودی مفتیوں نے رمی کے وقت میں تبدیلی کی تو یہ دین میں ان کی بے جا مداخلت ہوگی، جسے مسلمان کبھی نہیں برداشت کر سکیں گے۔

دسویں کو تو صبح ہی سے کنکری ماری جاتی ہے، اس کے باوجود اس دن بھی حادثے ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ خلاف شرع وقت کی تبدیلی مسئلے کا حل نہیں بلکہ انتظام کی درستی یا شریعت کی رخصت کے مطابق تاخیر۔ مسئلے کا حل ہو سکتی ہے۔

مضمون مذکور میں ہے کہ رمی کا وقت بعد ظہر ہے، یہ غلط ہے۔ رمی کا وقت دوپہر کے بعد فوراً ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اگر کسی نے نماز نہیں پڑھی، دوپہر ڈھلتے ہی فوراً ہی رمی کر لی تو صحیح ہے، اسی طرح اس میں یہ ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ آٹھویں صدی کے امام ہے، یہ بھی غلط ہے۔ حضرت امام اعظم دوسری صدی کے امام اور تابعی ہیں۔

مہر اور جہیز

کے سلسلے میں ایک گزارش

آجسے چالیس پچاس سال پہلے اعظم گڑھ کے مشرقی حصہ میں انصاری برادری میں مہر ۲۵ روپے سکہ رائج الوقت متعین تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ۵۱ روپے ہوا، اور اب ۲۵۱ روپے ہے۔

جب مہر پچیس روپے تھا تو چاندی کے روپے کا چلن تھا، اس لیے رائج الوقت سے وہی چاندی کے روپے مراد ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تنازع کے بعد مہر میں چاندی کے پچیس روپے دیے جاتے تھے۔

اور آج کل چاندی کے روپوں کا چلن بند ہو گیا ہے، نوٹ یا نکل کے روپے چلتے ہیں۔ آج جب سکہ رائج الوقت کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مہر ۲۵۱ روپے نوٹ ہیں۔

اب ہر شخص کے لیے لمحہ فکر یہ ہے کہ جب غربت و افلاس تھا تو مہر چاندی کے پچیس روپے تھے، جس کی قیمت نوٹوں سے اس وقت لگ بھگ پونے دو ہزار روپے ہوتے ہیں، اور آج جب کہ فراخی اور وسعت زر ہے مہر صرف ۲۵۱ روپے، یہ انتہائی نامناسب بات ہے۔ ہمارے سماج میں لڑکیاں ماں، باپ کے بس میں ہوتی ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مردہ بدست زندہ ہوتی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اپنے شادی کے معاملہ میں اف نہیں کر سکتی ہیں۔ ہمارا ماحول ایسا ہے کہ اگر بے زبان مجبور لڑکیاں اپنی شادی کے معاملہ میں زبان کھول دیں تو گستاخ، زبان دراز وغیرہ خطابات سے نوازی جائیں گی۔ مہران کا حق ہے، اگر وہ ماحول کے دباؤ کی وجہ سے یا اپنی فطری حیا کی وجہ سے کچھ نہ بولیں یہ ان کی سعادت ہے۔ مگر باپ

پر فرض ہے کہ وہ اپنی لڑکی کے حق کو سمجھے اور اسے پورا پورا دے۔ ہندوؤں سے سیکھ کر اب مسلمانوں میں ضرورت سے زیادہ جہیز دینے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی کرنا جوے شیر لانے کے برابر ہو چکا ہے۔ لیکن مہر جو خاص اسلامی چیز ہے، اور لڑکی کا حق ہے اس پر کوئی بھی غور نہیں کر رہا ہے۔ ہم عوام کی آگاہی کے لیے ازواج مطہرات اور سیدہ فاطمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین کے مہر اور جہیز کی تفصیل درج کر دیتے ہیں۔ مسلمان اسے دیکھیں اور اللہ توفیق دے تو اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کریں۔

حضور اقدس ﷺ کی ازواج مطہرات اور بنات مکرمات کا مہر پانچ سو درہم سے زائد

نہ تھا۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ما علمت رسول اللہ ﷺ نکح شیئا من نسائه ولا انکح شیئا من بناته

علیٰ اکثر من اثنی عشر اوقیة.

میں نہیں جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہ اوقیہ سے زیادہ پر اپنا یا اپنی

صاحبزادیوں کا نکاح کیا ہو۔

اس میں حضرت ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر ایک روایت میں چار ہزار درم تھا جیسا کہ ابو داؤد میں ہے۔ اور دوسری روایت کی بنا پر چار ہزار دینار تھا جیسا مستدرک میں ہے۔ مگر ان کا مہر شاہ حبشہ نجاشی رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے ادا کیا تھا۔ اور حضرت بتول زہرا رضی اللہ عنہا کا مہر اقدس چار سو مثقال چاندی تھا۔ چاندی کا وزن انگریزی چاندی والے چہرہ دار روپے سے ایک سو ساٹھ روپے ہے، جس کی قیمت آج کے سکے سے دس ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ اور پانچ سو درم کے چاندی والے چہرہ دار روپے سے ایک سو چالیس روپے بھر ہوا، جس کی قیمت موجودہ سکوں سے تقریباً نو ہزار ہوگی۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے سوا اور ازواج مطہرات کا مہر آج کے سکے سے لگ بھگ نو ہزار تھا اور حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا مہر مبارک لگ بھگ دس ہزار روپے تھا۔ ازواج مطہرات کو ان کے میکے سے جہیز کیا ملا؟ اس سلسلے میں مجھے اب تک کوئی تفصیل نہیں مل سکی البتہ حضرت بتول زہرا رضی اللہ عنہا کو حضور اقدس ﷺ نے جو جہیز دیا تھا، وہ یہ

ہے ایک باند کی چار پائی، چمڑے کا گدا جس کی اندر روئی کے بجائے کھجور کی شاخوں کے ریٹے تھے، ایک چھاگل (پیالہ) ایک مشک دو چکیاں اور مٹی کے دو گھڑے۔

اب ہر مسلمان کے لیے لمحہ فکر یہ ہے کہ وہ مہر اور جہیز دونوں کے سلسلے میں اسلامی نظریے کو سمجھیں کہ اسلام میں مہر کی کیا حیثیت ہے، اور جہیز کی کیا حیثیت ہے۔ پھر اس روایت کو بھی سن لیں کہ اس وقت حضرت علی مرتضیٰ بہت ہی تنگ دست تھے، ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ صرف ایک زرہ تھی جو بدر کے موقع پر خود حضور اقدس ﷺ نے عطا فرمایا تھا۔ مگر پھر بھی وہ مہر مقرر ہوا۔ اور آج لڑکی کسی حیثیت کی ہو لڑکا کسی بھی حیثیت کا ہو مہر وہی ۲۵۱ روپے۔ یہ اپنی بچیوں پر ظلم ہے۔ تمام ذمہ دار ذی اثر مسلمانوں سے اپیل ہے کہ وہ لڑکیوں کے مہر کے معاملے میں غور و خوض باہمی رائے مشورہ کے بعد ایسی مقدار مقرر کریں جو مناسب ہو، جس میں لڑکیوں کی حق تلفی نہ ہو۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اب پنچایتی طور پر مہر کی مقدار کم از کم دو ہزار کر دی جائے، اور یہ ہرگز زیادہ نہیں۔ گزر چکا کہ چالیس پچاس سال پہلے پنچایتی طور پر مہر پچیس روپے چاندی تھا۔ جس کی قیمت لگ بھگ پونے دو ہزار ہوتی ہے۔ وہ عسرت اور تنگ دستی کا زمانہ تھا اس لحاظ سے دو ہزار مہر زائد نہیں۔

دوسری نہایت اہم گزارش یہ ہے کہ جہیز کے سلسلے میں جہاں تک ہو کمی کی جائے۔ اللہ توفیق دے تو بقدر ضرورت لڑکیوں کو جہیز دیا جائے مگر اتنا نہیں کہ خود بار ہو اور لڑکی والوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کہ روا کے مطابق جہیز کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے رشتے لگنے کے باوجود لڑکیوں کی شادی نہیں ہو پاتی ہے۔ بسا اوقات رشتہ ختم کرنا پڑتا ہے۔ اگر مشترکہ طور پر جہیز کے لیے کچھ پابندی لگادی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

جہیز کی شرعی حیثیت

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ اب ادھر چند برسوں سے مسلمانوں میں یہ رواج ہوتا جا رہا ہے کہ لڑکوں کی شادی طے کرتے وقت جہیز کی مقدار معین مانگتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ دس ہزار نقد لیں گے اور موٹر سائیکل لیں گے اور گھڑی لیں گے۔ اگر لڑکی والے اس کو منظور کرتے ہیں تو شادی طے ہوتی ہے ورنہ کینسل کر دیتے ہیں۔ طے ہونے کے بعد اگر لڑکی والے ان مقررہ جہیز میں کچھ بھی کم دیتے ہیں تو اس کے لیے جھگڑا کھڑا کرتے ہیں۔ بدنام کرتے ہیں بلکہ بعض دفعہ برات تک واپس ہو جاتی ہے۔ اور اگر لڑکی سسرال گئی تو اسے زندگی بھر طعنہ دیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکی بیٹھا دیتے ہیں کہ جب تک فلاں فلاں چیز جو مقررہ جہیز میں سے اب تک نہیں ملی ہے، ملے گی نہیں، ہم تم کو نہیں رکھیں گے۔ کیا شرعیاً یہ جائز ہے۔ بینواتو جروا۔

المستفتی: ویل عبدالاول صاحب، اشرفیہ مبارک پور

جواب:

جہیز کی مقدار طے کرنا بلکہ مقدار نہ بھی معین ہو کہیں شادی طے کرتے وقت جہیز کا مطالبہ ہی کرنا یا شادی کے وقت مطالبہ کرنا یا شادی ہو جانے کے بعد جہیز کا مطالبہ کرنا یہ سب حرام ہے۔ اور یہ رشوت مانگنا ہے جو مال لیا مال حرام لیا۔ رشوت لیا۔ فرض ہے کہ اسے واپس کرے۔ اس کو استعمال میں لانا حرام ہے۔

شامی کتاب الہبتہ میں ہے:

جعلت المال علی نفسہا عوضاً عن النکاح ولی النکاح العوض لا

یکون علی المرأة. (ج ۵، ص ۷۰۱)

عورت جو مال اپنے نکاح کے عوض دے وہ باطل ہے، نکاح میں عوض عورت پر نہیں۔

عورت دے یا اس کے ماں باپ بھائی دیں سب ایک حکم میں ہے۔ کتب فقہ کی یہ تصریح کہ نکاح میں عوض عورت کے ذمہ نہیں سب کو شامل ہے۔ ہماری شریعت نے نکاح میں عوض مرد کے ذمہ رکھا ہے حتیٰ کہ اگر مرد و عورت نے بغیر مہر مقرر کیے نکاح کیا جب بھی مہر مرد پر واجب ہے بلکہ اگر یہ شرط کر دی کہ کچھ مہر نہ ہوگا جب بھی مہر مثل واجب ہے اگر نکاح کے بعد وطی یا خلوت صحیحہ ہوگئی۔ در مختار میں ہے۔

و کذا یجب مہر المثل فیما اذا لم یسم مہرا او نفی ان وطی الزوج او مات عنها او لم یترضا علی شئی یصلح مہرا والا فذالک الشئی ہو الواجب. (جلد سوم: صفحہ ۱۰۸)

اگر مہر مقرر نہیں کی یا مہر کا نام نہ لیا۔ یا مہر کی نفی کر دی تو مہر مثل واجب ہے اگر شوہر نے وطی کر لی یا مرگیا۔ ہاں اگر دونوں نے رضا مندی سے کوئی مقدار کسی ایسے چیز کی مقرر کر لی جو مہر ہو سکے تو وہی واجب ہے۔

عورت یا عورت کے اولیا سے مال مانگنا یہ قلب موضوع اور الثا ہے علاوہ ازیں کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے کہ اگر عورت کے بھائی نے نکاح کے عوض کچھ مال مانگا تو یہ رشوت ہے۔ اور شوہر اسے واپس لے سکتا ہے، نکاح کے عوض عورت کے اولیا کا کچھ لینا رشوت اور حرام ہے۔ جب کہ خود عورت کو شریعت نے نکاح کے عوض مہر لینے کا حق دیا ہے تو مرد کو یا مرد کے متعلقین کو کچھ لینا بدرجہ اولیٰ رشوت ہوگا۔ عالمگیری میں ہے:

خطب امرأة فی بیت اخیها فابی ان یدفعها حتی یدفع الیہ دراهم فدفع وتزوجها یرجع بما دفع لانہا رشوة کذا فی القنیة.

کسی کی بہن کو نکاح کا پیغام دیا۔ بھائی نے انکار کیا کہ جب تک کچھ روپے نہیں دو گے منظور نہیں، مرد نے دیا اور نکاح کر لیا جو دیا ہے واپس لے سکتا ہے اس لیے کہ یہ رشوت ہے، ایسا ہی قنیہ میں ہے۔ (ج: ۴ ص ۴۰۳)

اور در مختار و رد المحتار میں ہے:

اخذ اهل المرأة شیئا عندا لتسليم فللزوج ان یسترده لانه رشوة ای

بان ابی ان یسلمہا اخواہا او نحوہ حتی یاخذ شینا و کذا لو ابی ان یزوجہا للزوج الامتداد قائما او ہالکا لانہ رشوة. (ج ۳ ص ۱۵۶)

رخصتی کے وقت لڑکی والوں نے اگر کچھ لیا ہے تو شوہر کو اسے واپس لینے کا حق ہے کیوں کہ وہ رشوت ہے یعنی اگر بھائی وغیرہ نے بغیر کچھ لیے رخصت کرنے سے انکار کر دیا یا شادی سے انکار کر دیا تو شوہر کو حق حاصل ہے کہ اسے واپس لے لے چاہے وہ مال موجود ہو چاہے ختم ہو گیا ہو اس لئے کہ یہ رشوت ہے۔ یہاں تو ایک طرح کا جبر ہے اسی میں یہاں تک تصریح ہے کہ خسر اگر داماد سے کچھ لے وہ بخوشی دے تو بھی مال حرام ہے۔

ومن السحت ما یاخذہ الصهر من الختن بطیب نفسہ.

خسر داماد سے جو کچھ (مانگ کر) لے اگرچہ داماد بخوشی دے مال حرام ہے، تو جبر کی صورت میں بدرجہ اولیٰ حرام۔

یہ لعنت مسلمانوں نے ہندوؤں سے سیکھی۔ الناس علی دین ملوکہم لوگ اپنے بادشاہ کے طریقے پی رہتے ہیں۔ ہندوؤں کی غلامی نے ذہنوں پر اثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان کے مذہب میں تلک چڑھانے کی رسم ہے اس کی بنیاد اس پر ہے کہ چوں کہ وہ لڑکی کو میراث نہیں دیتے تو لڑکی کو گھر سے نکالتے وقت اپنی حیثیت کے مطابق بھر پور جہیز و نقد تلک کے نام پر دے دیتے ہیں کہ آئندہ اب وہ باپ کے مال میں کسی طرح کی حقدار نہیں۔ اس طریقہ نے اب اتنی بھیانک صورت اختیار کر لی ہے کہ موجودہ دور میں ہندوؤں کے دانشور اس کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔ ہندوؤں کی اس مردود رسم کو مسلمان اپنا رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جن کی مذہبی رسم تھی انہوں نے تو اس کے انجام بد سے عاجز آ کر اسے چھوڑنا شروع کر دیا اور ہم تباہ ہونے کے لیے اسے اپنا رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے مذہب میں اس کی کسی طرح گنجائش ہی نہیں۔ ہمارے مذہب میں لڑکی کو باپ کے مال میں سے وراثت کا حق ہے۔ وہ الگ لے گی اور شادی کے وقت جہیز کے نام سے الگ بٹورے گی۔ باپ بھائی پر لڑکی کا یہ دو ہر بار تقاضاے عقل کے خلاف ہے۔ اور اصول فطرت اور مرد کی شان کے بھی۔ فطری اصول سے مرد عورت پر بالادستی رکھتا ہے، اس سے قوت میں زیادہ ہے اس میں کمانے

کی بہ نسبت عورت کے صلاحیت زیادہ ہے، مجموعی طور پر عقل و تدبیر میں زیادہ ہے۔ عورت صنف نازک ہے۔ خلقی طور پر کمزور اس میں کمانے کی وہ قوت نہیں جو مرد میں ہے۔ اس کے فطری عوارض اس میں مانع، اور تخلیقی مقاصد خارج۔ ایام حمل و رضاعت میں کمانا اس کے لیے دشوار بلکہ اس کو کمانے پر مجبور کرنا ظلم۔ اس لئے اسلام نے مرد کو عورت پر حاکم رکھا۔ الرجال قوامون علی النساء اور مرد پر فرض کیا کہ نکاح کے معاوضہ میں مہر دے۔ نکاح کے بعد اسکی پوری کفالت کرے، اور جہیز کی لعنت اس کے بالکل برعکس ہے۔ گویا عورت نکاح کا معاوضہ دے اور اتنا دے جو مدت دراز تک مرد کو عیش کرنے کے لیے کافی ہو۔ گویا جہیز مانگنے والے اتنے بے غیرت ہوتے ہیں کہ عورت کا مال کھانے کی ہوس رکھتے ہیں۔

شریعت نے تو یہاں تک پابندی کی تھی ماں باپ بخوشی حسب حیثیت جو کچھ لڑکی کو جہیز میں دیں وہ لڑکی کی ملک ہے۔
ردالمحتار میں ہے:

کل احد یعلم ان الجہاز للمرأة.

سب کو معلوم ہے کہ جہیز لڑکی کی ملکیت ہے۔

مگر مرد سب جہیز کو اپنی ملک سمجھتا ہے۔ نقد اڑاتا ہے اور سامان بیچ کر برباد کرتا ہے۔ یہ حرام اور بے غیرتی کی باتیں ہیں۔ مسلمانوں میں جو لوگ ذی اثر و دین دار اور قومی ملی جذبہ رکھتے ہیں انہیں لازم ہے کہ اس جہیز کی لعنت کے خلاف ابھی سے صف آرا ہو جائیں، مسلمانوں میں اسے پھیلنے سے روکیں اور اس کے لیے سمجھانے بچھانے سے کام نہ چلے تو ہر ممکن سختی کریں ابھی ابتدا ہی میں روک تھام ہوگئی تو رک سکتی ہے۔ ورنہ بہت مشکل ہو جائے گا۔ حریص لالچی بے غیرت نہ مانیں تو ان کا سوشل بائیکاٹ کریں۔ نکاح خوان علماء میاں جی لوگوں کو لازم کہ جہاں معلوم ہو کہ جہیز کی عوض لڑکا خریدا گیا ہے وہاں نکاح پڑھانے نہ جائیں اپنے بیس آنے پیسے کے لالچ میں قوم کو تباہ نہ ہونے دیں۔ دس بیس ایسی پابندی ہوگئی تو امید ہے کہ ہندوؤں کی دھتکاری ہوئی یہ بلا مسلمانوں میں نہ پھیلے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆

فلم ”پیغام“ کی شرعی حیثیت

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ”فلم پیغام“ کے متعلق جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر بنائی گئی ہے۔ اس فلم میں اصحاب کرام اور صحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فرضی تصویریں اور کردار بھی دکھائے گئے ہیں۔ اس فلم کے علاوہ حکومت سعودی عرب نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ایک فلم سازی شروع کر دی ہے۔ دریافت طلب یہ ہے کہ ان فلموں کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ دلائل کے ساتھ بیان فرمائیں۔

المستفتی

میر صدیق علی رضوی

الجواب

فلم کوئی بھی، کیسی ہو جو واقعات فلمائے گئے ہوں جن لوگوں کو فلمایا گیا ہو وہ اچھے ہوں یا برے حرام و گناہ ہے۔ اس بارے میں احادیث اتنی کثیر و وافر ہیں کہ باعتبار معنی حد شہرت کو پہنچ چکی ہیں۔ چند احادیث درج ہیں۔

اول: امام بخاری و امام مسلم حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا تِصَابِيرٌ.

ترجمہ: جس گھر میں کتے یا تصویریں ہوں ان میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

دوم: ام المؤمنین محبوبہ محبوب رب العالمین صدیقہ بنت الصدیق عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے امامین جلیلین بخاری و مسلم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اصحاب هذا الصور يعذبون يوم القيامة يقال لهم احيوا ما خلقتم .
ترجمہ: ان تصویر والوں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا کہا جائے گا جو تم

نے بنایا ہے اس میں جان ڈالو۔

سوم: انہیں سے یہی دونوں امام روایت کرتے ہیں:

اشد الناس عذابا يوم القيامة يضاھتون خلق الله .

ترجمہ: سب سے سخت عذاب قیامت کے دن ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ عزوجل کی

بنائی ہوئی چیز کی نقل بناتے ہیں۔

چہارم: امام مسلم حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے

ہیں کہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اشد الناس عذابا عند الله المصورون .

ترجمہ: اللہ عزوجل کے یہاں سخت ترین عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔

پنجم: حضرت امام مسلم سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی ہیں کہ حضور سید

عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

ومن اظلم ممن ذهب يخلق كخلقى فيخلق ذرة او ليخلق حبة او شعيرا .

ترجمہ: اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے۔ جو میرے بنائی چیز کے مثل بناتا ہے۔ ذرا

ایک ذرہ تو بنائیں یا ایک دانہ جو تو بنائیں۔

ششم: یہی امام حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا:

كل مصور في النار يجعل لها بكل صورة صورها بنفسها فيعذب في جهنم .

ترجمہ: ہر تصویر بنانے والا جہنم میں ہے اس کی بنائی ہوئی ہر تصویر کے عوض ایک جان

بنائی جائے گی جو اسے جہنم میں عذاب دے گی۔

ہفتم: انہیں سے بخاری میں ہے:

ومن صور صورة عذب و كلف ان ينفخ فيها وليس ينفخ .

ترجمہ: ہر تصویر بنانے والے کو عذاب دیا جائے گا اور اسے تکلیف دی جائے گی کہ اس میں جان ڈالے اور وہ نہیں ڈال سکے گا۔

ہشتم: حضرت ابو جہینہ سے روایت ہے کہ فرمایا:

لعن اکل الربا مؤكله والواشمة والمصور .

ترجمہ: سود کھانے والے کھلانے والے گودنے والی گوند لگانے والی اور تصویر بنانے والے پر لعنت ہے۔

نہم: حضرت ام المومنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مسلم میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مرض وصال میں حضرت ام سلمہ اور ام حبیبہ نے حبشہ کے گرجا کا تذکرہ کیا۔ جس کا نام ماریہ تھا اس کی زیبائش اور تصویروں کا بھی تذکرہ کیا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سراقس اٹھایا اور فرمایا:

اولئك اذا مات فيهم الرجل الصالح بنوا على قبره مسجدا ثم صوروا فيها هذه الصور اولئك شرار خلق الله

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی مرتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس میں یہ تصویریں بنا لیتے۔ یہ مخلوقات میں سب سے بدتر ہیں۔

دہم: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ترمذی میں روایت ہے فرمایا:

يخرج عنق من الناس يوم القيامة لها عينان تبصران واذنان تسمعان ولسان ينطق، يقول انى و كلت بثلاثة لكل جبار عنيد و كل من دعا مع الله الها آخر والمصورين .

ترجمہ: قیامت کے دن جہنم سے ایک گردن نکلے گی جس کی آنکھیں ہوں گی جن سے دیکھے گی۔ کان ہوں گے جن سے سنے گی۔ زبان ہوگی جن سے بولے گی۔ کہے گی میں ہر ظالم متکبر اور مشرک اور تصویر بنانے والوں پر مقرر کی گئی ہوں۔

یازدہم: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مشکوٰۃ میں بحوالہ بیہقی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اشد الناس عذابا يوم القيامة من قتل نبيا او قتله نبى او احد ابويه
والمصور وعالم لم ينتفع بعلمه .

ترجمہ: قیامت کے دن سب سے سخت ترین عذاب ان لوگوں کو ہوگا جس نے کسی
نبی کو قتل کیا یا اسے کسی نبی نے قتل کیا اور تصویر بنانے والے پر اور اس عالم پر جس کے علم سے
نفع نہیں ہوا۔

جن دلوں میں ایمان ہے اور اللہ عزوجل کا خوف اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
سے شرم ہے وہ ان احادیث کو پڑھیں دیکھیں غور کریں۔ اتنی سخت وعیدوں کے باوجود کیا
تصویر کے جواز کی کوئی صورت ہے۔ بناء علیہ حضرت ملا علی قاری مرقاة میں فرماتے ہیں:

قال اصحابنا وغيرهم من العلماء تصوير صورة الحيوان حرام شديد
التحريم وهو من الكبائر لانه يتوعد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور في
الاحاديث .

ترجمہ: علما اور دیگر علما نے فرمایا جاندار کی تصویر بنانا حرام ہے سخت حرام اور یہ گناہ
کبیرہ ہے اس پر اتنی سخت وعیدیں آئی ہیں جو احادیث میں مذکور ہیں۔

جاندار عام ہے اس سے کہ وہ حیوان ہو یا انسان اور انسان عام ہے اس سے کہ وہ
عامی ہو یا خاص، صالح ہو یا فاسق عالم ہو کہ جاہل، ولی کہ نبی، بلکہ صلحا اولیا، انبیاء کی تصویریں
بنانی اور سخت تر ممنوع۔ اس لیے کہ بت پرستی کی بنیاد۔ انبیاء، اولیاء، کی تصاویر ہی ہیں۔
حدیث میں ہے کہ وہ، سواع، یعوق، نسر، قوم نوح کے صلحا تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان
کے معتقدین نے ان کی تصویریں گھروں میں رکھ لیں، ابتداءً ان کی صرف تعظیم و تکریم ہوتی
تھی بعد میں پرستش ہونے لگی۔ اس لیے صلحاء مشائخ اولیاء، انبیاء کی تصاویر بنانا اور سخت منع
ہے جیسا کہ حدیث نہم میں صلحاء کی تصویریں بنانے والوں کو فرمایا: اولئك شرار الخلق یہ
بدترین مخلوق ہیں۔

جیسا تصویر بنانا حرام ہے، اسی طرح بنوانا اور اس کی کسی طرح اعانت بھی حرام
ہے۔ ارشاد باری ہے: انکم اذا مثلهم اب تم بھی انہیں جیسے ہو۔ تفسیر خازن میں اس آیت

کے تحت فرمایا:

قال العلماء وهذا يدل على ان من رضی بالكفر فهو كافر ومن رضی بمنكر او خالط اهله كان في الاثم بمنزلتهم اذ ارضى به وان لم يباشره .

ترجمہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کفر پر راضی ہو کافر ہے اور جو گناہ پر راضی ہو یا گناہ کرنے والوں کے ساتھ میل جول کرے وہ بھی گناہ میں انہیں کے برابر ہے۔

ظاہر ہے کہ تصویر بنوانے والا خریدنے والا، تصویر بنانے پر راضی ہے۔ اس لیے ثابت ہوا کہ تصویر بنوانے والا بھی بنانے والے کے برابر گناہ میں حقدار ہے۔ ارشاد ہے:

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ .

ترجمہ: نیکی پر ہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو گناہ اور سرکشی پر تعاون نہ کرو۔ چونکہ تصویر کھینچوانے والا۔ تصویر سازی میں تصویر ساز کا معاون ہے اس لیے تصویر کھینچوانا حرام ہے۔ علاوہ ازیں حدیث نمبر ۲ ”ان اصحاب هذا الصور“ کے تحت مرقاة میں ہے: هو يشمل من يعملها او من يستعملها یہ وعید تصویر بنانے اور بنوانے والے دونوں کو شامل ہے۔

جب تصویر بنانا اور بنوانا دونوں حرام اور فلم دیکھنے والے ان دونوں گناہوں پر معاون راضی اس لیے فلم دیکھنا حرام و گناہ۔ خواہ کوئی بھی فلم ہو۔ صحیح واقعہ بنایا گیا ہو، یا غلط اور فرضی، جو کردار دکھایا گیا ہو وہ سب کا سب اچھا ہو یا برا۔ یا کچھ برا۔ خواہ مہذب اخلاق ہو یا مخرب اخلاق۔ اس لیے فلم پیغام کے بنانے بنوانے نمائش کے ناجائز ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ فلم ہے اس میں تصویریں ہیں، اسے دیکھنا دکھانا تصویر سازی جیسے گناہ کبیرہ پر اعانت ہے۔ اس گناہ کی حوصلہ افزائی ہے۔ اسے رواج دینا ہے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے اس فلم کے سخت اشد حرام ہونے کے مختلف وجوہ ہیں۔

فلم کی بنیاد ہی لہو و لعب پر ہے۔ اسی لیے اس کو ایجاد کیا گیا ہے، اور اسی لیے دیکھی اور دکھائی جاتی ہے۔ اور حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہمارا دین ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِيْ أُوْرشاد ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور دین کو لہو و لعب بنانا حرام قطعی بلکہ منجر الی الکفر ہے۔ ارشاد ہے: وَذَرُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا أَنزَلْنَا فِي قُرْآنِكَ آيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔ اس آیت میں دین سے دین اسلام مراد ہے۔ بیضاوی میں ہے:

الذی کلفوہ دعوا الیہ و هو دین الاسلام اس دین کے وہ مکلف ہیں جس کی طرف وہ بلائے گئے ہیں اور یہ دین اسلام ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا لاتتخذوا الذین اتخذوا دینکم ہزوا ولعبا من الذین اوتوا الكتاب من قبلکم و الکفار اولیاء و اتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین۔
ترجمہ: اے مومنو! ان کتابیوں اور کافروں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنایا، دوست نہ بناؤ اگر تم مومن ہو۔

پھر اس فلم کو دیکھنے والے مسلم اور غیر مسلم سبھی ہیں۔ صحابہ کرام کے لباس وضع قطع ان کے جو احوال فلم میں دکھائے گئے ہیں ان پر غیر مسلم بے دین ملحدین ضرور ہنسی اڑائیں گے ان کا شٹھا کریں گے کیا یہ دین کی اہانت نہیں۔ دین کی اس طرح ہنسی اڑانے والوں کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا، بھص قرآن حرام ارشاد ہے:

اذ لستم ابیت اللہ یکفر بہا ویستہزأ بہا فلا تقعدوا معہم۔
ترجمہ: جب تم دیکھو کہ اللہ کی آیتوں سے کفر کیا جا رہا ہے اس کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو۔

انکم اذا مشہم۔ اب تم بھی انہیں جیسے ہو، اگر اس کفر پر راضی ہوئے تو کافر خاموش بیٹھے رہے تو معصیت و گناہ، پھر یہ کہ مقدس صحابہ کرام کا سوانگ کون کر رہا ہے جو اعلیٰ درجہ کا آوارہ اور بدکار ہے شرابی، جواڑی اور وہ کون نا کردنی ہے۔ جو فلم ایکٹریں نہیں کرتے۔ یہ اس فلم کی قباحت کے لیے کیا کم ہے، ان ناپاکوں کو دیکھ کر ان پر صحابہ کرام کا شبہ ہوگا۔ کیا یہ دھوکا فریب نہیں؟ پھر ایکٹنگ کرنا سوانگ بھرنا یہ خود حرام نیز اس میں نزول وحی کی کیفیت دکھائی گئی، کیا ایک گندا فاسق بولے اور اسے روح القدس کی آواز بتانا سخت حرام اور قریب کفر

کے نہیں۔ پھر جن گندے اداکاروں کا انتخاب ہوا ہے وہ صحابہ کرام کے مشابہ ہیں۔ یہ کیسے معلوم یہ دجل و فریب ہے پھر ان کو جو لباس پہنایا گیا کیسے معلوم کہ یہی لباس اسی وضع قطع کا صحابہ کرام کا تھا۔ یہ بھی فریب۔ نیز اسی فلم میں قرآن مجید کی آیتیں غلط پڑھی گئی ہیں، یہ خود حرام اشد حرام اور قرآن کریم کی تحریف کی جانب مفطی۔ غرض کہ یہ فلم ایک نہیں دسیوں شرعی خرابی پر مشتمل ہے۔ اور محرمات کا مجموعہ ہے۔ اسے دیکھنا دکھانا دین کو کھیل تماشا بنانے پر راضی ہونا بلکہ اس میں معاون ہونا ہے کیا مسلمان کی غیرت ملی اس کو گوارا کرے گی کہ فساق و فجار کو صحابہ کرام کے روپ میں پیش کیا جائے؟ کیا مسلمان یہ پسند کرے گا کہ جبرئیل امین کی آواز اس آواز کو کہا جائے جو انتہائی آوارہ و فاسق کی ہے۔ کیا مسلمان اس کو گوارا کر سکتا ہے کہ جس پردے پر شراب خوری قمار بازی ناچ گانا، سارے فواحش کا سوانگ دکھایا جاتا ہے، اسی ناپاک پردے پر قرآن مجید کی مقدس آیات تلاوت کی جائیں۔ اس لیے کسی دیندار کو اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ یہ فلم حرام اس کو دیکھنا حرام۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(ماہنامہ اشرفیہ۔ ستمبر ۱۹۷۷ء ص: ۸۳۵ اور ۱۷۱)



انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا

جمہور علمائے اہل سنت کثر ہم اللہ تعالیٰ حتیٰ کہ سیدی وسندی وسند الفقہاء اکامین حضرت مفتی اعظم ہند دامت برکاتہم العالیہ کا یہی فتویٰ ہے کہ انجکشن سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ انجکشن خواہ گوشت میں لگنے والا ہو خواہ رگ میں اور یہی عندا تحقیق حق ہے۔ البتہ روزے کی حالت میں انجکشن لگوانا مکروہ ہے۔ انجکشن مفسد صوم یوں نہیں کہ دونوں انجکشنوں میں دوا یا غذا صرف کسی منفذ کے ذریعہ دماغ اور معدہ تک نہیں جاتی بلکہ ابتدا یا وسط یا انتہا میں صرف مسامات ہی ذریعہ رہ جاتے ہیں اور یہ بات فقہ کے ساتھ ہر ادنیٰ سی ممارست رکھنے والا جانتا ہے کہ اندرون جسم کسی دوا یا غذا کا جانا مطلقاً مفسد صوم نہیں بلکہ اس شرط پر ہے کہ وہ دوا یا غذا پیٹ یا دماغ تک منفذ ہی کے ذریعہ یقینی طور پر پہنچے، نیز یہ کہ دوا یا غذا مسامات کے علاوہ کسی منفذ کے ذریعہ داخل ہو اور مدخل اور دماغ و معدہ تک کہیں منفذ ختم ہو کر صرف مسامات ہی واحد راستہ نہ ہوں اگر ابتدا یا انتہا یا وسط کہیں بھی داخلہ کے ذریعہ صرف مسامات ہی ہوں، اگر چہ اول و آخر و وسط میں منفذ ہو تو روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اگر چہ دوا دماغ یا پیٹ تک پہنچ جائے۔

عالمگیری میں ہے:

ما یدخل من مسام البدن من الدهن لا یفطر ومن اغتسل فی ماء فوجد برده فی باطنه لا یفطره ولو اقطر شیئا من الدواء فی عینه لا یفسد صومه عندنا وان وجد طعمه فی حلقه واذا بزق فرأی الر الکحل ولونه فی بزاقه عادة المشائخ علیٰ انه لا یفسد صومه واذا اقطر فی احلیله لا یفسد صومه عندابی حنیفة ومحمد رحمہما اللہ سواء اقطر فیہ الماء او الدهن وهذا اختلاف فیما اذا وصل المشانہ واما اذا لم یصل بان کان فی قصبۃ الذکر بعد لا یفطر

بالاجماع.

ترجمہ: بدن کے مسامات کے ذریعہ جو تیل داخل ہوا وہ روزہ نہیں توڑے گا، کسی نے ٹھنڈے پانی میں غسل کیا پانی کی ٹھنڈک اندر محسوس کی روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ آنکھ میں دوا ڈالی روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ اگر چہ اس کا مزہ حلق میں محسوس کرے، اگر تھوکا، اور اس میں سرمہ کا اثر اور رنگ ملا تو عام مشائخ کا یہی مذہب ہے کہ روزہ نہیں ٹوٹا، اگر اَحْلِيل (پیشاب کی نلکی) میں ہی دوا ٹپکائی۔ امام اعظم، امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزہ نہیں ٹوٹتا، خواہ پانی ڈالیں خواہ تیل۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے کہ یہ تیل اور پانی مٹانہ میں پہنچ گیا اگر مٹانہ تک نہیں پہنچا تو بالاتفاق روزہ نہیں توڑے گا۔

اسی میں ہے:

ولفی دواء الجائفة والآمة عامة المشائخ علی ان العبرة للوصول الی الجوف او الدماغ لا لكونه رطبا او یابسا حتی اذا علمه ان الیابس وصل یفسد صومه ولو علمه ان الرطب لم یصل لم یفسد اذا لم یعلم احدھما وکان الدواء رطبا فعند ابی حنیفة رحمہ اللہ تعالیٰ یفطر للوصول عادة وقال لا لعلم العلم به فلا یفطر بالشک وان کان یابسا فلا یفطر اتفاقا .

ترجمہ: اور جائفہ (پیٹ کا وہ زخم جو معدہ تک گہرا ہو) اور آئمہ (سر کا وہ زخم جو بیچے کی جھلی تک گہرا ہو) دوا میں اکثر مشائخ کے نزدیک اعتبار معدہ یا دماغ تک پہنچنے کا ہے۔ دوا کے تر یا خشک ہونے کا نہیں۔ یہاں تک کہ اگر معلوم ہو جائے کہ خشک دوا پہنچ گئی، روزہ ٹوٹ گیا۔ اور اگر معلوم ہو کہ تر نہیں پہنچی تو نہیں ٹوٹا اور اگر پہنچنا اور نہ پہنچنا معلوم نہ ہو اور دوا تر ہو تو امام اعظم کے نزدیک روزہ توڑ دے گی، اس لیے کہ تر دوا عادتاً پہنچ ہی جاتی ہے۔ صاحبین نے فرمایا: نہیں۔ اس لیے کہ پہنچنا معلوم نہیں، خشک سے روزہ نہیں ٹوٹے گا اور اگر خشک ہے تو بالاتفاق روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

نقایہ اور اس کی شرح ملا علی قاری میں ہے:

وصل من غیر الفم دواء الی جوفه او دماغه بان داوی آمة وہی

الشجة التي تبلغ ام الدماغ من غير المسام قيد به لانه لو وصل الى جوفه من المسام لا يقضي كما لو اغتسل بالماء البارد وجد برده في كبده وكما لو ادهن فوجد الر الدهن في بوله او اکتحل فوجد طعم الکحل في حلقه ولونه في بزاقه .

دوا اگر منہ کے علاوہ کسی اور راستے سے دماغ یا پیٹ میں گئی، مثلاً آمہ میں دوا ڈالی تو روزہ ٹوٹ گیا، قضا واجب ہے بہ شرطیکہ مسامات کے ذریعہ نہ گئی ہو۔ یہ قید اس لیے لگائی کہ اگر دوا یا غذا مسامات کے ذریعہ پہنچی تو روزہ نہیں ٹوٹے گا، جیسے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور پانی کی ٹھنڈک کلیجے میں محسوس کی یا تیل لگایا اور تیل کا اثر پیشاب میں پایا، سرمہ لگایا اور سرمہ کا مزہ حلق یا رنگ تھوک میں پایا تو روزہ نہیں ٹوٹا۔
تنویر الابصار، در مختار، رد المحتار میں ہے:

ادهن او اکتحل او احتجم ان وجد طعمه في حلقه اى طعم الکحل او الدهن وكذا لو بزق فوجد لونه في الاصح. بحر في النهر لان الموجود في حلقه الر داخل من المسام هو خلل البدن والمفطر انما هو الداخل من المنافذ بالاتفاق على ان من اغتسل في ماء فوجد برده في باطنه لا يفطر .
تیل ملا، یا سرمہ لگایا، یا سینگی لگوائی تو روزہ نہ ٹوٹا اگر چہ سرمہ یا تیل کا مزہ حلق میں محسوس کرے۔ یوں ہی تھوک اور اسی کا رنگ تھوک میں ملا تو بھی مذہب اصح پر روزہ نہیں گیا۔ نہر میں فرمایا: اس لیے کہ حلق میں موجود مسامات کے ذریعہ داخل شدہ کا اثر ہے اور مسام بدن کے خلل کا نام ہے اور روزہ توڑنے والی صرف وہ دوا یا غذا ہے جو منافذ کے ذریعہ داخل ہو اس لیے کہ اس پر اتفاق ہے کہ کسی نے پانی میں غسل کیا اور اندر ٹھنڈک محسوس کی تو روزہ نہیں ٹوٹا۔
انہیں تینوں میں ہے:

داوی جائفة او آمة فوصل الدواء حقيقة إلى جوفه ودماغه اشار الى ان ما وقع في ظاهر الرواية من تفيد الا فساد بالدواء الرطب مبنی على العادة من انه يصل و إلا فالمعتبر حقيقة الوصول حتى لو علم وصول اليابس الفسد او عدم وصول

الطری لم یفسد وانما الخلف اذا لم یعلم یقینا فافسد بالطری حکما بالوصول نظرا الی العادة ونفیاہ کذا افادہ فی الفتح قلت ولم یقیدوا الاحتقان والاستعاط والاقطار بالوصول الی الجوف لظہورہ فیہا والا فلا بد منہ حتی لو بقی السعوط فی الانف ولم یصل الی الراس لا یفطر ویمكن ان یکون الدواء راجعا الی الكل (قولہ الی جوفہ و دماغہ) قال فی البحر والتحقیق ان بین جوف الراس وجوف المعدة منفذا اصلیا فما وصل الی جوف الراس یصل الی جوف البطن . (ص: ۱۰۲)

جائفہ یا آمہ میں دوا ڈالی اور دوا یقینی طور پر پیٹ اور دماغ تک پہنچ گئی۔ یقینی طور پر پہنچنے کی قید سے یہ اشارہ ہے کہ ظاہر الروایہ میں جو یوں قید آئی ہے کہ ”روزہ اس وقت ٹوٹے گا جب کہ دوا تر ہو“ یہ عادت کی بنا پر ہے کہ تر دوا پہنچ ہی جاتی ہے، معتبر حقیقت میں پہنچنا ہے یہاں تک کہ اگر خشک پہنچ گئی تو توڑ دے گی، تر نہیں، پہنچی تو نہیں توڑے گی، اختلاف اس صورت میں ہے جب کہ یہ معلوم نہ ہو کہ دوا ضرور پہنچ گئی۔ اس صورت میں عادت پر نظر رکھتے ہوئے یہ حکم ہوگا کہ تر دوا روزہ توڑ دے گی۔ اور صاحبین نے نئی کی۔ جائفہ آمہ کی دوا کو جوف اور دماغ تک پہنچنے کے ساتھ مقید کیا اور احتقان، استعاط اور اقطار میں جوف تک پہنچنے کی قید نہیں لگائی کیوں کہ ان میں جوف تک پہنچنا ظاہر ہے ورنہ روزہ توڑنے کے لیے یہ قید ضروری ہے یہاں تک کہ اگر ناک کی دوائیوں میں رہ گئی اور سر تک نہیں چڑھی تو نہیں توڑے گی۔ ممکن ہے دوا سے اوپر ذکر کردہ تمام دوائیں مراد ہوں۔ بحر میں کہا کہ تحقیق یہ ہے کہ سر اور معدہ کے جوفوں کے مابین منفذ اصلی ہے تو جو سر میں گئی وہ پیٹ میں گئی۔

غور کریں یہ تمام اساطین ملت یہ تصریح فرما رہے ہیں کہ جو دوا مسامات کے ذریعہ اندرون جسم گئی اگر چہ دماغ تک پیٹ تک پہنچ جائے مگر روزہ نہیں توڑے گی، روزہ توڑنے والی وہی دوا یا غذا ہے جو کسی منفذ اصلی کے ذریعہ پیٹ یا دماغ میں جائے، اس کلیہ پر جو جزئیات متفرع ہیں ان پر ایک گہری نظر پھر ڈال لیں۔

۱۔ پانی میں غسل کیا ٹھنڈک پیٹ اور جگر میں محسوس کی، ظاہر ہے کہ یہ ٹھنڈک پانی

کے اندر پہنچنے کی بنا پر ہے مگر روزہ نہیں ٹوٹا، اگر چہ پانی پیٹ میں پہنچ گیا، اس لیے کہ پانی مسامات کے ذریعہ پیٹ میں گیا۔ کسی منفذ کے ذریعہ نہیں۔

۲۔ آنکھ میں دوا ڈالی، سرمہ لگایا، دوا اور سرمہ آنکھ کے پردوں سے گزر کر دماغ میں گیا، دماغ سے حلق میں آیا، مگر روزہ نہیں ٹوٹا۔ حالانکہ اس مسافت میں اکثر راستہ منفذ ہے۔ آنکھ کے پردوں کے بعد دماغ تک، دماغ سے حلق تک منفذ ہی کے ذریعہ گئی۔ پھر بھی روزہ نہیں ٹوٹا۔ اس لیے کہ داخلہ مسامات کے ذریعہ ہوا تھا، اعلیل میں دوا ڈالی دوا مثانہ تک پہنچ گئی مگر روزہ نہیں ٹوٹا، حالانکہ دوا منفذ میں ڈالی گئی اس لیے کہ مثانہ تک پہنچ کر منفذ ختم ہو گیا مثانہ کی جھلی حائل ہو گئی اس کے آگے پیٹ تک جانے کے لیے مثانہ کے مسامات ہی واحد راستہ ہیں۔

۳۔ سر کے ایسے گہرے زخم میں دوا ڈالی جو بھیجے کی جھلی تک گہرا ہو، اگر دوا دماغ تک نہیں پہنچی تو روزہ نہیں گیا کیوں کہ دماغ تک منفذ کے ذریعہ نہیں پہنچی حالانکہ مسامات کے ذریعہ پہنچنا یقینی ہے۔

۴۔ جائفہ پیٹ کے ایسے زخم میں دوا ڈالی جو شکم تک گہرا ہو مگر دوا شکم تک نہیں پہنچی روزہ نہیں گیا حالانکہ مسامات کے ذریعہ پیٹ تک جانا یقینی ہے اس لیے کہ منفذ کے ذریعہ نہیں پہنچی۔

۵۔ تیل ملا تیل کا اثر پیشاب میں ملا روزہ نہیں ٹوٹا حالانکہ تیل کو پیٹ میں پہنچے بغیر پیشاب میں اس کا اثر ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اس لیے کہ منفذ کے ذریعہ نہیں پہنچا بلکہ مسامات کے ذریعہ پہنچا نہ کورہ بالا نصوص سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے۔

فائدہ اولی: مسامات کے ذریعہ جو دوا یا غذا اندرون جسم داخل ہو وہ مفسد صوم نہیں اگرچہ معدہ اور دماغ تک پہنچ جائے خواہ مدخل اور معدہ تک اور دماغ تک صرف مسامات ہوں کہیں کوئی منفذ نہ ہو جیسے نہایا اور پانی پیٹ میں پہنچا، خواہ معدہ اور دماغ تک پہنچنے میں مسامات اور منافذ کے ذریعہ ہوں، اس کی تین صورتیں ہیں: اول ابتدائے مسامات ہوں اور بعد میں معدہ اور دماغ تک منفذ۔ جیسے آنکھ میں دوا ڈالی یا سرمہ لگایا اور وہ حلق تک پہنچ گیا۔ ثانی ابتدائے منفذ ہو۔ انتہائے منفذ ہو۔ وسط میں مسامات ہوں جیسے اعلیل میں دوا ڈالی اور مثانہ تک پہنچی کہ ادھر مثانہ تک منفذ سے اوپر مثانہ کے بعد منفذ ہے۔ ثالث صرف ملتہی

پر مسامات ہوں دو منفذ میں ڈالی اور منفذ ہی کے ذریعہ آگے بڑھی مگر معدہ اور دماغ کے جوف سے پہلے مسامات ہوں اور اخیر میں جوف و معدہ و دماغ تک پہنچنے کا ذریعہ صرف یہی مسامات ہوں کہ کوئی منفذ نہ ہو تو بھی مفسد صوم نہیں۔ اس لیے کہ علت افساد منحصر ہے منافذ کے ذریعہ وصول الی الجوف میں اور یہ علت یہاں منقش ہے۔ **نقض صوم کی علت وصول بالمنافذ میں منحصر ہے اس پر صاحب نہر کا یہ ارشاد جسے علامہ شامی نے نقل فرما کر مقرر کیا۔**
دلیل ہے۔ فرماتے ہیں:

والمفطر انما هو الداخل من المنافذ.

روزہ توڑنے والی صرف وہی دوا ہے جو منافذ کے ذریعہ داخل ہو۔

اور جب منتہی پر صرف مسامات ہی رہ گئے تو صرف منافذ سے داخل نہیں ہوا۔

فائدہ ثانیہ: منفذ کے ذریعہ بھی کسی دوا کا غذا کا مطلقاً اندرون جسم جانا مفسد نہیں

کہ کھال کے اندر گھسی اور روزہ گیا بلکہ مفسد اس وقت ہے جب کہ دوا یا غذا معدہ یا دماغ تک پہنچے اگر دوا اندرون جسم منفذ ہی کے ذریعہ گئی مگر دماغ یا معدہ کے جوف تک نہیں پہنچی تو روزہ نہیں گیا۔ جیسے کلی کیا تاک میں دوا ڈالی مگر پانی حلق میں اور دوا دماغ تک نہیں چڑھی روزہ نہیں ٹوٹا۔ اعلیل میں دوا ڈالی۔ اندرون جسم گئی، حتیٰ کہ مثانہ تک پہنچ گئی، روزہ نہیں گیا، آمہ جائفہ میں دوا ڈالی مگر دماغ اور معدہ تک نہیں گئی، روزہ نہیں گیا، اگر اندرون جسم دوا جانا مطلقاً مفسد ہوتا تو لازم تھا کہ کلی کرتے ہی تاک ہی میں دوا ڈالتے ہی اعلیل میں پکاتے ہی آمہ جائفہ میں ڈالتے ہی روزہ ٹوٹ جاتا، بلکہ آمہ جائفہ کی قید نہ تھی بلکہ یہ زخم میں دوا ڈالنا مفسد ہوتا۔

فائدہ ثالثہ: فقہائے کرام کے اس ارشاد (وصل الی الجوف) سے مراد مطلقاً

اندرون جسم عروق اور ہر کھوکھلی جگہ نہیں بلکہ صرف دماغ اور معدہ ہے۔ جس پر یہ جزیہ نص قاطع ہے کہ اعلیل میں دوا ڈالی اور مثانہ میں گئی مگر روزہ نہیں گیا، مثانہ ایک کھوکھلا عضو ہے اور یقیناً جوف ہے اگر جسم کا ہر جوف مراد ہوتا تو یقیناً اسے مفسد صوم ہونا چاہئے تھا۔ اس میں اگرچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے مگر یہ اختلاف ہمارے معروضہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ہے اس لیے کہ یہ اختلاف اس لیے نہیں کہ مطلقاً ہر جوف میں دوا جانا مفسد

ہے یا نہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ مثانہ اور معدہ کے مابین کوئی منفذ ہے یا نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے علم میں یہ بات تھی کہ مثانہ اور معدہ کے مابین منفذ ہے اس لیے انہوں نے اسے مفسد کہا مگر امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ مثانہ اور معدہ کے مابین منفذ نہیں۔ اس لیے انہوں نے یہ حکم دیا کہ مفسد نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ امام ابو یوسف بھی حضرات طرفین کے ساتھ اس بات پر متفق ہیں کہ مفسد وہی دوا اور غذا ہے جو معدہ تک پہنچے۔ اب جب کہ مثانہ اور معدہ پھاڑ کر انسانی اعضاء کی ہیئت و ماہیت معلوم ہو گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ مثانہ اور معدہ کے مابین کوئی منفذ نہیں پیشاب مثانہ میں مثانہ کی جھلیوں کے سوراخوں سے نکلتا ہے تو یہ اختلاف باقی نہیں رہا۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

والاختلاف مبني على انه هل بين المثانة والجوف منفذ او لا وهو ليس باختلاف على التحقيق والظاهر انه لا منفذ له وانما يجتمع البول فيها بالترشح كذا يقول الاطباء . (جلد دوم : ص ۲۹۹)

یہ اختلاف اس پر مبنی ہے کہ مثانہ اور معدہ کے مابین منفذ ہے یا نہیں اور یہ حقیقت میں اختلاف نہیں اور ظاہر تر یہ ہے کہ یہاں منفذ نہیں پیشاب مثانہ میں ٹپک کر جمع ہوتا ہے جیسا کہ اطباء کہتے ہیں:

الغرض منفذ کے ذریعہ اندر داخل شدہ دوا اسی وقت مفسد ہے جب کہ معدہ اور دماغ تک پہنچے، ان کے علاوہ دوسرے اجواف میں جانا قطعاً مفسد نہیں بلکہ علامہ شامی و طحاوی نے صاحب بحر کی اس تحقیق کو برقرار رکھا ہے کہ مفسد اصل میں جوف معدہ میں جانے والی دوا ہے۔ دماغ میں جانے والی دوا مفسد اسی بنا پر ہے کہ دماغ اور معدہ کے مابین منفذ براہ راست ہے یہ اس بات پر نص ہے کہ مفسد صرف معدہ میں جانے والی دوا ہے۔ اس لیے جوف سے مراد صرف معدہ ہے اور دماغ مراد ہونا اس لیے ہے کہ دماغ اور معدہ میں براہ راست منفذ اصلی کے ذریعہ تعلق ہے، ہماری مراد پر اول دلیل یہ ہے، جس کے بعد کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ جوف سے مراد اندرون جسم کے گوشت ہڈی دوسرے جوف نہیں صرف معدہ اور دماغ ہیں

اوپر ذکر کردہ نصوص اور جزئیات اور تینوں فوائد کو اچھی طرح ذہن میں رکھ لیں اور اب انجکشن کی ماہیت کو سامنے رکھ کر غور کریں، انشاء اللہ تعالیٰ ہر منصف پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انجکشن قطعی مفسد صوم نہیں خواہ وہ رگ کا ہو خواہ گوشت کا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ گوشت والے انجکشن کے جسم کے مختلف حصوں میں پہنچنے کی کیفیت یہ ہے کہ گوشت کے اندر بکثرت باریک باریک خلا ہوتے ہیں، جنہیں مسامات کہا جاتا ہے کہ ان میں ہر وقت خون بھرا رہتا ہے یہ خون اگر چہ خالص نہیں ہوتا بلکہ دیگر اخلاط کے ساتھ مزوج ہوتا ہے مگر غلبہ خون ہی کو ہوتا ہے اس لیے ہم نے اسے خون ہی کہا، جب یہ انجکشن لگتا ہے تو پچکاری کے دباؤ سے دوا بجز ان مسامات میں گھس کر خون میں مل جاتی ہے، خون کہیں بھی ٹھہرتا نہیں بلکہ ہر وقت جسم میں گردش کرتا رہتا ہے اس لیے یہ دوا خون کے ساتھ گردش کرتے کرتے وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں اسے کام کرنا ہے چوں کہ دوا میں ایسی قوت ہوتی ہے کہ وہ مخصوص جگہ اثر انداز ہو اس لیے وہیں اثر ڈالتی ہے، جیسے کھانے پینے والی دواؤں کا حال یہ ہے کہ سب کی سب پہلے معدہ میں جاتی ہیں پھر ہضم ہو کر اخلاط میں ملتی ہیں اور جہاں ان کی ضرورت ہے وہاں پہنچ کر اپنا کام کرتی ہیں، گوشت میں لگنے والی دوا انجکشن سے مسامات میں پہنچی پھر رگوں میں رفتہ رفتہ جہاں کے لیے تھی وہاں پہنچی، معدہ یا ماغ کی دوا ہے تو دوا یا اس کا اثر دماغ یا معدہ تک ضرور پہنچے گا مگر چوں کہ دوا کا داخلہ مسامات کے ذریعہ ہوا ہے، اس لیے روزہ نہیں توڑے گی۔ جیسا کہ اوپر گذرا کہ مسامات کے ذریعہ داخل شدہ دوا مفسد نہیں۔ اس کا جزئیہ اوپر گزرا کہ آنکھ میں دوا ڈالی یا سرمہ لگایا، دوا یا سرمہ آنکھ سے حلق میں پہنچا مگر مفسد نہیں اس لیے کہ داخلہ مسامات کے ذریعہ ہوا تھا، اگر چہ بعد میں منفذ سے حلق تک گیا، اسی طرح یہاں بھی مسامات کے بعد اگر چہ منفذ سے دوا ابتداء رگ میں جاتی ہے جو ضرور منفذ ہے مگر رگوں کا تعلق براہ راست معدہ یا دماغ سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔ علم تشریح میں اس کی پوری تحقیق دیکھی جاسکتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جگر میں اخلاط اربعہ علی قدر مراتب مزوج ہو کر شرائین اور اورطہ کے ذریعہ پورے جسم میں جاتے ہیں ان میں غلبہ خون ہی کو ہوتا ہے اس کا عمدہ حصہ اعضا کی غذا بنتا ہے بقیہ جسمانی فضلات کے مل

جانے سے سیاہ اور کثیف ہو کر دل میں جاتا ہے، دل اسے پھیپھڑوں میں ڈھکیل دیتا ہے پھیپھڑوں میں باہر سے گئی ہوئی صاف ہوا بھری ہوتی ہے جو پھیپھڑوں کے مسامات اور کیسوں میں موجود رہتی ہے، خون اس تازہ ہوا سے صاف ہوتا ہے، اس کی کثافت اور دخانی مادہ ہوا میں رہ جاتا ہے جسے پھیپھڑے باہر پھینک دیتے ہیں اور خون صاف شفاف سرخ تازہ ہو کر پھر دل میں جاتا ہے اور دل شراکین اور اورط کے ذریعہ دوبارہ پورے جسم میں پہنچاتا ہے، اور پھر یہ خون کثیف دخانی مادوں سے سیاہ ہو کر دل میں اور دل سے پھیپھڑوں میں اور پھیپھڑے میں صاف اور تازہ ہو کر پھر دل میں جاتا ہے دل اسے پورے جسم میں پہنچاتا ہے۔ یہی چکر زندگی بھر چلتا رہتا ہے اور یہی انسانی نشوونما و قوت کا مدار ہے۔ یہ انجکشن جب رگ میں لگا تو رگوں کے خون میں دوا مل گئی اور خون کے ساتھ دل میں اور پھر پھیپھڑے میں پھر دل میں اور دل سے پورے جسم میں پہنچی رگ والا خون دوا لے کر براہ راست نہ دماغ میں گیا نہ معدہ میں بلکہ دل میں گیا اور دل سے بھی براہ راست دوسرے اعضا میں نہیں گیا بلکہ پھیپھڑوں میں اور پھیپھڑوں سے واپس آ کر پھر رگوں کے ذریعہ دوسرے اعضا حتیٰ کہ دل اور معدہ میں گیا بہر حال پھیپھڑے بیچ میں ضرور آتے ہیں، اب پھیپھڑے کی ساخت اور ان میں خون کی جگہ معلوم کریں مسئلہ صاف ہو جائے گا۔ ماضی قریب کے مسلم الثبوت طبیب حاذق حکیم اجمل خاں اپنی مشہور و معروف کتاب ”حاذق“ میں لکھتے ہیں:

پھیپھڑوں کی ساخت نرم اور کھل ہے، ان میں نرم گوشت اور غصہ ریف اور قصبہ الریہ اور شریانوں اور وریدوں کی شاخیں پائی جاتی ہیں۔ پھیپھڑے کی بالائی سطح پر آبدار جھلی اور باقی ساخت میں خانہ دار جھلی اور پکلیے نرم ریٹے اور ہوا کے چھوٹے چھوٹے خانے پائے جاتے ہیں جو باہم مل کر لوٹھڑے بناتے ہیں انہیں ہوا کے کیسوں یا خانوں میں ہوا کی نالی یعنی قصبہ الریہ کی باریک باریک شاخیں ختم ہوتی ہیں، پھیپھڑے کی شریان اور ورید کا جال بھی پھیپھڑے کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے، یہاں تک کہ ہر ایک ایسے اعضا میں سے ہیں جو فضلات جسم کو خارج کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ان کا یہ فعل بھی ہے کہ وہ خون کو صاف کرتے ہیں صاف اور سرخ خون جسم کی پرورش کے لیے براستہ شراکین تنفس کے ذریعہ تمام جسم

میں چلا جاتا ہے، اور مختلف اعضا کی عروق شعریہ تک پہنچ کر وہ کثیف اور سیاہ ہو جاتا ہے جس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس میں جسمانی فضلات کے دخانی مادے مل جاتے ہیں، جب کثیف وریڈی خون پھیپھڑوں کے ہوائی کیسوں کے عروق شعریہ تک پہنچتا ہے تو اس کا رنگ فوراً ہی سرخ ہو جاتا ہے کیوں کہ خون کا دخانی مادہ ہوائی کیسوں کے اندر آ جاتا ہے اور ان ہوائی کیسوں کی لطیف ہوا خون میں مل کر اسے صاف اور سرخ بنا دیتی ہے۔

پھیپھڑوں کی اس تشریح سے کوئی یہ دھوکہ نہ کھائے کہ دیگر اعضا سے پھیپھڑے میں خون کی آمد و رفت براہ راست ہے۔ نہیں بلکہ بواسطہ دل ہے، اسی کتاب میں۔ دل کی تشریح میں ہے: دل کے دونوں دائیں بائیں اذن ایک ہی وقت میں پھلتے ہیں اور دائیں بائیں بطن ایک ہی وقت میں سکڑتے ہیں جب دونوں اذن پھلتے ہیں تو دائیں اذن میں بالائی اور زریں وریڈوں کے ذریعہ جسم کا کثیف اور سیاہ خون آ جاتا ہے اور بائیں اذن میں پھیپھڑوں کی وریڈوں کے ذریعہ صاف شدہ خون آ جاتا ہے کہ پھر دائیں اذن کا سیاہ خون درمیانی سوراخ کے راستے بائیں بطن میں اور بائیں اذن کا بائیں بطن میں چلا جاتا ہے، اور جب دونوں بطن سکڑتے ہیں تو دائیں کا خون بذریعہ شریان الریہ پھیپھڑوں میں چلا جاتا ہے اور بائیں بطن کا خون بذریعہ شریانین اور اورطہ تمام جسم میں چلا جاتا ہے۔

الغرض! جملہ اطبا کا اس پر اتفاق ہے کہ رگوں سے خون براہ راست دل میں جاتا ہے اور دل ہی کے ذریعہ پھیپھڑوں میں جاتا ہے، براہ راست پھیپھڑے میں نہیں جاتا۔ اور نہ ایسا ہے کہ بغیر پھیپھڑوں میں گئے دل ہی سے واپس ہوتا ہو۔ پھیپھڑے میں ضرور جاتا ہے اور پھیپھڑوں میں صاف ہو کر پھر دل میں آتا ہے اور دل سے پھر پورے جسم میں جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پھیپھڑوں کے جن ہوائی کیسوں میں جاتا ہے اس کی حیثیت جوف کی ہے یا مسامات کی۔ اوپر ذکر کردہ تشریح سے یہ بات ظاہر ہے کہ پھیپھڑے کی جن ہوائی کیسوں میں جاتا ہے ان کی حیثیت مسامات ہی کی ہے، تو اس کا حاصل یہ ہے کہ خون دل سے مسامات میں گیا اور مسامات سے واپس ہو کر پھر دل میں آیا۔

اب اگر مان بھی لیا جائے کہ دل سے معدہ اور دماغ تک کوئی منفذ ہے تو بھی یہ دوا

مفسد نہیں ہوگی اس لیے کہ اگر چہ ابتداءً منفذ میں گئی اور انتہا پر بھی منفذ ہی سے پیٹ یا دماغ میں پہنچی مگر بیچ میں مسامات حائل ہیں تو جس طرح اعلیٰ میں دوا ڈالی اور وہ مٹانہ تک پہنچی مگر روزہ نہیں ٹوٹا اگرچہ دوا کا داخلہ بھی منفذ ہی میں ہوا اور مٹانہ کے بعد بھی منفذ ہے مگر بیچ میں مٹانہ کی جھلی حائل ہے جس میں اگرچہ چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں مگر ان کی حیثیت مسامات ہی کی ہے منفذ کی نہیں اسی طرح رگ والے انجکشن میں اگرچہ دوا منفذ میں گئی مگر بیچ میں پھیپھڑے کے ہوائی کیسوں کی عروق شعریہ حائل ہیں جن کی حیثیت مسامات کی ہے اس لیے اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا، علاوہ ازیں دل سے دماغ یا معدے تک کوئی منفذ نہیں دل سے شراین اور اورطہ نکل کر پورے جسم میں پھیلی ہیں، جن کے ذریعہ خون تمام اعضا کی تغذیہ کے لیے جاتا ہے۔ مگر یہ شراین دماغ یا معدہ میں کھلتی نہیں بلکہ ان سے نکلی ہوئی عروق شعریہ کے مبداء پر ختم ہو جاتی ہیں، عروق شعریہ ہی کے ذریعہ مسامات میں خون جا کر گوشت اور پوست کا جز بنتا ہے تو اگر ہوائی کیسوں کے عروق شعریہ کو بطور مجادلہ کوئی منفذ مانے بھی تو چوں کہ منجہا پر مسامات ہیں اور دماغ اور معدہ میں انہیں مسامات ہی کے ذریعہ پہنچے گی اس لیے اب بھی مفسد نہ ہوئی، اس لیے کہ ہم اوپر ثابت کر آئے کہ اگر منجہا پر بھی مسامات ہی کے ذریعہ داخل ہیں تو مفسد صوم نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ رگ والے انجکشن میں بھی دوا کسی منفذ سے گئی مگر معدہ اور دماغ تک نہیں پہنچتی بلکہ وسط میں یا انتہا پر منفذ ختم ہو کر صرف مسامات ہی کے ذریعہ دوا دماغ یا معدہ میں جائے گی۔ اس لیے مفسد صوم نہیں مگر چوں کہ انجکشن کی تقریباً تمام دواؤں میں اسپرٹ ہوتی ہے اور یہ بدترین قسم کی شراب ہے، نجس العین ہے۔ اس لیے روزہ کی حالت میں انجکشن لگوانا مکروہ ضرور ہے اس لیے کہ روزہ سے مقصود طہارت و تزکیہ باطنی ہے اور یہ انجکشن جس میں نجس العین دوا ہے باطن کو نجس کرنے والی ہے، اس لیے روزہ میں کسی قسم کے انجکشن ہرگز نہ لگوائے جائیں، اور ان سے اجتناب کیا جائے۔

ہاں! اگر یہ معلوم ہو کہ دوا اسپرٹ اور ہر قسم کی شراب اور نجاست سے پاک ہے اور خارجی طور پر بھی اسپرٹ استعمال نہ کریں تو کراہت بھی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

پوتے کی وراثت

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ اسلامی رو سے بیٹے کی موجودگی میں پوتے میراث سے محروم رہتے ہیں۔ اگر چہ وہ دوسرے بیٹے کے بطن سے ہوں اور اگر چہ وہ چھوٹے کام کاج کر کے کمانے کے لائق نہ ہوں۔ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان بے سہارے بچوں کو جو یتیم لا وراثت ہوں۔ ضرور میراث ملے بلکہ بیٹوں سے زائد ملے تاکہ وہ برباد نہ ہوں خلاف عقل اسلام کا قانون کیوں ہے اس کی وجہ بتائیے۔

این ایس ایڈوکیٹ، رانچی

جواب:

عقل کو کیوں داغ لگاتے ہیں۔ تقاضاے عقل یہی ہے البتہ جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں پوتوں کو ضرور دادا کی میراث ملنی چاہیے۔ مگر جذبات کے تقاضے اور عقل کے تقاضے میں بہت تفاوت ہے، ہر جذبہ کا مقتضی صحیح ہو یہ ضروری نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی جذبات عقل کو اتنا مغلوب کر لیتے ہیں کہ عقل صحیح رہنمائی نہیں کر پاتی۔ یہی قصہ یہاں بھی ہے، بنیادی بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر سیاسی تمدنی معاشی قانون کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے۔ بے بنیاد قانون، قانون نہیں ہوتا۔ نکاسیر بھاجی نکاسیر کھا جا ہوتا ہے۔ اسی طرح میراث کے جملہ جزئیات کی بھی ایک بنیاد ہے جو عین تقاضاے عقل کے مطابق ہے۔ وہ بنیاد ضرورت احتیاج تیسری تنگ دستی مجبوری نہیں، وہ بنیاد رشتہ ہے اور مختلف درجوں کے رشتوں کی موجودگی میں قریب سے قریب تر ہے۔ اگر وراثت کی بنیاد محتاجی تیسری تنگ دستی مجبوری مانی جائے تو لازم کہ فارغ البال بیٹے کی موجودگی میں تنگ دست اپانج یا یتیم پڑوسی ترکہ پائے بیٹا نہ پائے۔ اور اگر دونوں کو مخلوط بنیاد ٹھہرائیں تو لازم کہ فارغ البال بیٹے کی موجودگی میں تنگ

دست اپانچ یا یتیم بھائی میراث پائے۔ بیٹا نہ پائے اگر صرف رشتہ کو بنیاد قرار دیں ضرورت اور مجبوری نہ شامل کریں جب بھی تو چاہیے کہ بیٹا بھی پائے اور بھائی بھی پائے، چچا بھی پائے وغیرہ وغیرہ حالانکہ تمام دنیا کے عقلا اور لطف یہ کہ یہی عقلا جو بیٹے کی موجودگی میں پوتے کو میراث دینے پر مصر ہیں، بیٹے کی موجودگی میں بھائی اور چچا کو میراث نہیں دیتے۔ حالانکہ رشتہ تینوں جگہ ہے بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ بیٹے کی موجودگی میں بھائی اور بھائی کی موجودگی میں چچا میراث سے کچھ نہیں پائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ وراثت کی بنیاد صرف رشتہ نہیں بلکہ رشتہ اقرب فالاقرب ہے یعنی قریب تر رشتہ دار کے ہوتے ہوئے اس کی بہ نسبت دور کا رشتہ دار خواہ وہ کتنا ہی ضرورت مند ہو، خواہ وہ کتنا ہی مجبور ہو، اگر چہ دودھ پیتا یتیم ہو، میراث کا حق دار نہیں۔ اور یہی عقل کا تقاضا ہے تو اب فیصلہ آسان ہے کہ بیٹے کی بہ نسبت پوتا رشتہ میں ضرورت دور ہے اور بیٹا بہ نسبت پوتے کہ ضرورت قریب تر ہے اس لیے بیٹے کی موجودگی میں پوتا محروم رہتا ہے، اگر چہ وہ کتنا ہی کم سن ہو اگر چہ وہ یتیم ہو اگر چہ وہ مجبور ہو اس لیے کہ بنیاد یقینی نہیں رشتہ ہے وہ بھی قریب سے قریب تر کی ترتیب کے ساتھ ہے۔

عقل سے جذبات کا دباؤ ختم کر کے سوچے تو بات بالکل صاف ہے ورنہ غور کیجیے، بھائی اور پوتے ایک درجہ کے ہیں، پوتا بیٹے کی اولاد ہے اور بھائی باپ کی، دونوں کے درمیان یہ بات مشترک ہے کہ بیچ میں ایک پیڑھی حائل ہے، پھر کیوں بھائی کی میراث بھائی نہ پائے اور دادا کی میراث پوتا پائے۔ وجہ فرق بتانا پڑے گا اور اگر یہ کہیں کہ پوتا اس کا جز ہے بھائی اس کا جز نہیں بلکہ یہ جس کا جز ہے وہ اس کا جز ہے تو بتائیے کہ نواسا اور نواسی تو اس کے جز کے جز ہیں، اور بقیہ وہی صورت ہے جو پوتے میں ہے، پھر چاہیے کہ نواسے اور نواسی کو میراث ملے مگر اس کو نہ تو کوئی کہتا ہے اور نہ کوئی قانون ہے آخر کیوں؟ گھوم پھر کر پھر وہیں آنا پڑے گا کہ چونکہ وراثت کی بنیاد رشتہ اقرب فالاقرب کی ترتیب ہے اس لیے نواسا اور نواسی میراث نہیں پائیں گے۔ پھر یہی قاعدہ پوتے اور پوتی میں کیوں از کار رفتہ ہے۔ وہی عقل پر جذبات کا دباؤ، اور دوسرا ذہنی دباؤ ماحول کا "الناس علی دین ملوکہم" لوگ اپنے بادشاہ کے طریقے پر رہتے ہیں۔ انگریز جب حکمراں تھے تو ان کا تمدن ان کا قانون کچھ لوگوں کو اچھا

لگتا تھا اور اب جب کہ حکمراں ہندو ہیں تو ان کا طور طریقہ اچھا لگنے لگا، ان کے یہاں چونکہ یہ قانون ہے کہ متوفی بیٹے کی اولاد زینہ زندہ بیٹوں کی موجودگی میں میراث کی حق دار ہے، اس لیے اب مسلمانوں کو بھی یہی صحیح نظر آنے لگا، لیکن ذی عقل جانتا ہے کہ غور و فکر پر جب کوئی رعب ہو اور وہ بھی حکمراں کا رعب تو عقل صحیح کام نہیں کرتی۔ اس لیے کسی بھی معاملہ کو صحیح طریقے سے جانچنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ عقل مہر قسم کے جذبات سے ہر قسم کے دباؤ سے آزاد کر لیا جائے، پھر سوچا جائے تو فیصلہ صحیح ہوگا ورنہ فیصلہ کا غلط ہونا لازم ہے۔ قیمتی، بے چارگی، ضرورت احتیاج کا علاج وراثت کے استحقاق کے علاوہ شریعت نے کچھ اور رکھا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دادا اپنے پوتوں کو اپنی زندگی ہی میں جو چاہے دے دے۔ یا وصیت کر جائے، تہائی تر کے تک وصیت کا اس کو حق ہے۔ دادا جب جانتا ہے کہ میرے تر کے میں سے پوتوں کو کچھ نہیں ملے گا اور وہ چاہتا ہے کہ ان کو ملے تو زندگی میں دینے سے کس نے روکا تھا، وصیت کرنے سے کس نے منع کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پوتے کی وراثت

سوال:

پوتے کے سلسلے میں آپ کا جواب موصول ہوا، اور اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا جواب مکمل طور سے تسلی بخش ہے، اس کے قبل میں نے یہ بات بہت سے علما کے سامنے رکھی مگر کسی نے ایسا جواب نہ دیا جس سے پورا اطمینان حاصل ہوتا، ایک صاحب نے تو یہ کہہ کے بات ٹال دی کہ یہی اللہ و رسول کا حکم ہے۔ یہ ہماری عقل کا قصور ہے کہ جو سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک صاحب نے بتایا کہ پوتا ڈبل میراث پائے گا، ایک دادا کی اور ایک اپنے باپ کی جو پاچکا ہے۔ جب میں نے کہا کہ یہی بات تو اس بیٹے کی اولاد پر صادق ہے جو میراث پارہا ہے، اس کی اولاد اپنے باپ کی میراث پائیں گے جو منجملہ ہوگی، دادا کی میراث کا تو خاموش ہو گئے۔ آپ نے صحیح نباضی کی، اس مسئلہ کو سمجھنے میں خارج جذبات تھے، جب میں

نے پہلی بار پڑھا تو بہت کم سمجھ میں آیا، مگر جب دوبارہ پڑھا تو سمجھ کے قریب ہوا، تیسری مرتبہ جب ہر آئٹم کو بغور ٹھہر ٹھہر کر پڑھا تو بالکل سمجھ میں آ گیا۔ آپ نے جس طرح آسان کر کے اسے سمجھایا ہے، وہ آپ ہی کا حق ہے۔

اب صرف ایک شبہ رہ گیا کہ جب وراثت کی بنیاد رشتہ قریب سے قریب تر ہے تو چاہیے کہ بیٹا اور بیٹی کو برابر حصہ ملے، حالانکہ بیٹی کو بیٹے کا آدھا حصہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے نا کہ وہ دوسرے خاندان کی فرد ہے اسی طرح نواسا بھی چونکہ دوسرے خاندان کا فرد ہے اس لیے میراث سے محروم ہوگا۔ اور پوتا چونکہ دادا ہی کے خاندان کا فرد ہے اس لیے اسی کو ملنا چاہیے۔ امید کہ اس شبہ کو بھی آپ حل کر دیں گے، اس کا جواب ایک صاحب نے یہ دیا ہے کہ یہ مسئلہ خلاف عقل ہے، مگر میں ایسا مسلمان ہوں کہ شریعت کے کسی بھی مسئلہ کو خلاف عقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اب آپ بتائیے کیا بات ہے؟

(این، ایس، رانچی)

جواب:

آپ کو میراث کی بات سمجھ میں آگئی اور آپ کو اطمینان کلی حاصل ہو گیا۔ اس کی مجھے بے حد خوشی ہے، یہ بات اپنی جگہ حق ہے کہ اسلام چونکہ دین فطرت ہے۔ فرمایا گیا: فِطْرَةُ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا. اللہ کی ڈالی ہوئی بنا پر لوگوں کو پیدا کیا، اور فطری شے مقتضائے عقل کے خلاف نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں اللہ عزوجل حکیم ہے، اور حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم الہی کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے۔ ہم کیا ہماری عقلیں کیا! ہو سکتا ہے کہ حکم الہی کے رموز تک ہمارے عقل کی رسائی نہ ہو سکے۔ اللہ عزوجل کے احکام کی کنہ کو جانا تو بڑی بات ہے۔

بعض دفعہ ایک انسان دوسرے انسان کی باتوں کی کنہ کو نہیں جان پاتا، حالانکہ بات وہی درست ہوتی ہے، مسٹر جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ مسٹر گاندھی کی باتیں ابتدا میں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، مگر ہوتا وہی جو وہ کہتے۔ بار بار کے تجربے سے جب ہم نے دیکھ لیا کہ جو وہ کہتے ہیں وہی صحیح ہوتا ہے تو میں ہمیشہ ان کی باتوں کو بلا دلیل مان لیا

کرتا تھا۔ جب دنیا داروں کی باتوں میں یہ حال ہے تو اللہ عزوجل اور رسول ﷺ کی باتوں کو اپنی عقلی کی ترازو پر تولنا کس قدر غلط ہوگا، اس کا عادی بننا کہ جو بات ہماری سمجھ میں آئے تو اسے مانیں اور جو سمجھ میں نہ آئے اس کا انکار کریں، آدمی کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے۔

عادت اس کی ڈالنی چاہیے کہ اسلام کے ہر قانون کو بلا دلیل مانیں گے۔ اپنی سمجھ میں آئے یا نہ آئے آپ نے اگر میری سابقہ فتویٰ ہی کو وقت نظر سے پڑھا ہوتا تو یہ شبہ زائل ہو جاتا۔ شریعت نے بیٹی کو بالکل محروم نہیں کیا ہے، باپ کی میراث میں سے حصہ دیا ہے۔ اگر دوسرے خاندان کا فرد ہونا وراثت سے محرومی کا سبب کلی ہوتا تو شادی شدہ بیٹی کو کچھ نہ ملتا، مگر اس کو بھی ملتا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ رشتہ برترتیب اقرب فالاقرب وراثت کے استحقاق کی غیر متزلزل بنیاد ہے، اس پر دوسرے خاندان کا فرد ہونا بھی اثر انداز نہیں، ورنہ بیٹی کو کچھ نہ ملتا بہن کو کچھ نہ ملتا، شادی شدہ ہوتی یا نہ ہوتی۔ آخر غیر شادی شدہ لڑکی اور بہن آج نہیں تو کل بالیقین دوسرے خاندان کا فرد ہوگی۔

اب رہ جاتی ہے یہ بات کہ پھر بیٹی کو بہن کو بیٹے اور بھائی کا آدھا کیوں ملتا ہے جب کہ رشتہ قربت میں ایک درجے کا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ مرد پر اپنے اہل و عیال کی مکمل ذمہ داری ہوتی ہے اور عورت پر کسی کے اخراجات کا بار نہیں ہوتا بلکہ اس کے سارے اخراجات اس کے شوہر کے سر ہوتے ہیں، اس لیے مرد کو عورت سے زیادہ ملنا لازم ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ استحقاق وراثت کی بنیاد بہر حال رشتے پر بہ ترتیب اقرب فالاقرب ہے البتہ حصہ کی کمی بیشی دوسرے اسباب پر مبنی ہے، جو مختلف ہیں اور جن کی تفصیل بہت دراز ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

(ماہنامہ پاسبان، الہ آباد: مئی ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۰ تا ۱۸)



باب چہارم

اسفار
و
مشاہدات

سفر نامہ حرمین طیبین

أَجْنُ شوقاً الیٰ دیار لقیۃ فیہا جمال سلمیٰ
کہ می رساند ازاں نواحی پیام وصلت بجانب ما
جمال روئے تو قبلہ جاں، حریم کوئے تو کعبہ دل
فان سجداً الیک نسجد وان سعینا الیک نسعیٰ

جب سے شعور بیدار ہوا اس وقت سے اس کی تڑپ تھی کاش! کبھی اللہ کے گھر اور اس کے حبیب کے در کی حاضری نصیب ہو جائے، اس تمنا کی تکمیل کے لیے کتنی دعائیں کیں، کتنے آنسو بہائے ان کو شمار نہیں کر سکتا۔ جب حجاج اور زائرین کے قافلے حرمین طیبین جاتے دل میں ہوک اٹھتی مگر تڑپ تڑپ کر رہ جاتا اب جب کہ عمر کی اخیر منزل میں ہوں اسباب و وسائل پر نظر کرتا تو سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہ ہوتا مگر اللہ عزوجل اور اس کے حبیب ﷺ جس پر چاہیں کرم فرمائیں۔ اس بے مایہ پر بھی نگاہ کرم ہو گئی اور سال گزشتہ انہوں نے مجھے بلا لیا۔

ہوا یہ کہ محسن ملت الحاج سیٹھ ابراہیم احمد صاحب برکاتی مالک فرینڈ اسٹورس بھنڈی بازار ممبئی کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ مجھے اپنے صرّفے سے حج و زیارت کرائیں۔ چنانچہ بغیر میری کسی تحریک و خواہش کے مجھے خط لکھا اور ساتھ ہی ساتھ درخواست کے فارم بھی بھیج دیے کہ اگر آپ پسند کریں تو فارم پر دستخط کر کے بھیج دیں میں بقیہ سب کارروائی انجام دے لوں گا۔ جب حاجی صاحب موصوف کا یہ خط ملا تو فرط مسرت سے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کچھ دیر تک تو ایسا محسوس ہوا گویا میں خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن بیداری پر خواب کا گمان کب تک رہتا میں نے بلا تامل ضروری خانہ پری اور دستخط کر کے فارم ان کے پاس بھیج دیے، چوں کہ حاجی صاحب موصوف نے خود ہی ہوائی جہاز سے سفر کی پیش کش کی تھی اس لیے

مجھے بھی کوئی تامل نہ ہوا۔ سالہائے گزشتہ کے ریکارڈ سے امید واثق تھی کہ درخواست منظور ہو ہی جائے گی۔ اب میں انتظار کی گھڑیاں گننے لگا لیکن اس سال عاجز میں حج و زیارت کی کثرت کی وجہ سے ہوائی جہاز سے بھی سفر کے خواہش مند بہت سے حضرات کی درخواستیں نامنظور ہوئیں اس میں میری بھی درخواست تھی اگر میں نے بغیر ان کی وساطت کے از خود براہ راست درخواست دی ہوتی تو شاید اس سال محروم ہی رہ جاتا مگر حاجی صاحب موصوف حج و زیارت کے سلسلے کے تمام امور سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے فوراً بلا تاخیر متبادل کارروائی کی حج و زیارت کے سلسلے میں ایک ہزار ایسی محفوظ سیٹیں ہیں کہ اگر کسی کا کوئی عزیز یا شناسا سعودیہ عربیہ میں ہو اور وہ تمام اخراجات کے لیے ڈرافٹ بھیج دے تو اسے اس ایک ہزار محفوظ نشستوں میں سے منظوری مل جاتی ہے۔

چنانچہ حاجی صاحب موصوف نے جدہ میں رہنے والے اپنے ایک شناسا سے ڈرافٹ منگالیا اور اس طرح ان ایک ہزار محفوظ نشستوں میں سے میرے لیے منظوری حاصل ہو گئی، اور پہلے جہاز سے میری منظوری آ گئی۔

اس سال حج کمیٹی اور حکومت ہند کے مابین کچھ معاملات میں ایسا الجھاؤ پیدا ہوا جس کی وجہ سے ہوائی جہاز کی روانگی کی تاریخیں بہت تاخیر سے متعین ہوئیں، اس کے نتیجے میں عاجز میں حج و زیارت کو بہت ذہنی کوفت بھی اٹھانی پڑی اور پریشانیاں بھی۔ ہماری حکومت کا محکمہ ڈاک اتنا چوہٹ ہو چکا ہے کہ اس پر اعتماد ہی نہیں کیا جاسکتا، نہ خطوط کا اعتبار، نہ تاریخوں کا۔ رجسٹریاں اتنی دیر میں ملتی ہیں کہ اس کے بھروسے سے اس کا اندیشہ تھا کہ شاید جہاز کی روانگی کی تاریخ گزر جانے کے بعد امیدواروں کو ملے اس لیے اندازے سے اکثر عاجز میں وقت سے بہت پہلے ممبئی پہنچ گئے۔ یہی میرا بھی حال ہوا حاجی صاحب موصوف ہی کے مشورے کے مطابق ۱۰ جولائی بروز چہار شنبہ گھر سے ممبئی کے لیے نکل گیا، اور ۲۳ شوال ۱۴۲۱ جولائی بروز جمعہ بعد نماز مغرب ممبئی چھج گیا۔ اسٹیشن پر لینے کے لیے خود حاجی ابراہیم احمد صاحب اور ان کے بڑے بھائی حاجی علی محمد صاحب موجود تھے۔ ممبئی تک بھیجنے کے لیے میری

لخت جگر وحید الحق سلمہ اور عزیز ارشد مولانا حافظ عبدالحق زید مجد ہم استاذ الجامعۃ الاشرافیہ بھی ہمراہ تھے۔ ممبئی میرا قیام عطاری مسجد پھول والی گلی بھنڈی بازار میں رہا۔ وہاں اس مسجد کے خطیب اور ممبئی میں اہل سنت کے اہم نقیب جناب قاری سراج اظہر صاحب نے سر آنکھوں پر رکھا۔ ہر قسم کا آرام اور سہولت پہنچائی۔ ۱۲ جولائی سے لیکر ۲۷ جولائی تک ممبئی قیام رہا۔ اس اثنا میں ممبئی کے کثیر احباب نے دعوت توضح کی، مثلاً حاجی علی محمد برکاتی، خود ابراہیم احمد صاحب برکاتی، الحاج سیٹھ احسان اللہ خاں صاحب عرف پہلوان سیٹھ، جناب سیٹھ غلام مصطفیٰ خاں صاحب کرلا، حافظ غلام دستگیر صاحب، الحاج سیٹھ عبدالجید صاحب، جناب سیٹھ للن صاحب چمبور، جناب سیٹھ ریاض الدین صاحب وغیرہم خصوصیت سے عزیز مولانا ولی اللہ سلمہ خطیب نورانی مسجد چمبور اور اس محلہ کے دیگر احباب اہل سنت نے۔ حضرت مولانا سید شاہ حامد اشرف صاحب بانی درالعلوم محمدیہ نے درالعلوم میں مدعو کیا، اور وہاں تمام طلبہ و مدرسین کے سامنے گل پوشی و ضیافت فرمائی۔ مولیٰ عزوجل ان سب کو جزاے خیر عطا فرمائے۔ آمین

عالی جناب الحاج سیٹھ ابراہیم احمد برکاتی کے صاحبزادے الحاج سیٹھ زبیر احمد برکاتی سلمہ نے پاسپورٹ و ڈرافٹ اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور دیگر لوازمات کے لیے کافی جدوجہد کی، مولیٰ عزوجل ان کی خدمات کا دارین میں بہترین صلہ عطا فرمائے، بہت ہی نیک، سعید، خوش اخلاق صاحبزادے ہیں۔

میں گھر سے اکیلا ہی چلا تھا، مناسب ساتھی کی تلاش تھی، ممبئی جا کر معلوم ہوا کہ حضرت الحاج شاہ ابوالحسنین آل رسول نظمی میاں برکاتی، صاحبزادہ و جانشین حضرت سید العلماء قدس سرہ مع اپنی والدہ ماجدہ و عمہ مکرمہ کے اسی جہاز سے جا رہے ہیں، اس سے بے پناہ مسرت ہوئی، اور حقیقت میں یہ صاحب البرکات حضرت سیدنا شاہ ابوالبرکات قدس سرہ کا اپنے اس ناکارہ غلام پر خصوصی کرم تھا کہ اپنے صاحبزادے والا تبار کی اس عظیم سفر میں ہمراہی کا شرف عطا فرمایا پھر بعد میں معلوم ہوا کہ جناب مولانا خلیل احمد خاں پٹھان خطیب

مسجد آستانہ مخدومیہ ممبئی ماہم شریف، اور جناب مولانا قاری تراب علی صاحب خطیب مینارہ مسجد ممبئی اسی ہوائی جہاز سے جا رہے ہیں۔ میں نے اللہ عزوجل کا شکر ادا کیا کہ مجھے اپنے گھر اور اپنے حبیب کے در پر بلا یا تو ہمراہی بھی ایسوں کی عطا فرمائی جو سب میرے حسب منشا تھے۔ فالحمد للہ!

ہمارا ہوائی جہاز سات بجے شام کو قبل مغرب روانہ ہو اور گیارہ بجکر ۲۰ منٹ پر جدہ پہنچ گیا۔ مغرب کی نماز ہوائی جہاز ہی میں پڑھی۔ ہوائی جہاز کے عملہ نے مغرب کے وقت اعلان کیا کہ مغرب کا وقت ہو گیا ہے، حجاج نماز پڑھ لیں۔ تمام حجاج نے سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی مگر میں نے اور حسنین میاں صاحب نے کھڑے ہو کر پورے رکوع و سجدے کے ساتھ نماز مغرب پڑھی، چلتے ہوئے ہوائی جہاز میں بھی کھڑے ہونے میں کوئی وقت نہیں ہوتی اس لیے سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھنے میں نماز صحیح نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ قیام فرض ہے اسی طرح رکوع اور سجدہ بھی، سیٹوں پر بیٹھے بیٹھے یہ تینوں فرض ادا نہیں ہو پاتے، حجاج کو اس کا خیال رکھنا فرض ہے۔

ہوائی جہاز سے نکل کر ایئر پورٹ کے ہال کمرے میں آئے، اسی ہال کمرے میں باجماعت نماز عشا ادا کی گئی۔ تقریباً ساری رات ہال کمرے میں گزری۔ ہال کمرہ ایئر کنڈیشن تھا، تمام حجاج سردی سے ٹھنڈے گئے۔ سعودی ہوائی جہاز کا عملہ بہت ست روی اور تاخیر سے حجاج کو باہر نکالتا۔ تقریباً ہوائی جہاز کے چھپنے کے دو گھنٹے کے بعد مسافرین کو باہر نکالنا شروع کیا، وہ بھی اتنی سستی کے ساتھ کہ ساڑھے چار بجے حاجیوں کو نکانے میں تین گھنٹے کا وقت لگ گیا۔ لائن میں کھڑے کھڑے تمام حاجی تھک کر چور ہو گئے، مگر عیش پرست نجدی ملازمین کو اس کی کوئی بھی پرواہ نہ ہوئی۔ خدا خدا کر کے ایئر پورٹ سے باہر نکلے تو حضرت حسنین میاں صاحب کو لینے کے لیے جدہ شہر سے ان کے رشتے دار موجود تھے۔ ڈرافٹ بھنانے کے بعد میں انہیں کی گاڑی میں حضرت حسنین میاں کے ساتھ مکہ معظمہ حاضر ہوا۔

ہماری گاڑی جب مسجد حرام شریف کے پاس شارع عبداللہ بن زبیر پر پہنچی تو حرم

شریف میں نماز فجر ہو چکی تھی۔ نمازی باہر نکل رہے تھے، گاڑی وہیں ایک طرف کھڑی کر دی حضرت حسنین میاں اور ان کے رشتے دار، شیخ جمال اللیل صاحب کے دفتر کی تلاش میں گئے مستورات موٹر ہی میں رہیں۔ میں ترساں لرزاں حرم شریف میں نماز فجر کے لیے چلا، اس وقت میرا جو حال تھا اس کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا وضو خانہ وہاں سے کافی دور تھا، مجبور زمزم شریف ہی سے وضو کیا، مسجد حرام شریف میں حاضر ہوا جب کعبہ شریف پر نظر پڑی تو وفور مسرت میں بے اختیار منہ سے چیخ نکل گئی، دھاڑیں مار مار کر رونے لگا کچھ دیر تک خود فراموشی کا عالم رہا مگر پھر خیال آیا کہ باہر مستورات اکیلی ہیں مجھے نماز فجر پڑھ کر جلدی پہنچنا چاہیے۔ سسکیوں کے ساتھ نماز فجر ادا کی، علاوہ رکوع و سجدے کے نگاہ جمال کعبہ سے ہٹتی نہ تھی، بہت اختصار کے ساتھ نماز ادا کر کے اٹھنے کے لیے قدم باہر آیا موٹر کے پاس پہنچا، اتنے میں حضرت حسنین میاں صاحب بھی واپس آ گئے، اور ہم لوگ عبدالکریم نوری صاحب کے دفتر میں پہنچے، دو ایک مکان دیکھے گئے مگر وہ پسند نہ آئے میری خواہش یہ تھی کہ ایسا مکان ملتا جس میں مستورات الگ رہتیں اور مرد الگ رہتے مگر چار آدمیوں میں اس قسم کا مکان لینا ہم لوگوں کی وسعت سے باہر تھا، اس لیے میں نے حسنین میاں صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ مولانا خلیل احمد صاحب سے مل کر مشترکہ طور پر ایسے دو مکانات لیے جائیں کہ مستورات کے لیے الگ اور مردوں کے لیے الگ رہائش ہو سکے۔ مگر مولانا خلیل احمد صاحب جدہ سے دوسری موٹر میں آئے تھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اترے ہیں، ناشتے کے بعد عمرہ کرنے کے لیے ہم لوگ حرم شریف میں حاضر ہوئے۔

معلم صاحب نے کسی انتہائی گنوار آدمی کو ہمارے ساتھ کر دیا تھا جسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ باب السلام کہاں ہے؟ اور حرم میں داخلہ کے آداب کیا ہیں،؟ وہ ہم لوگوں کو کسی دروازے سے اندر لے گیا اور حجر اسود کے پاس کھڑا کر کے یہ کہہ کر کہ ”آپ لوگ طواف کیجئے، میں اس دروازے پر بیٹھا ہوں چلا گیا، جب کہ معلمین کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ پہلی بار کی حاضری میں ان کا کوئی آدمی ساتھ ساتھ رہتا ہے جو عمرے کو پورے ارکان ادا کراتا

ہے۔ خیر! ہم لوگوں نے از خود ہی طواف کیا، بھٹڑ کم تھی اس لیے بڑے اطمینان سے طواف ہوا، رکن یمانی کا استلام ہر پھیرے میں نصیب ہوا، البتہ حجر اسود کے بوسہ لینے میں ازدحام زیادہ تھا اور دشواری بھی تھی اس لیے صرف ایک بار نصیب ہوا۔ یہ بھی اللہ عزوجل کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ کتنے ایسے بھی حجاج ہیں جنہیں حجر اسود کی زیارت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ طواف سے فارغ ہو کر ہم دونوں اس شخص کے پاس آئے وہ ہم لوگوں کو لے کر صفا مروہ کی سعی کرائے بغیر دروازے سے باہر آ گیا اور قیام گاہ کی طرف لے چلا۔ ہم لوگ ابھی صبح ہی کو حاضر ہوئے تھے۔ صفا مروہ کے جائے وقوع سے واقف نہ تھے، اس لیے اس کے پیچھے چلے، انتظار کرتے رہے کہ وہ اب بتائے گا، یہ صفا ہے یہاں سے سعی شروع کرو۔ مگر ہم لوگوں کو لیے ہوئے معلم صاحب کے گھر پہنچ گیا، اس پر مجھے تعجب ہوا اور غصہ بھی آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہم لوگوں کو صفا مروہ پر کیوں نہیں لے گیا؟ سعی کیوں نہیں کرائی؟ تو اس نے کہا جلدی کیا ہے، سعی پھر کر لیجیے گا۔ غصہ تو بہت آیا مگر ہم لوگوں نے صبر کیا میں نے کہا: ہم ابھی سعی کریں گے، صفا مروہ پر لے چلو۔ وہ ہم لوگوں کو لے کر پھر اٹھے قدم چلا اور مسجد حرام شریف لایا۔ مجھے پھر شبہ ہوا کہ معلوم نہیں یہ کہاں لے جا رہا ہے، میں نے پھر اس سے کہا ہم لوگوں کو صفا پر لے چلو، اس نے کہا ہاں! صفا ہی پر لے چل رہا ہوں۔ بہر حال! وہ ہم لوگوں کو لا کر صفا پر چھوڑ کر چلا گیا، اور یہ کہہ گیا میں چلتا ہوں آپ لوگ آجائے گا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے سعی کی۔

سبحان اللہ! دیوانوں کی ایک بھٹڑ ہے جو صفا مروہ کے درمیان انتہائی جوش و مستی کے ساتھ دیوانوں کی طرح دورڑ رہی ہے، ہم نے بھی نیت کی اور سعی شروع کی۔ زندگی بھر چلتے رہے اور کبھی کبھار دوڑے بھی ہیں، مگر سعی میں جو لذت تھی، جو کیف تھا، جو مستی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ سعی کرنے کے درمیان ہی مولانا خلیل احمد خاں مل گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میری خواہش یہ ہے کہ ہم سب ایک ساتھ رہیں اور اس طرح کا مکان لیا جائے کہ مرد الگ رہیں اور عورتیں الگ۔ وہ بھی ہماری اس رائے پر بہت خوش ہوئے، سعی سے فارغ

ہونے کے بعد ان کے ہمراہ ان کی قیام گاہ پر آئے، وہیں حجامت بھی بنوائی، دن بھر وہیں رہے۔ حسنین میاں تو درمیان میں چلے آئے، بعد عصر وہ پھر آئے اور مکان کی تلاش شروع ہوئی۔ مسفلہ میں شارع حمزہ پر ۲۶ ہزار ریال میں تین کوٹھریاں طے ہوئے جس میں ایک بڑا ہال تھا، اس میں ہم سب مرد تھے۔ دو کوٹھریاں تھیں ان میں مستورات رہیں۔ کمرے میں اے، سی بھی فٹ تھا، اور فرنیچر بھی تھا، باورچی خانہ غسل خانہ الگ الگ تھا، پانی کے لیے تل لگے ہوئے تھے، کوئی دقت نہیں تھی، حمد اشاہی ضلع بستی کے منشی حاجی محبت علی صاحب مع اہلیہ کے بھی ہم لوگوں کے ساتھ تھے۔

اب ہم لوگوں کا دو گروپ بن گیا۔ ایک مولانا خلیل احمد خاں صاحب پٹھان کا۔ دوسرے میرا اور حسنین میاں اور منشی محبت علی صاحب کا۔ گروپ کا مطلب صرف یہ ہے کہ کھانے پینے کے لیے دو حصہ ہوئے، ہمارا کھانا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ الگ پکتا تھا، اور مولانا خلیل احمد خاں صاحب وغیرہ کا الگ، ہم لوگ سب بڑے اتفاق و اتحاد اور محبت و یگانہ کے ساتھ رہے۔ عام طور پر حجاج کے مابین جو تم تڑاک ہو جاتا ہے، اس سے ہم لوگ محفوظ رہے، میں اپنے ساتھ غلہ نہیں لے گیا تھا، وہ لوگ کچھ غلہ لے گئے تھے، لیکن اپنی غایت مہربانی سے اپنے ساتھ کھلاتے پلاتے رہے۔

زندگی کی معراج

مکہ معظمہ میں نو دن قیام کے بعد سویریں دن مدینہ طیبہ کے لیے گورنمنٹ کی بس سے ۱۱/۱۱ منٹ پر چلے، اور ساڑھے سات بجے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ بس اسٹینڈ سے سامان لکڑی کے ٹھیلے پر لادوا کر مسجد اقدس کے قریب جانب شرق ایک گلی کے کٹڑ پر سامان رکھا گیا مولانا خلیل احمد خاں صاحب مکان کی تلاش میں نکلے۔ اسی اثنا میں عشا کی نماز بھی ہو گئی، قریب ہی شارع رومیہ میں ”دار طیبہ“ نام کی بلڈنگ میں دو کمرے چھتیس سو ریال میں لیے گئے۔ ایک میں مردوں نے قیام کیا دوسرے میں عورتوں نے۔ مکان پہنچے کے بعد جب

اطمینان ہوا تو مسجد اقدس کے دروازے بند ہو چکے تھے اس لیے اس وقت حاضری نہ ہو سکی، ارادہ یہی تھا کہ رات کے پچھلے پہر نہادھو کر کپڑے بدل کر بارگاہ اقدس میں حاضری دیں گے اس اثنا میں کہیں سے گنبد خضریٰ کی بھی زیارت نہ ہو سکی لیکن ہوا یہ کہ مجھے شدید نزلہ کی شکایت تھی، کسی چائے کی دکان کی تلاش میں، میں نکلا، گلی میں سیدھے جنوب کی طرف چلا گیا، اس گلی کے باہر وہ وسیع میدان ہے جو مسجد اقدس اور جنت البقیع کے درمیان ہے۔

میں اس میدان میں نکل گیا، جب وہنی طرف مڑا، نظر اٹھائی تو سامنے گنبد خضریٰ اپنی پوری زیبائیوں اور عظمتوں کے ساتھ جلوہ فرما تھا، نظر پڑتے ہی میں پہلے ہکا بکارہ گیا، اور صلوٰۃ و سلام بھی نہ عرض کر سکا۔ کچھ دیر تک سکتے و خود فراموشی کا عالم رہا، بدن کا نپتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو میں نے دست بستہ صلوٰۃ و سلام عرض کرنا شروع کیا، انہائی خوشی میں آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ روتا جاتا، صلوٰۃ و سلام عرض کیے جاتا۔ اس وقت کی کیفیت ایسی تھی کہ نہ وہاں سے قدم آگے بڑھانے کی جرأت ہوتی تھی، اور نہ پیچھے ہٹانے کو جی چاہتا تھا۔ میں شاید یونہی رہ جاتا کہ ایرانی غول بیابانی کی طرح میرے قریب سے گزرے اور ان وحشیوں نے مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ میں گرتے گرتے بچا، اور وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ان ناپاکوں کے ساتھ جسم کے مس ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے قبل والا رابطہ اس وقت پیدا نہ ہو سکا۔ کچھ دیر کے بعد میں چائے کی تلاش میں چلا گیا۔ چائے پی کر قیام گاہ پر آیا، اور سونے کے لیے لیٹا، اس کے باوجود کہ سفر کی تکان تھی، بس اسٹینڈ سے قیام گاہ تک پیدل آنے کا بھی اثر تھا، مگر نیند کو سوں دور تھی، کبھی اپنی اس فیروز بخشتی پر خوشی کی لہر آتی کہ کہاں میں، اور کہاں یہ ارض پاک!۔

کبھی یہ خیال کہ اپنا یہ سیاہ منہ داغدار دامن لے کر سرکار کی بارگاہ میں کیسے حاضر ہوں، انتہائی ندامت سے پسینے میں شرابور ہو گیا، کبھی ان کی رحمت بے پناہ کا تصور کر کے اپنی ہر اش و ندامت کو دور کرتا۔ اس حال میں، میں کب تک رہا یا نہیں۔ پھر نیند آگئی، دو بجے آنکھ کھلی، سب ساتھی بے خبر سو رہے تھے، میں اٹھا اور کپڑے نکالے خوب اچھی طرح غسل کیا پھر پورے جسم پر خوشبو ملی کپڑے پہنے، کپڑوں پر بھی جہاں تک ہو سکا خوشبو ملی، ایک نیا جوڑا

خاص اس وقت کے لیے اٹھا رکھا تھا، اسے پہنا اوپر سے شيروانی پہنی۔ شيروانی پہنتے وقت خیال یہ آیا کہ کاش میں اپنے ہمراہ جبہ لایا ہوتا، اور بجائے شيروانی کے جبہ پہنتا اس لیے کہ جبہ حضور اقدس ﷺ کا لباس تھا، اور شيروانی تو ماضی قریب کی ہندیوں کی ایجاد ہے، پھر سفید رنگ کا وہ عمامہ جو نور چشم ڈاکٹر محبت الحق سلمہ نے ساتھ کر دیا تھا، باندھا۔

میں جب نہا کر غسل خانے سے نکلا تو حضرت حسنین میاں صاحب بھی بیدار ہو چکے تھے، انہوں نے بھی غسل کیا کپڑے بدلے اور ہم دونوں ساتھ ساتھ بارگاہ اقدس میں حاضری کے لیے چلے۔ باب جبریل سے داخل ہوئے، تہجد کی اذان ہو چکی تھی، پوری مسجد اقدس آدمیوں سے بھر چکی تھی، ہم لوگ دو صفوں کے بیچ میں ہو کر باب ابو بکر صدیق تک چلے گئے کہیں کوئی گنجائش نظر نہیں آئی، مجبوراً باہر نکل کر چاروں طرف نظر دوڑائی، قریب ہی تھوڑی سی جگہ نظر آئی، ہم دونوں وہاں پہنچے، پہلے نوافل پڑھی پھر نماز فجر کی اذان کا انتظار کرتے رہے۔ اذان کے بعد ہم دونوں نے اپنی نماز الگ پڑی، ہم ابھی فرض سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ جماعت ہونے لگی، ہم لوگ نماز سے فارغ ہو کر اوراد و وظائف میں مشغول رہے، جب جماعت ہو چکی اور بھیڑ کم ہوئی تو ہم لوگ باب السلام سے مسجد اقدس میں داخل ہوئے، بھیڑ اب بھی بہت تھی، دبتے دھکے کھاتے ہم لوگ مواجہہ اقدس کی طرف چلے تقریباً ۱۵ منٹ میں مواجہہ اقدس تک پہنچے مگر پیچھے لوگوں نے اتنے زور سے دھکے دیے کہ ہم لوگ وہاں کھڑے نہ رہ سکے، دل مسوسا کر رہ گئے اور پیچھے سے جو ریلا مسلسل چلا آ رہا تھا، اسی کے دباؤ سے ہم لوگ بلا قصد و اختیار باب جبریل تک پہنچ آئے سوچا گیا کہ اب پھر واپس چلیں لیکن لوگوں کے اثر و دھام کی وجہ سے ہم لوگ واپس نہ ہو سکے باہر نکلے تو دیکھا سیہ پوش ایرانی مرد و عورت کچھ کھڑے کچھ بیٹھے پورے میدان پر قابض ہیں، زور سے سلام پڑھ رہے ہیں، ایک شور برپا تھا، بہر حال! کچھ دور جا کر ہم لوگوں کو کھڑے ہونے کی جگہ ملی وہیں سے سلام عرض کیا گیا مگر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ رات والا کیف و سرور حاصل نہ ہو سکا، ہمارے چاروں طرف ایرانیوں کا غول بیابانی تھا، قریب ہی سر پر سیاہ پگڑی رکھے ان کا کوئی مجتہد تھا جو انہیں بلند آواز سے سلام پڑھوارا تھا ابتداءً تو اس کی طرف دھیان نہیں گیا مگر جب

ہم لوگ صلوٰۃ و سلام سے فارغ ہو گئے تو میں نے سنا وہ مجتہد حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر سلام پڑھوا رہا تھا، جس میں اور بہت سے کلمات کے ساتھ خاص طریقے سے یہ دو کلمے بھی تھے۔ السلام و علیک ایہا المظلومۃ، السلام علیک ایہا الشہیدۃ۔

رافضیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دروازے میں دبا دیا تھا، اس وقت وہ امید سے تھیں دبنے سے اسقاط ہو گیا، اور اسی میں حضرت سیدہ کا وصال ہو گیا، اپنے اسی جھوٹے اعتقاد کے مطابق وہ حضرت سیدہ کو مظلومہ اور شہیدہ بھی کہہ رہا تھا، یہ حقیقت میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تبرا ہے، صرف اسی ایک موقع پر نہیں بلکہ میں نے بارہا ایرانی رافضیوں کے منہ سے یہ تمنا سنا ہے۔

یہ نجدی حکومت کی حق پرستی کہ رافضی علانیہ مسلسل تبرا بکلیں، تو ان سے کوئی پریشانی نہیں لیکن اگر کوئی سنی وارفہ شوق ہو کر جالیوں کو بوسے دے دے یا منبر اقدس کو بوسہ دے دے تو اسے جھڑکتے بھی ہیں، دھکے بھی دیتے ہیں، اور مار بھی دیتے ہیں۔ میں نے تو حرمین مطہرین جا کر پہ محسوس کیا کہ وہاں مآثر و مزارات کو ہاتھ لگانے اور بوسے دینے کے سوا اور کوئی چیز جرم نہیں، داڑھی منڈواؤ، فلم دیکھو گھروں میں ٹیلی ویژن لگاؤ، اس پر عریاں فحش، مخرب اخلاق سین دیکھو، گانے سنو، تصویریں کھینچو، تصویریں بیچو خریدو کوئی چیز جرم نہیں۔ میں نے معلمین کے آفسوں میں دیکھا کہ ٹیلی ویژن لگے ہوئے ہیں، دن رات فلمیں چلتی رہتی ہیں، بازاروں میں علانیہ مصر کی مشہور مغنیہ ام کلثوم اور دنیا کے مشہور گانے والے، گانے والیوں کے پاکستانی فلمی گانوں کے کیسٹ بکتے ہیں، ان پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نجدی حکومت کے طرف داروں سے سوال کرتا ہوں کہ کیا یہ سب چیزیں جائز ہیں، قرآن مجید کی جو بے حرمتی وہاں آنکھوں سے دیکھی وہ کسی چیز کی نہیں دیکھی حجاج بہترین سے بہترین قرآن مجید خرید کر دونوں حرم میں رکھ دیتے ہیں، جب ان کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے، تو بعد عشا کوڑا پھینکنے والے ٹرکوں میں دروازوں کے باہر پڑے ہوئے چپلوں کے ساتھ قرآن مجید کی جلدوں کو بھی ٹرک میں اس طرح بھرتے ہیں جیسے کوڑا بھرا جاتا ہے، قرآن مجید کی جلدوں کو بوروں میں کس کر

گھیٹ کر لے جاتے ہیں اور اٹھا کر ٹرک میں پھینک دیتے ہیں، پھر انہیں قرآن مجید پر ٹرک میں بیٹھتے ہیں اور لے جا کر کہیں پھینک آتے ہیں۔

حجاج میں بھی ایسے ایسے گنواروں کو دیکھا کہ قرآن مجید کا تکیہ لگائے ہوئے سو رہے ہیں مگر کسی نجدی سپاہی یا مطوع کو توفیق نہیں ہوئی کہ ان گنواروں کو ٹوکتا۔ حجاج بیٹھے تلاوت کر رہے ہیں اور گنوار قرآن کی طرف پاؤں کر کے سو رہے ہیں، مگر انہیں کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں میں نے کئی حاجیوں کو اس پر ٹوکا کچھ تو مان گئے، کچھ جھگڑے پر آمادہ ہو گئے، غرض کہ نجدی حکومت میں یہ سب ناکردنیاں ہوتی ہیں مگر نجدیوں کے وظیفہ خوار اس پر چوں تک نہیں کرتے، مآثر و مزارات کے ہاتھ لگانے و بوسہ دینے پر نجدیوں کے بے جا تشدد پر عمل در آمد کرانے کی شب و روز کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال ایرانیوں کو کھلی چھوٹ ہے کہ وہ جو چاہیں کریں حتیٰ کہ انہیں تمرا بکنے کی بھی اجازت ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے جالیوں میں دیکھنا شروع کیا کہ حظیرہ اقدس جالیوں سے کتنے فاصلے پر ہے، اور اس کی شناخت کیسی ہے کہ مجھے نجدی سپاہی نے شرک شرک، حرام حرام کہہ کے دھکا دے دیا حالانکہ میں نے جالیوں کو ہاتھ میں بھی نہیں لگایا تھا، اپنے اسلاف کی ہدایت کے مطابق اپنے ہاتھوں کو ہرگز اس لائق نہیں سمجھتا کہ ان مقدس جالیوں کو مس کریں مجھے بہت ہی غصہ آیا میں نے اس بد بخت سے کہا: النظر الی داخل الشباب شرک حرام؟ تو درندے نے دونوں ہاتھوں سے میرے مونڈھوں کو پوری طاقت سے پکڑا، اور اتنے زور سے دھککا دیا کہ اگر وہاں زائرین کھڑے نہ ہوتے تو میں گر پڑتا، جی میں تو آیا کہ اس ظالم سے دودھ ہاتھ کر لو اگر چہ جانتا تھا کہ میرا کیا حال ہوگا مگر سرکار اپنے دشمنان مبارک سے دیکھ تو لیتے کہ کفار قریش کے جانشین ان کے غلاموں کے ساتھ ان کے دربار عالی جاہ میں ان کے روبرو کتنا ستم ڈھاتے ہیں، اور پھر میں جھوم جھوم کر یہ عرض کرتا۔

بجرم عشق تو ام می کشند غوغا نیست

تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشانیست

مگر پھر خیال آیا کہ یہاں جنگ و جدال اور غوغا حرام ہے، اس لیے خون کے گھونٹ

پی کر رہ گیا، میں کھڑا ہو کر غصہ بھری ہوئی آنکھوں سے اس موذی کو گھور رہا تھا، اور وہ مجھے گھور رہا تھا۔

اسے اتنی تاب کہاں، پھر وہ لپک کر میری طرف بڑھا، اور میرا ہاتھ پکڑ کر کچھ دور گھسیٹ کر لے گیا، پھر پیچھے سے دھکا دے کر اپنی جگہ واپس آ گیا، میں نے بڑی حسرت سے بارگاہ عرش جاہ میں عرض کیا: علمک بحالی کفانی عن سوالی۔

اس کے برخلاف ایک دن دیکھا کہ بیت فاطمہ کے پاس ایک ایرانی سر پر پگڑی رکھے بیت فاطمہ میں جالیاں پکڑے ہوئے جھانک رہا تھا اور نجدی سپاہی کھڑا دیکھ رہا تھا اسے دانشانہ پھٹکا را میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور جی بھر کے بیت فاطمہ کی زیارت کی آٹھ بجے صبح کا وقت تھا، اچھی خاصی اندر روشنی تھی، اندر کا سارا منظر صاف نظر آ رہا تھا، آخر اس کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے، سوائے اس کے کہ الکفر ملة واحدة نجدی اپنے ایرانی بھائیوں کے ساتھ برادرانہ سلوک نہ کریں تو رشتہ اخوت کی توہین ہے۔

دوبارہ حاضری

اس وقت تو ہم واپس آ گئے، پھر نوبتے حاضر ہوئے، اس وقت عام طور پر زائرین اپنی اپنی قیام گاہ پر ہوتے ہیں، مسجد اقدس اور مواجہہ مبارکہ میں بھیڑ بہت کم ہوتی ہے۔ حسب آداب زیارت باب جبریل سے داخل ہوا، اب کی بار حاضری کا رنگ ہی کچھ اور تھا، قدم لڑکھڑارے تھے، دل دھڑک رہا تھا، پورا جسم کانپ رہا تھا، آس ویاس، خوف ورجاء، امید و بیم کی وہ کش مکش کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کبھی اپنی بد اعمالیوں و بد کرداریوں پر نظر جاتی، تو شرم و خجالت سے قدم بندھ جاتے، معان کی رحمت آواز دیتی، آؤ آؤ۔

ایں در گہ مادر گہ نومیدی نیست

شفاعتی لاهل الكبائر من امتی

تو ہمت بندھتی، بعد شوق یہ عرض کرتا ہوا آگے بڑھتا۔ ع

سلام اس پر بروں کو جس نے فرمایا یہ میرے ہیں

چاہتا یہی تھا کہ سیدھے مواجہہ اقدس میں حاضر ہوں، اسی طرف مڑا بھی کہ نجدی سپاہی نے روک دیا اور اشارہ کیا کہ سیدھے مسجد اقدس میں جاؤ۔ دل پر ہاتھ رکھ کر یہی کرنا پڑا۔ سامنے ہی صفہ تھا، ان کے ان دیوانوں کا ڈیرہ جو دنیا و مافیہا کو خیر آباد کہہ کر ان کی دیوار تلے پڑے رہتے تھے، جگہ خالی نظر آئی، حاضر ہو کر دو رکعتیں بہت مختصر پڑھیں، اور آگے بڑھا۔ اب میرے قدم اس حصے میں تھے، جو ان کے عہد مبارک میں مسجد تھے، سامنے ریاض الجنۃ ہے جس کی دہنی جانب منبر اقدس ہے، اور سامنے ہی محراب نبوی، فرط مسرت میں اختیار سے باہر ہوا جاتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ میں رقص کروں مگر معاذ اللہ رقص اور یہاں:

بے ادب پامنہ این جا کہ عجب درگاہست

با خدا دیوانہ باشی با محمد ہوشیار

ریاض الجنۃ کے ایک ایک ستون کو دیکھا، جی چاہا کہ اسی وقت ہر ستون کے پاس دو گانہ شکرانہ ادا کروں، مگر دل کی ہوک کچھ اور تھی، اس لیے محراب نبوی میں حاضر ہو کر دو گانہ پڑھا، اور پھر منزل مقصود کی طرف چلا۔ ایک منٹ بھی نہ گزرا کہ میں کعبہ مقصود مواجہہ اقدس میں حاضر تھا۔ جالیوں اور مسجد اقدس کے مابین اب بھی زائرین کا تانتا بندھا تھا۔ اس لیے میں کترا کر مواجہہ اقدس کے مقابل ستونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا، معایہ تصور بندھا کہ سرکار، سامنے جلوہ فرما ہیں، اور میں روبرو حاضر ہو کر سلام عرض کر رہا ہوں۔ اب وفور خوشی بلکہ سرتاپا خوشی میں وہ کیفیت طاری ہوئی جس کا تحمل مشکل ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ سینے سے باہر نکل پڑے گا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہ رہی تھی۔ اس بارگاہ عرش جاہ میں نذر گزارنے کے لیے ہم غربا کے پاس سوائے آنسوؤں کی لڑی کے اور ہے ہی کیا؟۔

سرکار کے جتنے بھی اسماء طیبات یاد آتے گئے، سب کے ساتھ سلام عرض کیا۔ پورے درود تاج کے اسماء دلائل الخیرات کے کثیر اسماء، ان کے علاوہ اور کثیر اسماء۔ مجھے یاد نہیں کتنی دیر تک کھڑا صلوٰۃ و سلام عرض کرتا رہا۔ پھر حضرت صدیق اکبر کے مواجہہ اقدس میں حاضر ہوا۔ اب عالم خیال میں سوا چودہ برس پہلے مکہ کی گلیوں میں پہنچ گیا اور حضرت صدیق اکبر کی

ہر ہر قربانی، ہر ہر ادا یاد آتی گئی، اور جب تک پوری زندگی کا ایک ایک ورق ختم نہ ہو گیا، صلوٰۃ و سلام عرض کرتا رہا۔

اس کے بعد فطری طور پر حضرت فاروق اعظم کی طرف دامن دل کھنچا، اور ان کے مواجہ اقدس پر حاضر ہوا، یہاں بھی وہی کیفیت پیدا ہوئی۔ گھر سے شمشیر بکف نکلنے سے لے کر قیصر و کسریٰ کی شوکت و عظمت خاک میں ملا کر عظمت اسلام کا سکہ چار دانگ عالم میں بیٹھا نے، اور ابولؤلؤ کے حملہ، اور اصحاب شوریٰ کے انتخاب تک کے سارے واقعات ذہن کے پردوں پر ابھرتے گئے، پھر شہادت و تدفین پر آ کر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اسی کے ساتھ ان پر صلوٰۃ و سلام کا سلسلہ بھی ختم ہوا۔ پھر آداب زیارت کے مطابق دونوں حضرات کے درمیان کھڑے ہو کر مشترکہ سلام عرض کرنے اور بارگاہ اقدس میں سفارش کرنے کی انتہائی الحاج و زاری کے ساتھ درخواست پیش کرنے کے بعد پھر کعبہ مقصود پر پلٹا، کچھ دیر صلوٰۃ و سلام عرض کرنے کے بعد اب درخواستیں اور احباب کے سلام پیش کرنے کی نوبت آئی۔

ذو مسرت کا طوفان تھم چکا تھا، باطمینان عرض حاجات کرنے لگا، چوں کہ زندگی کی یہ معراج میرے محسن اعظم الحاج سیٹھ ابراہیم احمد برکاتی کی عنایت سے حاصل ہوئی تھی، اس لیے سب سے پہلے ان کا اور ان کے صاحبزادے الحاج زبیر احمد کا سلام عرض کیا، اور جو کچھ ہوسکا مانگا، پھر دیگر اعزہ و احباب کی باری آئی، جہاں تک یادداشت نے کام کیا، سوچ سوچ کر سب کا سلام اور سب کی التجائیں پیش کیں۔ اخیر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کا مشہور و معروف سلام، مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام، عرض کیا اور واپس ہوا۔ باب جبریل سے باہر نکلا تو گیارہ بج چکے تھے۔ دس دن مدینہ طیبہ قیام رہا۔ اس اثنا میں روزانہ تقریباً ہر نماز کے بعد حاضری دیتا نیز احد شریف، قبا مسجد قبلتین، خزوہ خندق کے میدان میں بنی ہوئی مساجد خمسہ و دیگر مساجد مثلاً مسجد غمامہ وغیرہ کی بھی زیارت کرتا رہا۔ جنت البقیع شریف بھی روزانہ حاضر ہوتا رہا۔ یہ دس دن یوں گزر گئے جیسے چند منٹ:

واہا لسویعات ذہبت آن عہد حضور "بارگاہت"

جب یاد آوت موہے کرنہ پرت دروا مدینے کا جانا

واپسی:

میرا ارادہ تھا کہ شہدائے بدر کی بارگاہ میں حاضری ضرور دوں گا۔ اس کے لیے اپنی پرائیویٹ گاڑی کی گئی۔ ۲۸ رز و قعدہ مطابق ۱۳ اگست بروز بدھ عصر کے قبل بہتے ہوئے آنسوؤں اور حسرت زدہ قلب و جگر کے ساتھ مدینہ طیبہ کو وداع کیا۔ احرام کے کپڑے قیام گاہ ہی پر پہن لئے تھے۔ ذوالحلیفہ جسے اب بیر علی کہتے ہیں آکر عصر کی نماز ادا کی گئی، اور احرام کی نیت بھی۔ پھر موٹر روانہ ہوئی۔ مغرب میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا کہ بدر شریف پہنچ گئے، مغرب ادا کر کے احاطہ مبارکہ میں داخل ہوئے اور اسلام کے ان جاں نثاروں کی بارگاہ میں حاضر ہوئے جن کے مقدس خون نے اسلام کو اس وقت سینچا تھا جب سوائے چند نفوس قدسیہ کے کوئی اسلام کا نام لیوانہ تھا۔ وہاں سلام و فاتحہ خوانی کے بعد عشا کی نماز پڑھی گئی، اور پھر قافلہ مکہ معظمہ چلا، راستے میں منزل مستورہ پر موٹر رکی، ہم نے کھایا پیا، ڈرائیوروں نے آرام کیا۔ تقریباً دو گھنٹے وہاں رکے، اس کے نتیجے میں دھائی بجے مکہ معظمہ پہنچے۔

حاجی عبدالستار صاحب بٹائے والے کے توسط سے ایک مدنی صاحب کے یہاں میلا و شریف میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ بمبئی والے حاجی بابا کو کوششوں سے حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب خلف الرشید حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنی دیرینہ روایت کے مطابق ہمیں کھانے پر بھی مدعو کیا۔ اس طرح دوبار شرف ملاقات حاصل ہوا۔ مکہ معظمہ واپسی کے بعد معلوم ہوا کہ حکومت نے امسال اپنے یہاں کے حساب سے تمیں کی رویت مانی ہے اور امسال حج بتاریخ ۲۵ اگست بروز یک شنبہ ہوگا۔

جنۃ المعالیٰ حاضری دے چکا تھا، ابھی تک غار حرا کی زیارت نہیں کی تھی۔ بتاریخ ۱۸ اگست بروز یک شنبہ میں اور حضرت حسنین میاں صاحب اور قاری تراب علی صاحب غار حرا کی زیارت کے لیے گئے، وہاں پہاڑ کے دامن میں نجدیوں کے مقرر کردہ افراد ہرزبان میں مسلسل لوگوں کو ادا پر جانے سے منع کرتے رہتے تھے، حرام، شرک وغیرہ سناتے رہتے، مگر میں نے دیکھا کہ نیچے سے لے کر جبل نور کی چوٹی تک آنے والوں اور جانے والوں کا سلسلہ

بندھا ہوا ہے، ان غریبوں کی صحیح پکار کا کسی پر کوئی اثر نہیں۔

واعظ برس رہا ہے پٹے جا رہا ہوں میں

ہم تینوں نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ حضرت حسنین میاں صاحب کا چند ماہ پہلے اپنڈ سائینس کا آپریشن ہوا تھا، وہ کچھ دور جا کر واپس آگئے، مگر میں اور قاری تراب علی صاحب غار شریف تک پہنچے یہاں بھی بھیڑ کافی تھی۔ نمبر لگایا، کچھ دیر کے بعد اندر جانے کا موقع مل گیا، غار اندر جاتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس دنیا میں نہیں بلکہ کسی اور ہی عالم میں ہوں، جو سراسر نور و نکہت اور رحمت ہے۔ دو رکعت نماز پڑھی، کچھ دعائیں مانگی کہ کچھ سے دوسرے امیدواروں نے دھکا دینا شروع کیا اور دل مسوس کر یہ کہتا ہوا۔ ع:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد“ قبلے کی طرح دراڑ میں سے باہر آ گیا۔

علماء نے لکھا ہے غار حرا سے کعبہ نظر آتا ہے۔ میں نے بھی نزہۃ القاری جلد اول ۱۸۵ پر ان پر اعتماد کرتے ہوئے لکھ دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ غار کا منہ کعبہ شریف کے مخالف سمت ہے۔ غالباً جانب شرق، اور کعبہ وہاں سے جانب مغرب ہے، البتہ غار کی پشت سے حرم شریف نظر آتا ہے۔ میں تو ضعف بصارت سے نہ دیکھ سکا مگر قاری تراب علی صاحب نے دیکھا، اور اشارے سے مجھے بتایا۔

منیٰ کی حاضری:

سنت یہی ہے کہ آٹھ ذوالحجہ کو نماز فجر پڑھ کر منیٰ چلا جائے لیکن حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے معلمین آٹھویں شب کو عشا بعد ہی سے حجاج کو منیٰ بھیجنا شروع کر دیتے ہیں، اس لیے ہم لوگوں نے بھی عشا کے بعد ہی حج کا احرم باندھا۔ چونکہ طواف افاضہ کے بعد، سعی صفا و مروہ کے مابین بہت رش رہتا ہے، اس لیے ہم سب لوگوں نے نفل طواف کر کے سعی بھی کر لی۔ بارہ بجے کے پہلے قیام گاہ پر آئے۔ دو بجے معلم صاحب کے دفتر پہنچے، کچھ دیر موٹر تلاش کرنے میں لگی بالآخر موٹر ملی، اور ہم لوگ نماز فجر کے بعد منیٰ پہنچ گئے۔ یہ دن اور رات منیٰ میں گزری۔ نو کو آٹھ بجے کے بعد عرفات چلے، اور غالباً گیارہ بجے حاضر ہو گئے۔ منیٰ میں جب ہم موٹر میں بیٹھے تو معلوم ہوا کہ حضرت حسنین میاں صاحب کی پھوپھی غائب ہیں،

حضرت حسنین میاں صاحب ان کی تلاش کے لیے موٹر سے اتر گئے۔ جب ہم لوگ عرفات پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ایک دوسری موٹر میں یہاں آگئی ہیں، ان کی طرف سے تو اطمینان ہو گیا مگر اب حضرت حسنین میاں صاحب کی فکر ہوئی کہ وہ منیٰ میں پریشان ہوں گے۔ ایک گھنٹہ انہی الجھن میں گزرا کہ وہ بھی بارہ بجے آگئے۔ اب اطمینان ہوا تازہ وضو کیا اور اپنے کام میں لگ گئے۔

مگر پاس ہی کچھ حجاج ایسے بھی تھے جو غپ شب، ہنسی مذاق میں مصروف تھے، جس کی وجہ سے حضور قلب حاصل نہ ہو سکا مگر جیسے بھی ہو سکا اپنے کو مشغول رکھا، میرا جی چاہتا تھا کہ مسجد نمبرہ کی حاضری دوں مگر ساتھیوں نے باصرار منع کیا کہ اولاً مسجد نمبرہ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے، دھوپ بھی بہت سخت ہے، ثانیاً واپسی میں خیمے کی تلاش مشکل ہوگی، اور اگر خیمے تک نہ پہنچ سکے تو مزدلفہ پیدل جانا پڑیگا، ناچار وہیں خیمے میں نماز ظہر ادا کر لی۔ پھر مشغول ہو گیا۔ طے یہی کیا تھا کہ آج قیلولہ نہیں کرنا ہے۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں سونے پر مجبور ہو گیا، خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا سید مصطفیٰ حیدر حسن صاحب سجادہ نشین مارہرہ مطہرہ برادر سید العلماء اترام باندھے ہوئے تشریف لائے ہیں، اور فرما رہے ہیں: مفتی صاحب! آپ حج کے لیے آئے اور مجھ سے نہیں ملے؟ میں نے عرض کیا: سرکار! مجھے اس کی خبر ہی نہیں تھی کہ حضور بھی حج کے لیے آئے ہوئے ہیں، پھر مسکرا کر فرمایا اچھا چلتے ہیں، پھر ملیں گے۔ میں گھبرا کر اٹھا، خواب کی اس کیفیت پر خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی، پھر میں نے تازہ وضو کیا اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کی۔ زبانی جتنی آیتیں و سورتیں یاد تھیں سب کی تلاوت کی پھر اور اد پڑھے، پھر خیال آیا کہ درود رضویہ بھی پڑھوں، کھڑے ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف منہ کر کے ان گنت درود رضویہ پڑھا، اتنے میں عصر کا وقت ہو گیا، ساتھیوں کو جمع کر کے باجماعت نماز عصر ادا کی، پھر خیمے سے باہر نکل کر وقوف کیا، کچھ دیر تک کوئی خاص کیفیت پیدا نہ ہو سکی۔

مگر پھر رحمت ایزدی اس حقیر کی جانت متوجہ ہوئی، پھر تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہیبت و جلال مجھے جلا کر خاک کر دیں گے، منہ سے پختہ نکلنے لگیں، دھاڑیں مار مار کر رونے

لگا، دعاؤں کا پڑھنا دو بھر ہو گیا، بہت دیر تک یہی حال رہا، پھر سکون ہوا، متوسط آواز سے دعائیں پڑھنے لگا، اتنے میں کسی نے کان پر منہ رکھ کر کہا: دعائیں بلند آواز سے پڑھیے تاکہ آپ سے سن کر ہم لوگ بھی پڑھیں۔

میں ابتداء میدان میں اکیلا ہی کھڑا تھا اب مڑ کے دیکھا تو دس بارہ آدمی میرے پیچھے کھڑے ہیں، جن میں کسی سے بھی میں آشنا نہ تھا، معلموں کی طرح میں بلند آواز سے دعا کا ایک ایک جز پڑھتا پھر وہ لوگ پڑھتے اس میں ایک نیا کیف، نئی لذت محسوس ہوئی۔ میں اسی عالم سرشاری میں تھا کہ ساتھیوں میں سے کسی نے آواز دے کر کہا کہ چلیے ورنہ موٹر میں جگہ نہیں ملے گی۔ میں نے دعا تقریباً ختم کر لی تھی، جو باقی تھی، اسے پوری کی، اخیر میں حاجی ابراہیم احمد صاحب کے لیے خصوصاً اور اپنے سب اعزہ و احباب کے لیے عموماً مختصر دعا کر کے مڑا تو دیکھا خیمہ خالی ہے، سب ساتھی موٹر پر جا چکے ہیں، پیچھے کھڑے رہنے والے سب آدمیوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور حج کی مبارکباد دی، میں نے بھی ان لوگوں کو مبارکباد دی، اور گیٹ کی طرف بڑھا اور سامنے کھڑی ایک موٹر میں بیٹھ گیا، بیٹھنے کے بعد مڑ کے دیکھا تو سب ہمراہی اسی موٹر میں تھے، غروب آفتاب میں بھی بیٹھیں منٹ باقی تھے میں نے اس وقت کو بھی رائیگاں نہیں جانے دیا، غروب آفتاب کے ایک گھنٹے بعد بس اشارٹ ہوئی، مزدلفہ پہنچے، میں اور حسنین میاں اور مستورات موٹر سے اتر کر مزدلفہ کے میدان میں گئے، میں نہ یہ سوچ کر کہ سرکار حسن میاں صاحب مدظلہ نے ملاقات کا وعدہ کیا ہے، شاید وہ اپنوں کی بھیٹر میں نہ تشریف لائیں، تنہا کہیں اجنبیوں میں رہوں تو ممکن ہے کہ کرم فرمائیں۔ ان لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لی، اور ایک نامعلوم سمت چل پڑا، ایک جگہ خالی دیکھ کر چادر بچھائی، قریب ہی ٹل تھا، وضو کر کے نماز مغرب اور عشا پڑھی، نمازوں سے فارغ ہونے کے بعد دیکھا کہ کچھ لوگ اور آگئے ہیں۔

ان میں ایک صاحب دمہ کے مریض تھے، انہیں کھانسی آئی اور بہت سا بلغم میرے قریب ہی تھوک دیا، اس لیے میں وہاں سے بھی اٹھا اور کسی اور جگہ کی تلاش میں نکل پڑا کچھ دور چلنے کے بعد ایک جگہ کافی میدان خالی تھا، کچھ لوگ کنکریاں جن رہے تھے، میں نے بھی

وہیں کنکریاں چٹیں پھر چادر بچھا کر تھوڑی دیر لیٹ گیا لیکن نیند نہیں آئی، نیند آتی بھی کہاں سے؟ ایک گنہگار سیہ کار بندہ، جبار و قہار معبود کی بارگاہ میں حاضر ہے، لاکھوں لاکھوں کی بھیڑ ہے معلوم نہیں کسے قبول کیا جائے گا، اور کیسے دھتکار دیا جائے گا، مجھے پتا نہیں کہ میں کس گروہ میں ہوں۔ گھربار چھوڑا، اعزہ اور اقربا چھوڑے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے یہاں حاضر ہوں، پتا نہیں کس گروہ میں ہوں؟ گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اللہ نے توفیق دی اس کی یاد کی۔

اسی عالم میں ایک بار بے اختیار نگاہ اوپر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ احرام باندھے قبلے کی طرف سے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے اٹھ کھڑا ہونا چاہا کہ آگے بڑھ کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کروں مگر قدم جیسے بندھ گئے تھے، یہاں تک کہ آنے والے بزرگ بہت قریب آ گئے، اب یہ دیکھتا ہوں کہ وہ مفتی اعظم نہیں کوئی اور بزرگ ہیں، انہوں نے آتے ہی سلام کیا میں نے سلام کا جواب دیا، مگر میرے ہوش و حواس غائب تھے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ مجھے نہ تو ان کی دست بوسی کا خیال رہا اور نہ یہ ہوسکا کہ بیٹھنے کی درخواست پیش کرتا، انہوں نے خود ہی مسکرا کر فرمایا: اجازت ہو تو آپ کی چادر پر بیٹھ جاؤں، میں نے عرض کیا: ضرور ضرور تشریف رکھیں، یہ میری سعادت ہے۔ بیٹھنے کے بعد مجھ سے میرا نام، وطن مشغلہ دریافت کیا۔ میں نے سب کچھ اختصار کے ساتھ عرض کر دیا پھر میں نے ان سے ان کا نام وغیرہ پوچھا تو فرمایا: نام پوچھ کے کیا کیجیے گا، میں سیلانی آدمی ہوں، آج یہاں کل وہاں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ میں نے دعا کی درخواست کی تو فرمایا اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ پھر میں نے عرض کی دعائے مغفرت فرمائیں۔ تو کہا: اللھم اغفر لاسخی ہذا بار بار اس کی تکرار فرمائی، پھر اچانک کھڑے ہو گئے اور فرمایا اب ہم چلتے ہیں، ملنے کا وعدہ کیا تھا، اس لیے آگئے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اور تیزی سے جانب قبلہ بڑھے مجھ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ انہیں کھڑا دیکھتا رہا، یہ بھی خیال نہ ہوا کہ کب ملنے کا وعدہ فرمایا تھا، یہاں تک کہ وہ غائب ہو گئے۔

بہت دیر تک غور کرتا رہا کہ یہ کون بزرگ تھے اور کیا قصہ ہے مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ کسی اللہ والے نے مجھ بے مایہ پر کرم فرمایا، اس خوشی میں بہت

دیر تک گمن رہا، پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ جب صبح صادق کے وقت توپ کی فائر ہوئی اور پورے میدان میں جگہ جگہ اذانیں ہونے لگیں، تو پھر میں نے تازہ وضو کیا نماز فجر پڑھ کر قوف کے لیے کھڑا ہو گیا اپنے اور اپنے اعزہ کے لیے جتنی ہو سکیں دعائیں کیں، پھر قریب طلوع آفتاب پیدل ہی منی کی طرف چل پڑا۔ پیدل چلنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ وادی محترمہ میں تیز رفتاری سے چلنے کی سنت ادا ہو گئی۔ منی پہنچ کر پولیس سے پوچھ کر اپنے معلم کے خیمے میں آیا، جب میں خیمے میں آیا تو اپنا خیمہ تلاش کرتے ہوئے ایک طرف جا رہا تھا کہ حاجی صفدر حسین صاحب ممبئی والے نے آواز دی، اور باصرار اپنے خیمے میں لے گئے پھر بہ اصرار کھانا کھلایا، چائے پلائی۔ انہوں نے قربانی کے لیے کسی کمپنی کو پیسے دے دیے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہم لوگ احرام کب کھولیں اور کنکری کب ماریں؟ میں نے ان سے کہا کہ کنکری تو آپ ابھی جا کر مار آئیے اور احرام بعد مغرب کھول لیں، پتا نہیں کمپنی والے کب قربانی کریں۔ پھر میں اپنے خیمہ میں آیا، ابھی تک میرے خیمے میں کوئی نہیں پہنچا تھا، میں چادر بچھا کر لیٹ گیا کچھ دیر کے بعد ساتھی آنے لگے۔ عصر بعد کنکری مارنے کے لیے ہم لوگ گئے، اس سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے ساتھی مذبح گئے، میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ مذبح جانے کی ہمت نہ کر سکا۔

قاری تراب علی صاحب کو پیسے دے دیے اور میں وہاں سے واپس ہو کر مسجد خیف میں حاضر ہوا، نماز مغرب پڑھی، عشا تک حاضر رہا، عشا پڑھ کر خیمے میں آیا، لوگ قربانی کر کے واپس آچکے تھے، احرام بھی کھول چکے تھے، میں نے بھی سر منڈایا اور احرام کھول دیا۔ نہا کر سو گیا، بہت گہری نیند آئی یہاں تک کہ صبح تک سوتا ہی رہا۔

آج گیارہ ذوالحجہ مکہ معظمہ حاضر ہوئے اور طواف افاضہ کیا۔ حرم شریف کا پورا صحن، مسجد حرام کے دالان حجاج سے بھرے ہوئے تھے، آدمیوں کا موجیں مارتا ہوا سمندر کعبہ کے گرد دیوانہ وار طواف کر رہا تھا، بھیڑ دیکھ کر میری ہمت جواب دے گئی مگر طواف کرنا ہی تھا، اپنے مشائخ سلسلہ سے استعانت کر کے بھیڑ میں گھس گیا، اور طواف شروع کر دیا، جدوجہد کر کے کعبہ شریف کے بالکل قریب پہنچ گیا، یہاں تک کہ کبھی کبھی میرے اور کعبہ کے درمیان

کوئی حائل نہ رہتا، دوپہرے عظیم کی دیواروں سے لگ کر کے، پچیس منٹ میں طواف سے فارغ ہو گیا۔ اس وقت میرے ساتھ صرف قاری تراب علی صاحب تھے۔ طواف کے بعد ہم دونوں مسجد حرام کی چھت پر چڑھ گئے وہاں سے طواف کرنے والوں کا منظر دیکھ کر روح جھوم جھوم اٹھتی۔ ہم لوگ بہت دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے، پھر قیام گاہ پر آئے اور عصر کے بعد پھر منی پیدل چلے، اس وقت جمرات پر بھیڑ بہت کم تھی، اطمینان سے بہ طریق مسنون و مستحب تینوں جمرات پر کنکریاں ماری گئیں اور خیمے میں واپس آئے۔

۱۲ رذوالحجہ کو سوائے کنکری مارنے کے اور کوئی کام نہیں تھا، اس لیے ناشتے کے بعد مولانا افتخار احمد صاحب سابق استاذ الجامعة الاشرافیہ مبارک پور سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ یہ ”ریاض“ میں رہتے تھے، مع اپنے بال بچوں کے حج کے لیے آئے تھے، ان سے ملاقات کے بعد الحاج سیٹھ اسماعیل جانی اور حاجی عبدالستار بٹاٹے والے سے ملنے کے لیے گئے، ان سے ملاقات کر کے حضرت علامہ اختر رضا صاحب ازہری جانشین مفتی اعظم ہند کی خدمت میں حاضری کو سوچ ہی رہا تھا کہ حضرت خود ہی کرم فرماتے ہوئے تشریف لائے، دوپہر کا وقت اسی میں بیت گیا، کھانا کھا کر میں چاہتا تھا کہ کچھ دیر آرام کروں کہ سب ساتھیوں نے ایک بیک رمی-جرمہ کا پروگرام بنالیا، میں نے سب کو منع کیا مگر کوئی نہیں مانا۔ خیمے میں صرف حسین میاں کی والدہ ماجدہ اور ان کی پھوپھی صاحبہ رہ گئیں۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ بعد عصر کنکری مارنے کے لیے جاؤں گا پھر پیدل مکہ معظمہ واپس جاؤں گا۔ سب لوگ چلے گئے، میں بیٹھا ہی رہا۔ اتنے میں بریلی شریف کے کچھ حضرات ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے مفتی اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک میں شرکت کی دعوت دی، میں نے قبول کر لی، پھر دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔ اتنے میں اچانک میرے کانوں میں آواز آئی، جمرہ پر آؤ مجھے پانی پلاؤ۔ آواز انتہائی دروناک تھی، جیسے جاں بلب پیاسا کسی کو پکار رہا ہو۔ میں نے اس کو اپنا واہمہ سمجھا مگر تین بار یہی آواز آئی۔ اب میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بریلی والوں سے معذرت کی کہ چوں کہ مجھے کل ہی جدہ جانا ہے، اس لیے میں کنکری مارنے جا رہا ہوں، اور میں تیزی سے جمرہ کی طرف چلا، راستے میں مولانا خلیل احمد صاحب کا قافلہ بھی مل گیا، ساتھ

ساتھ حجرہ پر پہنچے، سب نے حجرہ اولیٰ کی رمی کسی طرح کر لی، اس سے فارغ ہو کر حجرہ ثانیہ کی طرف ہم لوگ جا رہے تھے کہ مولانا خلیل احمد خاں صاحب ہکا بکا، ننگے سر، چشمہ غائب، ننگے پاؤں چلے آ رہے ہیں اور فرمایا کہ حضرت واپس چلیے اس وقت ہرگز کنکری نہ ماریے، میری جان بچ گئی، میں گر پڑا تھا، سمجھے ہوئے تھا کہ اب میں گیا، کلمہ تک پڑھ لیا تھا، آپ کی زیارت مقدر تھی کہ کچھ لوگوں نے ترس کھا کر مجھے اٹھا لیا اور جان بچی۔ ہمارا قافلہ منتشر ہو چکا تھا۔ قاری تراب علی، حاجی منشی محبت علی مع اہلیہ کا پتہ نہ تھا، باقی ماندہ لوگ واپس ہوئے اتنے میں ایک سفید ریش بزرگ سر پر افغانیوں کی طرح عمامہ باندھے ہوئے تشریف لائے، میرے پاس تھرماس تھا مجھ سے پانی مانگا میں نے تھرماس کے ڈھکنے میں بھر کر انہیں پانی پیش کیا، وہ پینے کے لیے بیٹھ گئے، آدھا پانی پی کر مجھے واپس کر دیا، میں نے اصرار سے کہا کہ اور پی لیجئے مگر ڈھکنے انہوں نے مجھے تھما دیا اور کھڑے ہو گئے۔ میں نے باقی ماندہ پانی پیا۔ اب دیکھتا ہوں تو ان بزرگ کا پتہ نہیں، اتنے میں میرے ساتھی آگے بڑھ چکے تھے لیکر ان کے ساتھ ہو گیا، طے یہ ہوا کہ اس وقت واپس چلیں پھر شام کو آ کر کنکری ماری جائے گی۔

چوں کہ میں پہلے جہاز سے گیا تھا، واپسی کے لیے بھی میرا پہلا ہی جہاز تھا، جو وہاں کی ۱۳ ذوالحجہ اور ہندوستان کی ۱۲ مطابق ۲۹ اگست بروز جمعرات تھا، قاعدے کے مطابق بارہ ایک بجے دن تک ایئر پورٹ پہنچ کر ٹکٹ اوکے کرانا ضروری تھا اس لیے ہم لوگ بارہ ہی کو مکہ معظمہ آ گئے۔ میں دو بجے رات کو حرم شریف میں حاضر ہوا، نماز فجر کے بعد طواف وداع کیا اور یصد حسرت و یاس بیت اللہ شریف کو اخیر سلام کر کے قیام گاہ پر آیا، ۱۲ بجے جدہ پہنچے لیکن ہمارا ہوائی جہاز رات میں ۱۱ بج کر ۴۲ منٹ پر جدہ سے چلا، واپسی میں نجدی ایئر پورٹ پر وہی بد نظمی اور حاجیوں کی ایذا رسانی کی کار فرمائی تھی۔

اس کے باوجود کہ حجاج صبح ہی کو ایئر پورٹ پہنچ چکے تھے اور ۱۲ بجے تک تو تمام ہی حجاج آ گئے تھے مگر حجاج کو اندر نہیں جانے دیا گیا، جہاز چھوٹنے سے کچھ پہلے سامان اندر جانے لگا تو وہ مارا ماری وہ اٹھا پٹک کہ اگر قاری تراب علی صاحب میرے ساتھ نہ ہوتے

تو شاید میں اندر مع سامان کے نہیں جاسکتا تھا۔ پھر اندر پہنچنے کے بعد قطار میں اتنی دیر تک کھڑا رہنا پڑا کہ سارے حاجی تھک کر چور ہو گئے۔ خیر خدا خدا کر کے ہوائی جہاز تک پہنچے، جہاز اشارت ہوا اور ہم ۷ بجے صبح کو (ممبئی کے ٹائم سے) ممبئی پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ پر لینے کے لیے حاجی ابراہیم احمد صاحب برکاتی، جناب قاری سراج اظہر صاحب رضوی، عزیزم مولانا ولی اللہ صاحب مع اپنے احباب کے اور عبدالرزاق بٹاٹے والے موجود تھے۔ واپسی میں بھی عطاری مسجد ہی میں قیام رہا۔ اب کی بار بھی ان سب احباب نے وہی کرم فرمائی کی جو پہلے کر چکے تھے۔ تین دن قیام کے بعد مہانگری اکسپریس سے گھر واپس آ گیا۔

فالحمد لله على ذلك والصلوة والسلام على حبيبه وعلى آله وصحبه
حج و زیارت سے مشرف تو ہو چکا مگر رہ رہ کے خیال آتا ہے:

لاکھ سکھی پی ایک ہے چو اور پی پی پی ہوے
تاجانوں اس جھنڈ میں کون سہاگن ہوے

محمد شریف الحق امجدی

خادم الافاق: الجامعة الاشرافية مبارکپور، اعظم گڑھ

۶ ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۹ دسمبر ۱۹۸۵ء شب پنج شنبہ

(نزہۃ القاری ج ۲ ص ۵)

اشرفیہ کا وفد بمبئی میں

جلالہ العلم، حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جسمانی و روحانی توانائیوں کا مظہر الجامعہ الاشرفیہ مبارک پور بجمہ تعالیٰ اپنے بانی کی امیدوں کے مطابق ان کے شہزادے و جانشین عزیز ملت حضرت مولانا شاہ عبدالحفیظ صاحب زید مجدہم کی سربراہی میں روز افزوں ترقی کرتا چلا جا رہا ہے۔ جامعہ ہذا کی عظمت کا اندازہ اس سے لگائے کہ اس وقت اسٹھ مدرسین و دیگر ملازمین کا اسٹاف تعلیم و تعلم و انتظام میں مصروف ہے۔ علاوہ ان ایثار پسند افراد کے جو فی سبیل اللہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ دو ہزار طلبہ مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس میں سات سو بیرونی طلبہ ہیں جن کے قیام و طعام کتاب، روشنی وغیرہ کا مدرسہ کفیل ہے۔ ناظرے سے لے کر دورہ حدیث تک کہ اعلیٰ و بے مثال تعلیم کا انتظام ہے۔ پانچ زبانوں میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ہندی۔ اب تک کا دستور یہی تھا کہ دینی مدارس سے فارغ شدہ علما صرف اردو میں تقریر کرنے پر قادر ہوتے تھے، آج کی کمی ہوئی دنیا کا لحاظ کرتے ہوئے دیگر بلاد میں تبلیغ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے نصاب میں اس کا پورا پورا لحاظ کیا ہے کہ ہمارے یہاں کے فارغ شدہ علما فارسی، عربی، انگریزی میں بھی تقریر کرنے پر قادر ہوں۔ اس کے لیے بی، اے تک کی انگریزی زبان کا بندوبست بھی کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جامعہ کے فارغ شدہ علما سعودی عربیہ، افریقہ، ہالینڈ، برطانیہ وغیرہ میں دین و ملت کی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جس کا اثر یہ ہے کہ ملک تو ملک بیرون ملک کے طلبہ بھی یہاں تعلیم میں مصروف ہیں، مثلاً سری لنکا، افریقہ، ہالینڈ وغیرہ۔

امسال داخلہ کے متمنی طلبہ کی اتنی کثرت تھی کہ جامعہ سب کا داخلہ نہیں کر سکا۔ سب سے اہم مسئلہ قیام کا ہے۔ جس پر قابو پانا بڑا مشکل ہے۔ ایسے کمرے جن میں چار افراد کے

قیام کی گنجائش تھی چھ کورکھا گیا، پھر بھی مجبور ہو کر ڈیڑھ سو طلبہ سے معذرت کرنی پڑی جس کا کارکنان اشرفیہ کو بے حد قلق ہے۔ اور اسے جان کر دوسرے ہی خواہان اشرفیہ کو بھی ہوگا۔

ادھر درس گاہ کی وہ وسیع فلک بوس عمارت (جو ۲۰x۳۰) کے اٹھائیس کمروں پر مشتمل ہے، جن میں دو ہال ۳۰x۴۰ کے ہیں، فل ہوگئی۔ لہذا اس کی شدید ترین ضرورت محسوس ہوئی کہ حفظ و قرأت کے لیے مجوزہ عمارت کی تعمیر جلد از جلد کی جائے، دارالحدیث کا وہ عالیشان گنبد جو ۲۲x۲۲ کے وسیع و عریض ہال پر تعمیر ہونے والا ہے نامکمل پڑا ہے۔

ان سب کی تکمیل کے لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کے مخیر، دین پرور افراد کو اس طرف متوجہ کیا جائے، اراکین کی استدعا پر ایک وفد کی تشکیل ہوئی، جس کے لیے مندرجہ ذیل حضرات کو نامزد کیا گیا۔

(۱) عزیز ملت حضرت سربراہ اعلیٰ صاحب

(۲) محدث کبیر حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب

(۳) مفکر اسلام حضرت مولانا محمد ادریس صاحب

(۴) جناب مولانا غلام حسین صاحب

(۵) جناب صوفی نظام الدین صاحب

(۶) جناب عبدالغفور صاحب

چنانچہ یہ حضرات بمبئی گئے، اور ساتھ ہی راقم الحروف فقیر امجدی بھی۔ اللہ عزوجل کا فضل و کرم اور اس کے حبیب ﷺ کی عنایت سے خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ بمبئی کے حضرات نے اس وفد کا پر جوش محبت بھرے انداز میں استقبال کیا، اور ہر طرح تعاون کیا۔ جن میں سرفہرست محسن ملت الحاج سیٹھ احسان اللہ خاں صاحب (پہلوان سیٹھ) اور عزیز گرامی قدر مولانا معین الحق صاحب ابن الحاج سیٹھ شمس الحق علیہی مرحوم کے اسمائے گرامی ہیں۔ اللہ عزوجل کسی کو دولت و ثروت دے یہ اس کا فضل و کرم ہے۔ پھر اسے دینی کاموں میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے، یہ اس کا دوسرا اور عظیم فضل ہے، اور دونوں فضل و کرم سے بڑھ کر یہ فضل و کرم ہے کہ کسی کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ دینی کاموں کے لیے اپنا وقت

صرف کر کے اور دوسروں کی تعاون کی ترغیب دے۔ جناب پہلوان سیٹھ پر اللہ عزوجل کے تینوں فضل ہیں۔ اللہ نے انہیں غناے مالی سے بھی نوازا ہے، اور دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حوصلہ بھی عطا فرمایا ہے۔ یہ نسبتا بہت آسان ہے کہ کوئی شخص اپنی جیب سے امداد و اعانت کر دے مگر دوسروں سے کہنا بڑا مشکل ہوتا ہے، جناب الحاج سیٹھ پہلوان صاحب اس معاملہ میں بھی قطعاً جھجک محسوس نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ بمبئی میں ”اشرفیہ“ کے وفد کی کامیابی موصوف ہی کی کوششوں کی رہن منت ہے۔

الحاج سیٹھ پہلوان صاحب ہی کی ہدایت پر یہ وفد بھیونڈی بھی گیا، وہاں الحاج عبد الحمید صاحب نے بھی اسی طرح تعاون کا مظاہرہ کیا، جس طرح الحاج سیٹھ پہلوان صاحب ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی گاڑی وفد کے لیے وقف کی، ساتھ ہی ساتھ ہر جگہ تشریف لے گئے، اور لوگوں پر زور بھی ڈالا۔ بھیونڈی میں ان کے ساتھ الحاج سیٹھ ثار احمد صاحب عزیزی، جناب حافظ قمر الدین صاحب، صوفی مختار احمد صاحب وغیرہم نے بھی وفد کی بھرپور تعاون کیا۔

بمبئی میں الحاج سیٹھ اسمعیل جانی صاحب نے بھی وفد کا پورے طور سے تعاون کیا۔ بعض ایسے حلقے جہاں سے اشرفیہ کا کوئی لگاؤ نہیں تھا وہاں وفد کو لے گئے اور اشرفیہ کا مکمل تعارف کرایا۔ اللہ عزوجل کا شکر ہے کہ اس میں وہ کامیاب ہوئے، بات نامکمل رہ جائے گی اگر ہم عالی جناب سیٹھ مصطفیٰ خاں صاحب کا ذکر خیر نہ کریں، جنہوں نے ہمیں بڑے شوق و محبت و عقیدت کے ساتھ اپنا مہمان بنایا۔ موصوف بھی اس زمانہ میں بہت ہی قابل قدر ہیں، علما کی عزت و احترام، دین کی راہ میں بے دریغ خرچ کرنا ان کا خاص شعار ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ عزوجل اپنے حبیب ﷺ کے صدقے اور طفیل میں اشرفیہ کے ان سرپرستوں کو آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے۔ اور ان کے کاروبار میں یومانیو ماترقیاں عطا فرماتا رہے۔ اور دارین میں انہیں شاد و آباد رکھے۔ آمین ثم آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والسلام۔

جدید تعمیرات:

سوال سے اب تک مسلسل تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ صدر گیٹ کے متصل جانب شمال لب سڑک ایک ہسپتال کی تعمیر ہوئی ہے۔ جس میں جملہ امراض کے علاج کا بہت اعلیٰ سائنٹفک انتظام ہوگا، نئے دارالاقامہ میں بالائی منزل پر تعمیر کا کام شروع ہے، جن میں تقریباً چار کمرے مکمل ہیں، موجودہ باحوصلہ اراکین کا پروگرام یہ ہے کہ تعمیر کا کام مسلسل ہوتا رہے گا۔ بترتیب الہم فالہم عمارتیں بنتی جائیں گی، ان کی نظر میں سب سے اہم دارالحدیث کا گنبد ہے۔ اس کے بغیر درس گاہ کی سنٹرل بلڈنگ بے زیب لگتی ہے، اس کے لیے مسترہاں سے بات چیت جاری ہے۔ لیکن اس پر مصارف کا تخمینہ اتنا زیادہ ہے کہ کام شروع کر تے ہوئے ہچکتے ہیں، اس پر تعمیر کے مصارف کا تخمینہ دو لاکھ ہے۔ دین دارودین پرور اہل دول سے درخواست ہے کہ اس تعمیر میں خصوصی طور پر حصہ لیں۔ دارالحدیث صرف ایک ہی بار بنے گا بار بار نہیں بنے گا، اس میں شریک ہونا کتنی بڑی سعادت ہے اس کو کسی سے مت پوچھئے اس کو اپنے حب رسول سے لبریز دل سے پوچھئے!۔ (ماہنامہ اشرفیہ)



فقیہ اعظم ہند

شراح بخاری علیہ الرحمہ کی اہم تصانیف

نزہۃ القاری: بخاری شریف کی نہایت جامع مفید شرح جو تمام عربی فارسی شروح کا عطر مجموعہ ہے۔ عوام، خواص، علماء، طلبہ، واعظین، مستفیدین کے لئے لا جواب تحفہ، کتابت طباعت نہایت اعلیٰ جلد زرین، خوب صورت، مضبوط، خوشنما۔

کامل قیمت: 1800/-

صفحات

سائز: 20x30
8

جلد اول	صفحات: 559	از: ابتداء	تا	کتاب الوضو
جلد ثانی	صفحات: 488	از: کتاب الوضوء	تا	ختم کتاب الصلوٰۃ
جلد ثالث	صفحات: 556	از: مواقیت الصلوٰۃ	تا	کتاب الجنائز
جلد رابع	صفحات: 520	از: کتاب الجنائز	تا	کتاب المناسک
جلد خامس	صفحات: 528	از: کتاب الصوم	تا	کتاب الہیۃ
جلد سادس	صفحات: 618	از: کتاب الشہادۃ	تا	کتاب الانبیاء
جلد سابع	صفحات: 648	از: کتاب المناقب	تا	کتاب التفسیر
جلد ثامن	صفحات: 416	از: کتاب فضائل القرآن	تا	کتاب الدعوات
جلد ناسع	صفحات: 356	از: کتاب الرقاق	تا	ختم بخاری

منصفانہ جائزہ: سنی دینی اختلافات پر شراح بخاری کی فیصلہ کن ایجابات کا مرجع۔ سائز: 23x36
16

تحقیقات: معاندین اہل سنت کے کچھ اعتراضات کے مدلل جوابات درجوں میں۔ سائز: 23x36
16

اذان خطبہ کہاں ہو: اس موضوع پر شراح بخاری کے تئیدر شید مولانا حافظ عبدالحق صاحب کا محققانہ رسالہ، اذان خطبہ کہاں ہو؟ پر پھلواڑی کے بعض بیروں نے بہت ریز کی تھی۔ اس کا بھرپور رد اس کتاب میں ہے۔ سائز: 23x36
16

تہنقید بر محل: جناب مولانا حافظ عبدالحق صاحب زید مجدد کے اشہب قلم کی جولانی دماغ کی نکتہ آفرینی مطالعہ کی فراوانی کا منظر دیکھنا ہوتا اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ سائز: 23x36
16

شارح بخاری: از مولانا طہین اختر مصباحی، مولانا موصوف کے باوقار اور جاندار قلم سے شراح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کے حالات و خدمات پر مشتمل ایک مختصر اور جامع تعارف۔ صفحات: 275، سائز: 23x36
16

اشرف السیر: فن سیرت پر تحقیقی مقدمہ کے ساتھ غار 17 ایک کے واقعات پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز۔ سائز: 23x36
16

مقالات شراح بخاری: شراح بخاری کے اہم موضوع پر مضامین و مقالات کا حسین گلدستہ، تین حصوں میں۔ سائز: 20x26
8

اسلام اور چاند کا سفر: از روئے شرع چاند پر پہنچنا ممکن ہے یا نہیں؟ چاند سورج ستارے کہاں ہیں۔ شراح بخاری کی تحقیقات کو خزینہ، صفحات: 128، قیمت، سائز: 23x36
16

اثبات ایصال ثواب: اس موضوع پر شراح بخاری نے اس کتاب میں ایک نئے انداز سے بحث کی ہے سیلا رو قیام نیاز وقت کے سلسلہ میں جو لوگ کسی شک و شبہ میں ہوں ان کے اطمینان کلی کی دستاویز۔ صفحات: 80، قیمت، سائز: 23x36
16

فتنوں کی سرزمین: نجد و عراق کا ایک گراں قدر تاریخی دوری اور سیاسی جائزہ۔

امام احمد رضا اور مسئلہ تکفیر: از شراح بخاری، اپنے موضوع پر علم و تحقیق کا قابل مطالعہ ذخیرہ۔

داۃ البرکات، کریم الدین پور، گھوسی، ضلع مسو، یوپی (انڈیا)



مکتبہ برکات المدینہ

جامع مسجد ہمار شریعت بہادر آباد کراچی۔